وری
۱۹ ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد (۱۰)　شعبان و رمضان المبارک ۱۳۸۳ھ　شمارہ (۱)

فہرست مضامین

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

منیجر ماہنامہ "میثاق"

رحمان پورہ ـــــ اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ

منیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"

باغ گونگے نواب ـــــ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ان صفحات میں جماعت اسلامی پر حکومت کی پابندی کے بارے میں اظہار رائے کیا گیا تھا ـــــ

چونکہ یہ معاملہ اب عدالت میں زیر بحث ہے اس لئے تذکرہ و تبصرہ کے جماعت سے متعلق حصے کو حذف کر دیا گیا ہے

(۲)

قبرص سے لے کر سری نگر اور سری نگر سے لے کر کلکتہ تک جہاں دیکھیئے مسلمانوں کا خون اس بے دردی سے بہایا جا رہا ہے کہ کلیجہ شق ہوتا اور دل خون کے آنسو روتا ہے۔ مسلمان جس کا خون صرف بدر و حنین اور قادسیہ و یرموک کے معرکوں کے لئے تھا، جس کے ایک ایک قطرے سے کشت حق کو سیرابی، تاریخ کو زندگی، کلمہ حق کو بلندی، ایمان کو روئیدگی، جمال اُمت کو تابانی اور ایمان و اسلام کو درخشندگی حاصل ہوتی تھی، آج وہ قبرص، سری نگر اور کلکتہ کی گلیوں میں اور سڑکوں پر پانی کی طرح بہ رہا ہے اور کوئی نہیں ہے جو آج ان دشمنان دین سے محاسبہ کر سکے جو اُمت محمدؐ کو اس بے دردی سے پامال کر رہے ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ کے سامنے فرمایا کہ ایک دن وہ بھی آئے گا کہ تم قوموں کیلئے خوان یغما بن جاؤ گے، صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہ کیا ایسا اس وجہ سے ہوگا کہ اس زمانے میں ہماری تعداد تھوڑی ہوگی؟ حضورؐ نے فرمایا نہیں، اس وقت تمہاری تعداد تو آج کی نسبت سے بہت زیادہ ہوگی۔ لیکن تمہاری حیثیت بالکل سیلاب میں بہنے والے خس و خاشاک کی ہو جائے گی، صحابہؓ کو حیرانی ہوئی کہ آج جب ہم گنتی کے چند نفوس ہیں اور ہماری سطوت کا یہ عالم ہے کہ زمین و آسمان ہم سے تھرتے ہیں تو جب ہماری تعداد زیادہ ہوگی تو ہم اتنے بے رُعب و بے حیثیت کیوں ہو جائیں گے کہ قومیں ہمیں خوان یغما بنا لیں گی اور ہم خس و خاشاک ہو کر رہ جائیں گے، انہوں نے سوال کیا، یا رسول اللہ! اس کا سبب کیا ہوگا؟ حضورؐ نے فرمایا تمہارے دلوں میں "وہن" پیدا ہو جائے گا۔ صحابہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ! یہ "وہن" کیا بلا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا، دنیا کی محبت اور موت کا ڈر!

آج دیکھئے تعداد کے لحاظ سے ہمارا کیا حال ہے؟ اور پھر دیکھیئے کہ اس تعداد کے باوجود ہم کس طرح ہر ایک کے لئے ایک لقمہ تر بن کر رہ گئے ہیں۔ قبرص، سری نگر، کلکتہ اور دہلی میں سے کس نے ہمارے جاہ و جلال کے تماشے نہیں دیکھے ہیں اور کہاں ہم نے اپنی عظمت و فرمانروائی کے پرچم نہیں لہرائے ہیں؟ لیکن آج تاریخ نے اس طرح ہم سے منہ موڑ لیا ہے گویا وہ کبھی ہم سے آشنا ہی نہیں ہوئی۔ جب ہم خدا

کے لئے جیتے تھے اور اس کے لئے مرنے کو اصل زندگی سمجھتے تھے کلکتہ، سمرقند بخارا اور قبرص سب ہمارے رحم و کرم پر تھے جب ہم اپنے لئے جینے اور اس جینے کے لئے موت سے ڈرنے لگ گئے تو دیکھئے کس طرح گیدڑ ہمارے لئے شیر بن گئے۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار!

اس عام مایوسی میں ایک خبر ذرا اچھی آئی ہے۔ وہ یہ کہ اسرائیل نے امریکہ کی شہ سے دریائے اُردن کا رخ موڑنے اور عرب کو تباہ کرنے کی جو اسکیم بنائی ہے اس نے اب پوری قوم عرب کو بیدار کر دیا ہے۔ اور اس کے تمام فرمانروا اپنی زندگی اور موت کے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے جمال عبدالناصر کی دعوت پر قاہرہ میں جمع ہوئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قوم عرب کو ایک مرتبہ پھر سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح جوڑ دے اور اس کو وہ قوت و طاقت دے کہ وہ اسرائیل کی لعنت سے سرزمین عرب کو پاک کر سکے۔ ہم نے پچھلے نزول عرب کی سیاست پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں توقع ظاہر کی تھی کہ سامراجیوں کی تمام سازشوں کے علی الرغم ان شاء اللہ ایک دن عرب جمال عبدالناصر کی قیادت میں متحد ہو کر رہیگا۔ اگرچہ اپنے اس مضمون پر ہم نے اصحاب الاغراض کی طرف سے بہت گالیاں سُنیں لیکن اب شاید ہماری پیشینگوئی کے پورے ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جمال عبدالناصر کو عرب کی قیادت کا اہل بنائے، اس کے اندر صلاح الدین ایوبی کا عزم و ایمان پیدا کرے اور اس کے ہاتھوں اسرائیل کا قلع قمع کرے!!

(۳)

"حلقہ تدبر قرآن" کا کام بفضل خدا پورے اہتمام و التزام کے ساتھ جاری ہے پہلے گروپ کے طلبہ نے مقدمہ ابن خلدون کا معتد بہ حصہ پڑھ لیا، اب وہ اس کی عبارت روانی کے ساتھ پڑھنے اور اس کے مطالب بے تکلف اخذ کرنے لگے ہیں۔ اہل علم جانتے ہیں کہ یہ کتاب زبان اور معنی دونوں ہی اعتبار سے ہماری علمی کتابوں میں ایک معیاری چیز سمجھی جاتی ہے۔ ہمارے مولانا شبلی نعمانیؒ تو اس کتاب کو یہ درجہ دیتے تھے کہ جو طالب علم اس کو سمجھ لگ جائے اس کو وہ مسند فضیلت کا حقدار سمجھ لیتے تھے۔ یہ محض فضل الٰہی ہے کہ نہایت ہی قلیل مدت میں یہ طلبہ عربی میں اس مقام تک پہنچ گئے۔ اب میں نے مقدمہ کی جگہ ان کو حماسہ شروع کرا دیا ہے تاکہ یہ اصل عربی شاعری اور اس کی خوبیوں اور نزاکتوں سے بھی اچھی طرح آشنا ہو جائیں۔ میں نے کچھ اسباق پڑھا کر یہ اندازہ کر لیا ہے کہ اس کے پڑھنے اور سمجھنے کے لئے ان کے اندر پوری استعداد پیدا ہو چکی ہے۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ ان کو حماسہ پورا پڑھا دیا جائے تاکہ عربی زبان میں ان کو پورا اعتماد حاصل ہو جائے۔

رمضان شریف کے مہینے میں توقع ہے کہ مسلم شریف پوری ختم ہو جائے گی اور قرآن شریف پندرہ پاروں تک ہو جائے گا۔ مسلم شریف کے بعد ان کو فقہ اسلامی میں بدایۃ المجتہد پوری پڑھانے کا ارادہ ہے اور اسی کے ساتھ اصول فقہ۔ ہدایہ کے ختم ہونے کے بعد زندگی ہے تو اسرار دین میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی حجۃ اللہ البالغہ پڑھاؤں گا۔ اس کے بعد میرا اندازہ یہ ہے کہ انہیں کسی چیز کے سبقاً پڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی بلکہ یہ ہر چیز کے مطالعہ اور ان سے اخذ و استنباط کی راہیں خود کھول لیں گے اور یہی میرا مقصود ہے۔

یہ طلبہ اسلامی ذہن و فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ عملاً اور صورۃً بھی خدا کے فضل سے مسلمان ہیں۔ میں نے یہ نئے قسم کے مُلّا تیار کئے ہیں جو ان شاء اللہ مُلّا کہے جانے سے کسی شرمندگی کا احساس نہیں کریں گے بلکہ خوش ہوں گے۔ ان میں سے ہر ایک نئی تعلیم کے تمام اسلحہ سے بھی مسلح ہے۔ خدا نے چاہا تو یہ اسلام کی حمایت اور الحاد و بے دینی کے قلع قمع کے لئے دو دھاری تلوار ثابت ہوں گے۔

میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے اور اب پھر عرض کرتا ہوں کہ میں نے اس کام کو جاری رکھنے کا عزم کر لیا ہے اور اس کو ایک باقاعدہ ادارے کی شکل میں لانا چاہتا ہوں۔ یہ بات بھی بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ مجھ میں کسی اور کام کی صلاحیت ہو یا نہ ہو لیکن اس کام کی صلاحیت مجھ میں موجود ہے، اگر وسائل حاصل ہو جائیں تو میں چاہتا ہوں کہ میرے مرنے سے پہلے یہ ایسی شکل اختیار کر لے کہ کام برابر جاری رہ سکے۔ میرے مخلصین میں سے حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب اور سردار محمد اجمل خان صاحب لغاری عملاً تعاون کر رہے ہیں بعض دوسرے احباب میں بھی کچھ حرکت پیدا ہوئی ہے لیکن ضرورت تمام دوستوں، کرم فرماؤں اور قدر دانوں کے اجتماعی تعاون کی ہے۔ میرے نزدیک اس وقت دین کی خدمت کے لئے اس سے زیادہ مفید کام کوئی بھی نہیں، کاش میری طرح میرے تمام دوستوں کی سمجھ میں بھی یہ بات آ جائے۔

بعض حضرات جو اسی طریقہ پر کام کرنا چاہتے ہیں خواہش کر رہے ہیں کہ ہم نے اس تعلیم کے لئے جو نصاب بنایا ہے وہ شائع کر دیا جائے تاکہ دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ہم نے اس طرح کے مخلصین کی خواہش کو محض اس خیال سے اب تک نظر انداز کیا کہ ہمارا پہلا گروپ تجربہ کی تمام منزلوں سے گزر جائے تو ہم مستقل نصاب کے مسئلہ پر زیادہ بہتر رائے دے سکیں گے۔ زندگی ہے تو اگلے سال کے رمضان تک ان شاء اللہ اس گروپ کا کام پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیگا اس وقت ہمارا ارادہ ہے کہ ہم اس کام کے تمام قدر دانوں کو جمع کر کے اپنی ساری اسکیم ان کے سامنے رکھ دیں گے اور ساتھ ہی توقع ہے

کہ اس اسکیم کے نتائج و ثمرات بھی ان کو دکھا سکیں گے۔

اب تک ہم نے جو کچھ کیا ہے تجربے کے طور پر کیا ہے اور الحمد للہ اس تجربے کو نہایت کامیاب پایا ہے۔ میں نے ان طلبہ کو صرف نحو مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے پر بطریق مشق پڑھائی ہے اس میں شاید ڈھائی تین ماہ سے زیادہ کی مدت نہیں لگی ہے۔ (یہ واضح رہے کہ یہ طلبہ میرے پاس دو گھنٹے سے زیادہ وقت صرف نہیں کرتے) اس کے بعد مولانا مرحوم ہی کی تیار کی ہوئی ایک ابتدائی ریڈر ان کو پڑھا دی اور اس میں زبان کے ساتھ ساتھ نحوی مسائل کی طرف از سر نو توجہ دلا دی۔ ساتھ ہی قرآن مجید کا درس روز اول سے برابر ہوتا رہا جس میں نحو، زبان، نظم کلام اور تاویل آیات تم ہر چیز ان کے سامنے آتی رہی۔ ریڈر کے بعد ادب میں مزید ترقی کے لئے ان کو کلیلہ و دمنہ پڑھائی گئی اور اس کے بعد ان کو مقدمہ ابن خلدون شروع کرا دیا گیا۔ میرا خیال تھا کہ مقدمہ پورا پڑھایا جائے لیکن کچھ عرصہ کے بعد طلبہ نے محسوس کیا کہ اب وہ اس کے مطالب بآسانی اخذ کر سکتے ہیں اس وجہ سے اس کو سبقاً پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اس کو ہٹا کر حماسہ (ابو تمام) شروع کرا دیا گیا ہے میرا خیال یہ ہے کہ یہ پورا پڑھا دیا جائے تاکہ عربی زبان، اس کے قواعد اور اس کے اسالیب سے ان کی نظر اچھی طرح آشنا ہو جائے لیکن صحیح اندازہ آگے چل کر ہو سکے گا کہ یہ کتنا پڑھایا جائے۔ اس کے بعد عربی ادب میں ان کو کوئی چیز سبقاً پڑھانے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی یہ ہر چیز کا مطالعہ خود آسانی سے کر سکیں گے۔ ہر فن کی مستند کتابوں کی حیثیت اور ان کے مراتب سے ان کو برابر آگاہ کیا جا رہا ہے تاکہ وہ اُن سے فائدہ اٹھا سکیں۔

حدیث میں مسلم شریف اس وقت ہو رہی ہے، کوشش یہ ہے کہ رمضان کے اخیر تک یہ ختم ہو جائے۔ اس کے بعد حدیث میں کسی کتاب کے پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ متن اور شرح اور اصول کی تمام مستند کتابوں سے ساتھ ساتھ انہیں آگاہ کیا جا رہا ہے تاکہ عند الضرورت ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

حدیث کے بعد فقہ میں ابن رشد کی بدایۃ المجتہد پوری پڑھانے کا ارادہ ہے یہ کتاب ایک تو جامع و مختصر ہے، دوسری خوبی اس میں یہ ہے کہ اس میں فقہ اسلامی کے تمام مذاہب اور ان کے دلائل بیان ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی کتاب اصول فقہ میں بھی پڑھانی ہوگی۔ لیکن ابھی تک اس کے لئے کوئی موزوں کتاب منتخب نہیں ہو سکی ہے۔ ایک دو نئی کتابوں کی تعریف سُنی ہے، ان کے حاصل کرنے کی فکر ہے۔ شاید ان میں کوئی مطلب کی نکل آئے۔

(باقی بر صفحہ ۵۴)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

۳۵

تفسیر سورۂ بقرۃ

۷۰۔ آگے کا مضمون (آیات ۲۰۴-۲۱۴)

اُوپر حج کے بیان کے سلسلے میں، آخر میں یہ بات جو آگئی تھی کہ بعض لوگ حج کو صرف اپنی دنیوی تمنا برآریوں کا ذریعہ بناتے ہیں، آخرت کی طلب سے ان کے سینے بالکل خالی ہوتے ہیں، یہیں سے کلام منافقین کے ذکر کی طرف مڑ گیا اس لئے کہ جو لوگ اتنے دنیا طلب ہوں کہ حج کی دعاؤں میں بھی اپنی دنیا ہی بنانے کی کوشش کریں وہ منافق ہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ذکر کی مناسبت سے چند آیتوں میں منافقین کے کردار پر تبصرہ بھی ہو گیا اور ساتھ ہی پکے اہل ایمان کا جو کردار ہونا چاہئے اس کا ذکر بھی آگیا اور ان کو بعض مناسب موقع ضروری تنبیہات بھی کر دی گئیں تاکہ منافقوں کی منافقانہ روش ان کے لئے کسی ٹھوکر کا باعث نہ بنے ——

اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ

وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٢١٠﴾ سَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ۗ وَ
مَن يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾ زُيِّنَ
لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا
فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾ كَانَ النَّاسُ
أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ
بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ
مِن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۖ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا
فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۗ وَاللَّهُ يَهْدِي مَن يَشَاءُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٢١٣﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ
أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم ۖ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ
وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا
إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جن کی باتیں تو اس دنیا کی زندگی میں تمہیں بڑی میٹھی معلوم ہوتی ہیں اور وہ اپنی دلی نیت پر خدا کو گواہ بھی بناتے ہیں لیکن ہیں وہ کٹر دشمن ۔ اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ اس لئے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد مچائیں اور کھیتی اور نسل کو تباہ کریں اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کا خوف کرو تو گھمنڈ ان کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے ۔ سو ایسوں کے لئے جہنم کافی ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے ۔ ۲۰۴ - ۲۰۵ - ۲۰۶

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنے آپ کو تج دیتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے ۔ ۲۰۷ ۔

اے ایمان والو ، اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو ۔ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے ۔ اگر تم ان کھلی ہوئی تنبیہات کے بعد بھی جو تمہارے پاس آ چکی ہیں اپھسل گئے تو جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے ۔ ۲۰۸ - ۲۰۹ ۔

اب تو یہ لوگ صرف اسی بات کے منتظر ہیں کہ اللہ نمودار ہو جائے بدلیوں کے سایہ میں اور اس کے فرشتے اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے ۔ یہ امور اللہ ہی کے حوالے ہیں ۔ بنی اسرائیل سے پوچھو ، ہم نے ان کو کتنی کھلی کھلی

نشانیاں دیں۔ اور جو اللہ کی نعمت کو، اس کے پانے کے بعد، بدل ڈالے تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ان کافروں کی نگاہوں میں دنیا کی زندگی کھبا دی گئی ہے اور یہ اہل ایمان کا مذاق اڑا رہے ہیں حالانکہ جو لوگ تقویٰ اختیار کئے ہوئے ہیں، قیامت کے دن، وہ ان پر بالا ہوں گے۔ اور اللہ جسے چاہے بے حساب روزی دے۔ ۲۱۰ - ۲۱۱ - ۲۱۲ -

لوگ ایک ہی اُمت بنائے گئے انہوں نے اختلاف پیدا کیا تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے جو خوشخبری سناتے اور خبردار کرتے ہوئے آئے اور ان کے ساتھ کتاب بھیجی قولِ فیصل کے ساتھ تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں، ان میں فیصلہ کر دے۔ اور اس میں اختلاف نہیں کیا مگر ان ہی لوگوں نے جن کو یہ دی گئی تھی، بعد اس کے کہ ان کے پاس کھلی کھلی ہدایات آچکی تھیں، محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے۔ پس اللہ نے اپنی توفیق بخشی سے اہل ایمان کی اُس حق کے معاملے میں رہنمائی فرمائی جس میں لوگوں نے اختلاف کیا۔ اللہ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔ کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں اُن حالات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن سے تمہارے اگلوں کو پیش آیا، ان کو آفتیں اور مصیبتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے پکار اُٹھتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! بشارت ہو کہ اللہ کی مدد قریب ہے!

(۲۱۳-۲۱۴)

۱۷۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ .... وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ | یہ اشارہ ہے منافقین کی طرف۔

جن لوگوں کے کردار کمزور ہوتے ہیں عموماً وہ گفتار کے بڑے غازی ہوتے ہیں۔ یہ اپنی عملی کمزوریوں پر اپنی چرب زبانی اور خوش گفتاری سے پردے ڈالنے اور مخاطب کی نیک نیتی اور کریم النفسی سے فائدہ اُٹھا کر اس کو اپنے طرزِ عمل کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدینہ کے منافقین میں بھی ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا، یہ لوگ کھاتے پیتے سہل پسند، تن آسان اور چرب زبان تھے شکلیں اچھی، لباس صاف ستھرے، مجلسی آداب میں مشاق لیکن دل کے بودے اور عمل کے چور تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اسلام کی حمایت میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے لیکن جب وہاں سے ہٹتے تو اُن کی ساری بھاگ دوڑ اسلام کی مخالفت کی راہ میں ہوتی۔ انہی لوگوں کی تصویر یہ سورہ منافقون میں ان

الفاظ میں کھینچی گئی ہے

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٤﴾

اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کی شکلیں تمہیں اچھی لگتی ہیں اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو ان کی چرب زبانی کی وجہ سے تم ان کی بات سنتے ہو۔ (لیکن حقیقت میں یہ) لکڑی کے کندوں کے مانند ہیں جن کو ٹیک لگا دی گئی ہو، یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اوپر سمجھتے ہیں، اصلی دشمن یہی ہیں، پس ان سے بچ کر رہو۔ اللہ انہیں ہلاک کرے، یہ کس طرح اوندھے ہوئے جاتے ہیں۔

یعنی ان کے پلے ہوئے جسم اور پالش کی ہوئی شکلیں بظاہر دل کو لبھاتی ہیں اور ان کی چکنی چپڑی باتیں، جو یہ تمہیں خوش کرنے کے لئے کرتے ہیں، حمایت اسلام کے جوش میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں اس وجہ سے تمہیں دلکش معلوم ہوتی ہیں اور تم ان کی یہ باتیں سنتے ہو لیکن حقیقت میں یہ اندر سے بالکل کھوکھلے ہیں۔ ان کے سینوں میں نہ دل ہیں، نہ ایمان نہ اسلام، یہ بالکل لکڑی کے کھوکھلے کندوں کے مانند ہیں جن کو گویا لباس پہنا کر دیواروں سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا گیا ہے، دولت ایمان سے محروم ہونے کے سبب سے یہ انتہا درجہ کے بزدل ہیں اس وجہ سے یہ ہر خطرے کو اپنے ہی اُوپر آتا دیکھتے ہیں اور اپنی اس بزدلی کو اپنی چکنی چپڑی باتوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تمہاری توجہ ہٹانے کے لئے تو دوسروں کی طرف انگلی اُٹھاتے ہیں کہ وہ اسلام کے لئے خطرہ ہیں لیکن اسلام کے لئے حقیقی خطرہ خود ان کے نفاق اور ان کی بُزدلی کی طرف سے ہے اس وجہ سے ان کی طرف سے پوری طرح ہوشیار رہو۔

بعینہٖ یہی بات اس زیر بحث آیت میں فرمائی گئی ہے کہ جہاں تک ان کی باتوں کا تعلق ہے یہ دل کو بڑی موہ لینے والی ہوتی ہیں لیکن یہ ساری باتیں ملمع کی ہوئی ہیں اور اس ملمع کی یہ مصنوعی آب و تاب چند روزہ ہے۔ اس دنیا میں بے شک وہ ان جھوٹے موتیوں سے لوگوں کو چھل دینے کی کوشش کر سکتے ہیں لیکن عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب جھوٹے اور سچے اور کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہو جائے گا اور ان کے چہرے کی یہ پرفریب نقاب اُتر جائے گی۔

وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ (اور وہ اپنے دل کی نیت پر خدا کو گواہ ٹھہراتا ہے) خدا کو گواہ ٹھہرانے کے معنی خدا کی قسم کھانے کے ہیں۔ منافق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو معتبر ثابت

کرنے کے لئے بات بات پر قسم کھاتا ہے۔ اس کے پاس چونکہ کردار کی حجت نہیں ہوتی اس وجہ سے ہر قدم پر قسم کو بطور دلیل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جھوٹا آدمی اپنی نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ مخاطب اس کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ اس کو قسم کھا کر یقین نہ دلائے۔ ایک راستباز اور صاحب کردار اپنے عمل پر اعتماد کرتا ہے اور جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ اپنے عمل ہی کی دلیل سے اس کی مدافعت کرتا ہے لیکن ایک منافق کے پاس چونکہ عمل کا سہارا نہیں ہوتا اس وجہ سے جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ قسم کو اپنی ڈھال بناتا ہے اور اسی کے سہارے لوگوں کی گرفت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ سورہ منافقون میں منافقین کے اس کردار کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ① اِتَّخَذُوْۤا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ②	جب تمہارے پاس منافق آتے ہیں تو کہتے ہیں، کہ ہم گواہی دیتے کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ بے شک آپ اس کے رسول ہیں، لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک یہ منافق بالکل جھوٹے ہیں، انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور اس طرح وہ اللہ کے راستہ سے رک گئے ہیں۔ بہت ہی بری ہے وہ حرکت جو یہ کر رہے ہیں۔
۱ ـ ۲ منافقون	

وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ، خصام خصم کی جمع ہے اور الد کے معنی شدید الخصومۃ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو ان کی باتیں تمہارے سامنے بڑی چکنی چپڑی ہوتی ہیں لیکن ان کے دلوں کے اندر تمہارے اور اسلام کے خلاف نہایت شدید قسم کا بغض و حسد بھرا ہوا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ منافقون میں هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ (اصلی دشمن وہی ہیں، ان سے بچ کے رہو) کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔

وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ ...... وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ یعنی تمہارے سامنے تو ان کی باتیں بڑی دل لبھانے والی ہوتی ہیں لیکن تمہارے پاس سے ہٹنے کے بعد ان کی ساری بھاگ دوڑ فساد فی الارض کی راہ میں ہوتی ہے۔ فساد فی الارض سے مراد، جیسا کہ ہم آیت ۱۱ کے تحت واضح کر چکے ہیں، اللہ کی بندگی اور اطاعت کی اس دعوت کی مزاحمت و مخالفت ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ زمین کے تمام امن و عدل کا انحصار اس بات پر ہے کہ اللہ کے بندے اللہ ہی کی بندگی اور اسی کی اطاعت

میں داخل ہو جائیں، جیسا کہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔ اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ (اللہ کی اطاعت میں سب کے سب داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو) اس بندگی و اطاعت میں داخل ہو جانے کے بعد شیطان کے لئے دراندازیوں اور فساد کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں بصورت دیگر تمام نسل انسانی شیطان کی فساد انگیزیوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے اور وہ برابر بغض و عداوت کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے جو حرث و نسل دونوں کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ اہل عرب نے اسلام سے پہلے دور جاہلیت میں اس صورت حال کا اچھی طرح تجربہ کر لیا تھا اس وجہ سے ان کے لئے یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہ تھا کہ تباہی کے اس جہنم سے خلق خدا کو نکالنے کے لئے سلم و اطاعت کی وہ دعوت کتنی بڑی رحمت و برکت تھی جو قرآن نے پیش کی تھی اور پھر انسانیت کے کتنے بڑے دشمن تھے وہ لوگ جو اس دعوت کی مخالفت کر رہے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا اسی جہنم میں پڑی جلتی رہے۔

"وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ" یعنی بظاہر وہ کتنی ہی چکنی چپڑی باتیں کیوں نہ کریں اور اسلام اور پیغمبر کی مدح کا دم کیوں نہ بھریں لیکن وہ اللہ کی نظروں میں کوئی مقام کس طرح حاصل کر سکتے ہیں جب وہ اپنے طرز عمل سے اس فساد کو ہوا دے رہے ہیں جس کے نتیجہ میں تمام انسانیت کی تباہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب یہ دنیا بنائی ہے تو وہ اس کی فلاح و بہبود کو پسند کرتا ہے، اس میں فساد اور مفسدین کو وہ پسند نہیں کرتا۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ ...... وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ | اسلام دوستی اور دینداری کے ایسے جھوٹے دعوے داروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب ان کی کسی خلاف اسلام حرکت پر گرفت کی جائے اور ان کو توبہ اور اصلاح کی طرف توجہ دلائی جائے تو ان کے پندار کو بڑی چوٹ لگتی ہے، وہ اپنی کمزوری و بے اعتمادی اور احساس کہتری کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ انہوں نے اپنی کمزوری تسلیم کر لی تو ان کا سارا بھرم ختم ہو جائے گا، اس وجہ سے وہ اپنی اکڑ میں کوئی خم نہیں پیدا ہونے دیتے۔ منافقین کے اس خاص پہلو کی طرف سورۂ منافقون میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ۞ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ توبہ کرو، اللہ کا رسول بھی تمہارے لئے خدا سے مغفرت مانگے تو وہ اپنی گردن موڑ لیتے ہیں اور تم ان کو دیکھو گے وہ استکبار کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لئے

لَهُمْ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○
(۶-۵)

یکساں ہے تم ان کے لئے مغفرت مانگو یا نہ مانگو، اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ بدعہدوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

اسی حقیقت کی طرف سورہ نساء کی یہ آیتیں بھی اشارہ کر رہی ہیں۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ
يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۶۱ فَكَيْفَ
اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ثُمَّ جَآءُوْكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ
اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِيْقًا ۶۲
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ
فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيْغًا ۶۳ وَمَآ اَرْسَلْنَا
مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ وَ
لَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ
فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ
الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا
۶۴ (۶۱-۶۴ - نساء)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات کے فیصلہ کے لئے اللہ کی اتاری ہوئی چیز اور رسول کی طرف آؤ تو تم منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے بڑی بے پروائی سے گریز کرتے ہیں۔ لیکن اس وقت کیا ہوگا، جب ان کے اعمال کی پاداش میں ان کو کوئی مصیبت پہنچے گی، پھر یہ تمہارے پاس قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ، خدا کی قسم! ہم نے تو یہ محض خیر خواہی اور سازگاری پیدا کرنے کے جذبے کے تحت کیا؟ اللہ ان کے دلوں کی بات کو خوب جانتا ہے تو ان سے اعراض کرو اور ان کو نصیحت کرو اور ان کو خود ان کے مفاد میں دلنشین بات کہو۔ اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اور اگر وہ اس وقت جب کہ انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا، تمہارے پاس آتے، پھر اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لئے مغفرت مانگتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔

"فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ" (پس اس کے لئے جہنم ہی کافی ہے) یہ ٹکڑا بالعموم اس موقع پر آیا ہے جہاں یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جن کو دنیا میں ان سنگین شرارتوں کے باوجود ڈھیل دی جاتی ہے تو یہ ڈھیل ان کے لئے کوئی رعایت نہیں ہے بلکہ یہ صرف اس لئے دی جاتی ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے آگے جو

جہنم تیار ہے وہ ساری کسر پوری کر دینے والی ہے، اس کے ہوتے ان کے لئے اس دُنیا میں کسی عذاب کی ضرورت نہیں ہے۔ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ۔ وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ ...... وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ | شری یشری کے معنی بیچنے کے ہیں۔ یہ اشارہ ہے مخلص اہلِ ایمان کی طرف جنہوں نے اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لئے اپنا سب کچھ تج دیا ہے ان کا ذکر یہاں دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ ان منافقین کو غیرت آئے جن کا ذکر اُوپر کی آیات میں ہوا ہے کہ سب تمہارے ہی جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں بلکہ تمہارے ہی آنکھوں کے سامنے اللہ کے وہ بندے بھی ہیں جو اپنا تن، من، دھن سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اپنی زندگی کا مقصد اس کی رضا کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہو، جو ان منافقین کے برعکس اللہ ہی کے لئے جینے اور اللہ ہی کے لئے مرنے والے تھے، منافقین کے ذکر کے پہلو بہ پہلو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف اشارہ کر کے یہ ظاہر فرما دیا کہ اس کے جانباز و وفادار بندے بھی موجود ہیں اور وہی اس کی رأفت و رحمت کے سزاوار ہیں۔

" وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ " میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر چند اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیع و شرا کا عہد بڑا کٹھن ہے اور اللہ کی رضا جوئی کے لئے اپنی ساری زندگی کو تج دینا ایک عظیم جہاد ہے جس کے تقاضے بڑے صبر آزما ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے، وہ ان پر ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، اور اگر اس عہد کے تقاضوں میں ان سے کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے تو اس کو معاف کرتا ہے، لغزشوں اور کوتاہیوں کے لئے اس نے توبہ و اصلاح کی راہیں کھلی رکھی ہیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ...... عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ | سِلم، کے معنی اطاعت کے ہیں اور مراد اس سے اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی اسلام کے لئے ہیں لیکن یہ فرق محض ظاہر کا فرق ہے، اس لئے کہ اسلام کی اصل حقیقت اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔ یہ لفظ حرب کا ضد بھی آتا ہے اس صورت میں اس کے معنی صلح و امن کے ہوتے ہیں، اس مفہوم میں بھی اسلام کی روح موجود ہے، اس لئے کہ صلح و امن کی اصل راہ اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہے۔

" كَآفَّةً " کے معنی جماعت کے ہیں اور یہ یہاں حال پڑا ہوا ہے۔ قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ اسی شکل میں استعمال ہوا ہے۔

خطاب اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے عام یعنی تمام مسلمانوں سے ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے۔ ان سے خطاب کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ سچے اور پکے اہل ایمان کی طرح تم بھی اللہ و رسول کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ ان منافقین کی وفاداری تقسیم تھی۔ یہ ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے مدعی تھے اور اسلام کی حمایت کا دم بھرتے تھے اور دوسری طرف اسلام کے مخالفین کے ساتھ بھی ان کا ساز باز تھا۔ قرآن نے جگہ جگہ ان کی اس روش کی طرف اشارے کئے ہیں۔ مثلاً سورہ محمد میں انہی لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ۝ (۲۶ - محمد)

یہ اس وجہ سے ہے کہ ان منافقین نے ان لوگوں سے جنہوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کا برا منایا، یہ کہا کہ ہم بعض معاملات میں آپ ہی لوگوں کی اطاعت کریں گے۔ اللہ ان کی اس رازداری کو خوب جانتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں "لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا" سے اشارہ یہود اور مشرکین کے لیڈروں ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔

سورۂ نساء کی مندرجہ ذیل آیات بھی ان کی اسی روش کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا ۝ (۶۰ - ۶۱ نساء)

ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مدعی ہیں کہ وہ اس چیز پر بھی ایمان لائے ہیں جو تم پر اتری ہے اور اس چیز پر بھی جو تم سے پہلے اتری ہے، یہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لئے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔ شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بڑی ہی دور کی گمراہی میں پھینک دے۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو تم ان منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ طرح طرح سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں۔

یہ بات اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ یہاں طاغوت سے مراد یہود کی عدالتیں ہیں۔ چونکہ ان عدالتوں سے رشوت

وغیرہ دے کر خلاف عدل و انصاف فیصلے کرانا بڑی آسانی سے ممکن تھا، نیز علمائے یہود نے اپنی کتر بیونت سے شریعت کے بہت سے احکام اپنی خواہشات کے مطابق کر دیئے تھے اس وجہ سے منافقین اپنے بہت سے معاملات انہی کی عدالتوں میں لے جانا چاہتے تھے اور جب ان سے کہا جاتا کہ ایمان و اسلام کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ اپنے معاملات قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کریں تو وہ مختلف حیلوں حوالوں سے گریز اختیار کرنے کی کوشش کرتے۔

وفاداری کی یہ تقسیم ایمان و اسلام کے منافی بلکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے شرک ہے۔ یہیں سے شیطان کو انسان کو گمراہ کرنے کی جیسا کہ سورۂ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں اشارہ ہے، نہایت کشادہ راہ مل جاتی ہے اس وجہ سے قرآن نے اس فتنہ کے دروازے کو بند کرنے کی ہدایت کی اور حکم دیا کہ سب کے سب بغیر کسی استثناء اور بغیر کسی تحفظ کے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت میں داخل ہو جائیں۔ اطاعت کامل کا یہی راستہ امن و عدل کا راستہ ہے اور اسی راستہ پر چلنے والوں کے لئے فوز و فلاح ہے: جو لوگ اس سے ہٹ کر کوئی راہ نکالنی چاہتے ہیں اور بیک وقت کفر اور اسلام دونوں سے رسم و راہ رکھنے کے خواہشمند ہیں وہ شیطان کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں اور شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے اس لئے کہ اس نے روز اوّل ہی سے اس کی راہ مارنے اور اس کو گمراہ کرنے کا کھلم کھلا الٹیمیٹم دے رکھا ہے۔

فَإِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ ...... عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○ | "بینات" سے مراد وہ تنبیہات و تہدیدات بھی ہیں جو شیطان کی چالوں اور اس کے فتنوں سے آگاہ کرنے کے لئے نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور وہ واضح اور قطعی ہدایات بھی جو ایمان و اسلام کے تقاضوں کو بیان کرنے کے لئے وارد ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان سورج کی طرح روشن ہدایات و تنبیہات کے بعد بھی تم نے (خطاب منافقین ہی سے ہے) اپنے ازلی اور کھلے ہوئے دشمن ہی کے نقش قدم کی پیروی کی تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا کی پکڑ سے تم کسی طرح نہیں بچ سکتے۔ خدا عزیز و حکیم ہے۔

عزیز کی صفت کے حوالہ سے دو حقیقتوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ ایک تو اس حقیقت کی طرف کہ خدا کوئی کمزور و ناتواں ہستی نہیں ہے بلکہ وہ غالب و توانا ہے تو جو اس کی تنبیہات کے باوجود شیطان کی پیروی کریں گے ان کو وہ اس عذاب میں ضرور پکڑے گا جو شیطان کے پیرووں کے لئے اس نے مقدر کر رکھا ہے اور جس کی اس نے پہلے سے خبر دے رکھی ہے۔ دوسرا اس طرف کہ جو لوگ ان واضح ہدایات کے بعد بھی راہ حق کو

چھوڑ کر شیطان ہی کی پیروی اختیار کریں گے وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنا ہی بگاڑیں گے اس لئے کہ خدا عزیز ہے یعنی نفع و نقصان سے بالاتر۔

اسی طرح حکیم کی صفت بھی یہاں دو حقیقتوں کو نمایاں کر رہی ہے۔ایک تو یہ کہ اس دنیا کا خالق حکیم ہے اور اس کے حکیم ہونے کا یہ بدیہی تقاضا ہے کہ وہ اپنی ہدایت پر جمے رہنے والوں اور اس سے منحرف ہو جانے والوں کے درمیان ان کے انجام کے لحاظ سے امتیاز کرے اگر وہ ان میں کوئی امتیاز نہ کرے بلکہ دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دے یا دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک حکیم نہیں بلکہ ایک کھلنڈرا ہے اور یہ دنیا ایک پر حکمت اور بامقصد کارخانہ نہیں بلکہ کسی کھلنڈرے کا کھیل، تماشہ ہے۔ دوسری یہ کہ بدی اور نیکی کے نتائج کے ظہور میں جو دیر سویر ہوتی ہے وہ سب حکمت پر مبنی ہوتی ہے، بسا اوقات شیطان کے پیروکاروں کو اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے اور بسا اوقات اہل حق کسی آزمائش میں ڈالے جاتے ہیں، اس سے نہ تو اہل باطل کو مغرور ہونا چاہیئے، نہ اہل حق کو مایوس۔ بلکہ یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ مہلت اور یہ آزمائش دونوں خدائے حکیم و دانا کی حکمت پر مبنی ہے اور اس حکمت کے تحت اس کے قوانین اور ان کے نتائج بالکل قطعی اور اٹل ہیں، ان میں سرمو فرق ممکن نہیں۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ .... وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ | "نظر ینظر" کے معنی جس طرح دیکھنے کے آتے ہیں اسی طرح اس کے معنی انتظار کرنے کے بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان بینات اور ان تنبیہات و تہدیدات کے بعد بھی جو لوگ جادہ مستقیم پر ہموار نہ ہوسکے بلکہ شیطان کے پیچھے بھٹکتے ہی رہ گئے اب سنت اللہ کے تحت تو ان پر اتمام حجت کے لئے کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اب بھی اگر وہ کسی چیز کے منتظر ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ اس بات کے خواہشمند ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ اس طرح ان کو اپنا جلال دکھائے کہ اس کے ساتھ بدلیوں میں اس کا عذاب چھپا ہوا ہو اور اس کے جلو میں اس کے فرشتوں کی افواج قاہرہ ہوں اور حق و باطل کی اس کشمکش کا آخری فیصلہ کر دیا جائے۔ لیکن یہ فیصلہ نبی کے کرنے کا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ ہی سے ہے، وہی جانتا ہے کہ کس قوم کا فیصلہ کب ہونا چاہئے اور کس طرح ہونا چاہئے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت وہ معتبر ہے جو نتیجہ ہو آیات الٰہی کے سننے اور سمجھنے کا نہ وہ جو منتظر ہو جلال الٰہی اور قہر خداوندی کے ظہور اور مشاہدہ کا۔ جو گروہ اس چیز کا منتظر رہتا ہے وہ صرف اپنی

کے ظہور کا منتظر ہوتا ہے اس لئے کہ وہ حقائق کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننا چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو مطلوب یہ ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے اور اس کے بھیجے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی رہنمائی کو قبول کرے۔

سَلْ بَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ كَمْ اٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ اٰيَةٍۢ بَيِّنَةٍ .... فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝

"آیات بینات" سے مراد ہیں وہ کھلے کھلے معجزات جو بنی اسرائیل کو دیئے گئے۔ ان کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ایمان و ہدایت کا راستہ ان لوگوں پر کھلتا ہے جو عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں جو عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے وہ دنیا جہان کے معجزے دیکھ کر بھی بدستور اپنے تذبذب اور اپنی بے اعتقادی ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ آخر دیکھو، بنی اسرائیل نے کتنے معجزے اپنی آنکھوں سے دیکھے ان معجزات سے قطع نظر جو حضرت موسیٰ کے ہاتھوں سرزمین مصر پر ظاہر ہوئے، خود بنی اسرائیل کے لئے سمندر خشک ہوا، کوہ طور شق ہوا، ایک خشک پہاڑی سے اکٹھے بارہ چشمے پھوٹ نکلے، ایک صحرائے بے آب و گیاہ میں ان کے لئے من و سلویٰ کا خوان نعمت بچھا دیا گیا، غرض قدم قدم پر ان کے لئے معجزے ظاہر ہوئے لیکن جو بے اعتقادی ان پر روز اوّل سے مسلط تھی وہ بدستور مسلط رہی، پھر انہی کے نقش پر چلنے والوں سے یہ توقع کس طرح کرتے ہو کہ اگر ان کے سامنے ان کی طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے گا تو ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ غلط ہے ان کی آنکھیں بڑے سے بڑے معجزے دیکھنے کے بعد بھی بند ہی رہیں گی۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کا حوالہ دینے میں خاص پہلو یہ ہے کہ جن منافقین کے حال پر یہاں تبصرہ ہو رہا ہے وہ زیادہ تر بنی اسرائیل ہی کے گروہ سے تعلق رکھنے والے تھے، اس وجہ سے اُن کے سامنے انہی کی پچھلی تاریخ کا آئینہ رکھ دینے میں ایک نہایت ہی بلیغ تعریض ہے۔

" وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ" نعمۃ اللہ سے مراد یہاں اللہ کی ہدایت اور شریعت ہے۔ اور اس کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی قدر کر کے اس کو ایمان و ہدایت کا ذریعہ بنا کے بجائے اس کی ناقدری کر کے اس کو کفر کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بعض مقامات میں تبدیلی کی اس نوعیت کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا ۲۸ ابراہیم (ذرا دیکھو تو ان لوگوں کو جنھوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل دیا) مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی اس عظیم نعمت کو پا کر اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کسی ایسے نشان کے ظہور کے منتظر ہیں جو حق کے آگے ان کی گردن زبردستی خم کر دے تو وہ درحقیقت ہدایت کو ضلالت سے اور نعمت کو نقمت سے بدل رہے ہیں۔

ایسے لوگ سنت الٰہی کے مطابق اللہ تعالیٰ کی سخت پاداش سے دوچار ہوتے ہیں۔

زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ...... وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ○

یہ اس فریب نظر کی طرف اشارہ ہے جس میں مبتلا ہونے کے سبب سے اہل باطل اپنی باطل پرستیوں ہی میں مگن زندگی گزارتے چلے جاتے ہیں اور ان کو نبی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے جب ان کی اس غفلت کے انجام بد کی خبر دی جاتی ہے تو ان کا مذاق اڑانے اور ان کو زچ کرنے کے لئے عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں، جیسا کہ اُوپر والی آیت میں اشارہ ہو چکا ہے۔

فریب نظر یہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں حق اور باطل اور کفر و ایمان دونوں کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ کوئی شخص اگر نیکی اور اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ابتلاء کے قانون سے بالاتر ہو جائے بلکہ بعض حالات میں اس کا ابتلا اس کے ایمان کے اعتبار سے سخت سے سخت تر ہوتا جاتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص کفر و نافرمانی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی سنت الٰہی یہ نہیں ہے کہ فوراً خدا کے فرشتے اتر کر اس کی گردن ناپ دیں بلکہ اکثر حالات میں اس کو ایسی ڈھیل پر ڈھیل ملتی جاتی ہے کہ اس کی جسارت دن پر دن بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اسی فریبِ نظر کو یہاں "زُيِّنَ" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی اس دنیاوی زندگی کا یہ فریب اس طرح ان کی نگاہوں میں کھبا دیا گیا ہے کہ وہ اس کے اس پہلو سے نگاہ ہٹا کر کسی اور پہلو سے اس کو دیکھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں میں اس زندگی کی اس خاص پہلو سے تزئین شیطان نے کی ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں اس کی تصریح ہے۔ اور یہ امر بھی ظاہر ہے کہ شیطان کو اس تزئین کا موقع انسان کی عاجلہ پرستی اور اتباع شہوات نے فراہم کیا ہے۔

جو لوگ اس فریب نظر میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو جب اہل ایمان ان کے اعمال و عقائد پر دُنیا یا آخرت میں کسی پکڑ یا سزا وغیرہ کی یاد دہانی کرتے ہیں تو وہ ان پر ہنستے ہیں اور ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ بتاؤ، تمہارا حال اچھا ہے یا ہمارا۔ اگر ہمارا حال اچھا ہے اور ظاہر ہے کہ تم سے بدرجہا اچھا ہے تو ہم کیوں نہ سمجھیں کہ ہمارا ہی رویہ بھی صحیح ہے۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی تمام بدمستیوں کے باوجود اس قسم کی کوئی گرفت ان پر نہیں ہو رہی ہے جس کے ڈراوے اہل ایمان ان کو سناتے ہیں تو اپنی روش پر ان کا اطمینان اور بھی بڑھ جاتا ہے اور وہ ان کا مذاق اڑانے میں اور بھی زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔

" وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ " یعنی اس دنیا میں تو بلاشبہ صورت حال ایسی ہی ہے کہ ظاہر پرست اہل ایمان اور اہل تقویٰ کا مذاق اڑا سکتے ہیں اس لئے کہ اس دنیا کا کارخانہ جزا اور سزا کے قانون پر نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ ابتلا کی سنت کے تحت چل رہا ہے لیکن اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آنے والی ہے جو جزا کے اعمال کا مظہر ہوگی اس دن وہ اہل ایمان جو دنیا کے اس فریب نظر میں مبتلا نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تقویٰ کی زندگی گزاری ہے وہ بالا ہوں گے۔

یہاں صرف یہ فرمایا کہ وہ بالا ہوں گے، یہ نہیں بتایا کہ ان کے مذاق اڑانے والے کہاں ہوں گے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز بالکل متعین تھی، اس کی خبر ان کو پیغمبر اور اہل ایمان کے انذار کے ذریعہ سے دیدی گئی تھی اس وجہ سے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اہل ایمان کی فوقیت کی وضاحت کے لئے یہ فرمادیا کہ " اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے"۔ رزق تعبیر ہے اللہ تعالیٰ کے فضل کی اور اس فضل کے بابت ارشاد ہوا کہ بے حساب ہوگا یعنی توقعات اور اندازوں، قیاسوں اور گمانوں کے تمام پیمانے ان کے ناپنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس حقیقت کی تمثیل بعض احادیث میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل دوسرے مقام میں آئے گی۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً .... وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ اوپر اہل ایمان کے ساتھ کفار و منافقین کے مذاق و استہزا کا ذکر ہوا ہے، اب اس آیت میں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے کہ اطمینان رکھو، موقف حق پر تم ہی ہو، اختلافات و نزاعات کے درمیان فیصلہ کرنے والی حقیقت تمہارے ہی پاس ہے اور کفر و ضلالت کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے کے اندر صرف تمہی ہو جن کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہوئی ہے۔ یہ کفار و منافقین جو تمہاری مخالفت کر رہے ہیں اور تمہارا مذاق اڑا رہے ہیں یہ سب اس باہمی ضد اور عناد کا کرشمہ ہے جس میں یہ ہمیشہ سے مبتلا ہیں اور اس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے یہ خدا کی ہدایت کے ایسے دشمن ہوگئے ہیں کہ نہ اس کو خود پانا چاہتے اور نہ کسی دوسرے کو پالنے دینا چاہتے؛ تو تم ان کی ان مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے موقف پر جمے رہو، آزمائش کا یہ دور جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت ہے، گزر جانے کے بعد کامیابی اور فتحمندی تمہارے ہی لئے ہے۔

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً میں "کان" ہمارے نزدیک تامہ ہے دوام کے مفہوم میں جیسا کہ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے اس نے لوگوں کو ایک ہی دین دیا

ایک ہی اُمت بنایا، جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَام ہمیشہ سے اللہ کا دین اسلام ہی ہے، فِطْرَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا، یہی دین فطرت ہے جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا اور یہی دین ہے جو اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا، نہ اس نے اسلام کے سوا کسی اور دین کو پسند فرمایا نہ اُمت مسلمہ کے سوا کوئی اُمت بنانی چاہی۔ اس کے ہاں دین صرف اسلام اور اُمت صرف اُمت مسلمہ ہے۔

کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً کے بعد فَاخْتَلَفُوْا کا لفظ محذوف ہے۔ اس محذوف کو آگے چل کر کھول دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے لِیَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا فِیْہِ۔ یہ حذف عربی اسلوب کے مطابق تکرار سے بچنے کے لئے فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ایک ہی دین دیا اور ایک ہی اُمت بنائی لیکن لوگوں نے اس دین میں اختلاف کیا اور اس کے نتیجے میں تحزب اور گروہ بندی میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے اپنے انبیاء بھیجے کہ وہ لوگوں کو دین میں اختلاف کے نتائج بد سے آگاہ کریں اور حق پر قائم رہنے والوں کو کامیابی اور نجات کی خوشخبری سُنا دیں، اللہ نے ان نبیوں کو کتابیں عطا فرمائیں، یہ کتابیں حق یعنی قول فیصل کے ساتھ اُتریں تاکہ ان تمام نزاعات کا جو دین حق میں پیدا کر دی گئی تھیں، فیصلہ کر کے از سر نو حق کو اجاگر کر دیا جائے۔ لیکن جن اُمتوں کو یہ حق عطا ہوا انہوں نے نہایت واضح دلائل کی روشنی میں اس حق کو سمجھ لینے کے بعد محض آپس کی ضدم ضدا کے سبب سے خود ہی اس حق میں اختلاف کیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار حق کی وضاحت کے باوجود اختلاف قائم ہی رہا اور انہی لوگوں کے ہاتھوں قائم رہا جو اس حق کے امین بنائے گئے تھے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے اس نزاع و اختلاف میں حق کی راہ پھر اس قرآن کے ذریعہ سے اہل ایمان یعنی پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی کھولی ہے اور اللہ ہی ہے جو اپنی مشیت اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے صراط مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

اس آخری ٹکڑے کے اندر اس عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ بھی ہے جو اس اُمت پر دین حق کی امانت سے متعلق عاید ہوتی ہے کہ اس حق کو پاکر تم بھی اس میں اسی طرح کے اختلافات برپا کرنے والے نہ بن جانا جس طرح دوسرے تم سے پہلے بن گئے اور اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ بازی کوئی آسان بازی نہیں ہے بلکہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے، دینداری اور حق پرستی کے پشتینی ٹھیکہ دار جن کے کاروبار کی ساری کامیابی کا دار و مدار حق کے گم ہی رہنے میں ہے، تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے بلکہ

تمہارے پیچھے جھاڑ کے کانٹے بن کر پڑ جائیں گے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ .... أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ | یہ اس سنت اللہ کی طرف اشارہ ہے جس کی کسوٹی پر ہر وہ جماعت پرکھی جاتی ہے جو اصل حق کی حامل بن کر اٹھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین اور کفار کی اس مخالفت اور اس استہزاء سے گھبرا نہ جاؤ، ابھی تو اس راہ عشق کی یہ ابتدا ہے، آگے اس سے کہیں کٹھن مقامات آتے ہیں، تمہیں بھی ان سارے مراحل سے گزرنا ہے جن سے تم سے پہلے اٹھنے والے حاملین حق کو گزرنا پڑا ہے، تم سے پہلے جنھوں نے اس راہ میں قدم رکھے ان کو ایسے مصائب و شدائد پیش آئے اور وہ آزمائشوں کے ہاتھوں اس طرح جھنجھوڑ دیئے گئے کہ رسول اور اس کے ساتھی سب متی نصر اللہ پکار اُٹھے "حتیٰ یقول" ہمارے نزدیک حال کے معنی میں ہے اور مقصود اس سے تصویر حال ہے۔ اور متی نصر اللہ کا اسلوب اس فریاد کو ظاہر کرتا ہے جس کی نوعیت امید کے دروازے پر آخری دستک کی ہوتی ہے۔ فرمایا کہ نصرت الٰہی کا دروازہ اسی دستک کی کلید سے کھلتا ہے۔ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ۔ ہے

رہرو تشنہ لب نہ گھبرانا
اب لیا چشمۂ بقا تو نے

اعلان

ہمیں نہایت ندامت اور شدید احساس ہے کہ قارئین "میثاق" کو کئی مہینوں سے کوشش کے باوجود رسالہ وقت پر بھیجنا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ یہ مسلسل تاخیر بعض وجوہ کے تحت محض مجبورانہ ہی ہے۔ اس تاخیر اور قارئین کرام کی زحمت انتظار کو ختم کرنے کیلئے ہم برابر کوشش کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق کے ذریعہ توقع رکھتے ہیں کہ دو تین ماہ کے اندر انشاء اللہ پرچہ ہر ماہ مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں قارئین کرام کے ہاتھوں میں پہنچانے کی کوشش میں کامیاب ہو جائیں گے۔

منیجر ماہنامہ میثاق لاہور

افاداتِ فراہیؒ
جناب خالد مسعود صاحب

حکمتِ صوم و جہاد

ا۔ حکمتِ صوم

روزے کا اثر جسمانی بھی ہوتا ہے اور روحانی بھی۔ اس کے جسمانی اثر سے اہلِ عرب چونکہ خوب واقف تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے روحانی پہلو —— یعنی تقویٰ، پاکیزگیٔ نفس کے اہتمام اور فقراء کے ساتھ ہمدردی —— کو ان کے لئے نمایاں کیا، اور اس مقصد کی خاطر "تقویٰ" کا لفظ استعمال کیا۔ کیونکہ یہ لفظ روزے کی اصل حقیقت اور اس کے بارے میں اہلِ عرب کی سابقہ معلومات سے قریب تر تھا۔ اہلِ عرب اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو بھوک اور پیاس کا عادی بنانے کے لئے ان کی باقاعدہ تربیت کیا کرتے تھے تاکہ مشکل پیش آنے پر وہ زیادہ سے زیادہ سختی برداشت کر سکیں۔ اسی طرح وہ اپنے گھوڑوں کو تند ہوا کے مقابلے کی بھی تربیت دیتے تھے کیونکہ یہ چیز سفر اور جنگ کے حالات میں، جب کہ ہوا کے تھپیڑوں سے سابقہ پیش آجائے، بڑی کام آنے والی ہے۔

[دیکھا نہیں اللہ تعالیٰ نے کیونکر تند ہوا سے اپنے نبی کی نصرت کی تھی؟[1] اور ایسا ہی مشاہدہ خود ہمارے عہد میں بھی کفار کے ایک بڑے گروہ کے معاملے میں کیا جا چکا ہے]

جریرؔ نے اپنے ایک شعر میں ان دونوں باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

ظللنا بستن الحرور کاننا   لدی فرس مستقبل الریح صائم

(ہم لو کے تھپیڑوں کی جگہ میں رہے گویا ہم ایسے گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہوں جو بادِ تند کا مقابلہ

[1] شاید جنگِ احزاب کی طرف اشارہ ہے۔ (مترجم)

کر رہا ہو اور روزہ رکھے ہوئے ہو۔)

اس شعر میں اس نے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے حال کی تشبیہ ایک ایسے شخص سے دی ہے جو اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا ہو اور اسے بھوک اور بادِ تند کے مقابلے کی تربیت دے رہا ہو۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب تشبیہ کے لئے انہی چیزوں کو استعمال کرتے تھے جو ان کے عام تجربے میں آئی ہوں۔ ان کو نادر چیزوں کی تلاش زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

شعر میں لفظ "لدی" کا استعمال معنی خیز ہے کیونکہ اس سے مفہوم یہ پیدا ہوگا کہ وہ خود بھی اپنے گھوڑے کے ساتھ کھڑا تھا اور چونکہ یہ بات عام تجربے کے خلاف ہے کہ کوئی شخص اپنا گھوڑا لئے کھڑا ہو اور اس کا رُخ گھوڑے کے رُخ سے مختلف ہو، اس لئے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تربیت میں اہلِ عرب خود بھی برابر کے شریک ہوتے تھے۔

الغرض گھوڑوں کے صوم کے بارے میں اشعار بہت ہیں، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہلِ عرب گھوڑوں کے لئے روزے کی افادیت سے خوب واقف تھے اور اس مفہوم کی تعبیر کے لئے "صوم" ہی کا لفظ استعمال کرتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی روزے کو "صوم" ہی سے تعبیر کیا۔ یوں بھی روزے کی عبادت کے لئے صوم کا لفظ ان کے ہاں پہلے سے مستعمل تھا کیونکہ انہوں نے اپنے ملک کے یہود و نصاریٰ کو روزہ رکھتے دیکھا تھا۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جسمانی پہلو سے روزے کی حکمت عربوں کی نظروں سے اوجھل نہ تھی البتہ اس کے دینی اور روحانی پہلو کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کے اس گمانِ باطل کی تردید کردی کہ روزے کا مقصد ایذائے نفس ہے اور اس بات کی تصریح کردی کہ اس کا مقصودِ اصلی طہارت اور پاکیزگی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو تکلیف میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتا۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ مسلمانوں کو روزوں کا حکم اسی زمانے میں دیا گیا جب ان پر جنگ و جہاد فرض کئے گئے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ کے لئے روزے کی حکمت اس پہلو سے خوب عیاں ہوگئی کہ یہ دراصل مصیبت و مشقت برداشت کرنے کی مشق ہے۔ یہیں سے روزے اور جہاد کی باہمی مناسبت کے بارے میں بھی اصل حقیقت تک پہنچنا ان کے لئے مشکل نہ رہا کیونکہ جنگ کے لئے اس طرح کی تربیت کی ضرورت کا انہیں پہلے سے احساس تھا۔ البتہ ہم لوگ چونکہ اس پس منظر سے ناواقف تھے اس لئے روزے اور جہاد کی باہمی

مناسبت بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل رہی سامی سے اس بات کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ کرام پر قرآن کا نظم اور آیات کی باہمی مناسبت خوب عیاں تھی۔ اس جملہ معترضہ کے بعد ہم اپنے اصل موضوع "حکمت صوم" کی طرف لوٹتے ہیں۔

حیوانات ہوں یا نباتات، ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ ان کی قوی ترین جنسیں لمبے وقفوں کے بعد خوراک کی طرف رغبت کا اظہار کرتی ہیں۔ اس کے برعکس کمزور جنسیں چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد غذا کی طرف لپکتی ہیں۔ ایک ہی جنس کے مختلف افراد میں بھی اس فرق کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے اور یہ ایک ایسا واضح امر ہے کہ اس کی طرف اشارہ ہی کافی ہے اور تفصیل کے طالبوں کو گہرے مشاہدے اور حیوانات اور نباتات کے احوال اور عادات پر لکھی گئی کتابوں سے مزید شواہد مل جائیں گے۔ اگر ایک انسانی فرد کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی دیکھنے میں آئے گا کہ جوں جوں اس کی قوت، جنینی حالت سے لے کر جوانی تک، بڑھتی جائے گی کھانوں کے درمیان وقفہ بھی بڑھتا جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کھانوں کے درمیان وقفے کا بڑھنا اور قوت میں اضافہ لازم وملزوم ہیں۔

اقوامِ عالم کی عادات واطوار کے مطالعے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ مشہور انگریز فلسفی لاک نے "تعلیم وتربیت" پر اپنی کتاب میں قدیم یونانیوں اور رومیوں کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ دن رات میں ایک ہی مرتبہ کھایا کرتے تھے اور اگر کبھی ایسی ہی حاجت ہوتی تو ایک آدھ خشک ٹکڑے سے افطار کر لیتے۔ اس ابتدائی عہد میں ان کی قوت اور شجاعت کا سب کو اعتراف ہے البتہ جب خوشحالی نے ان پر غلبہ حاصل کر لیا تو ان کا نام ونشان مٹ گیا۔

اہلِ عرب کے ہاں بھی اسی قسم کا دستور تھا بلکہ وہ اس ریاضت میں دوسروں سے کچھ آگے ہی تھے۔ جہاں تک مجبوری کی حالت میں بھوک برداشت کرنے کا تعلق ہے تو یہ محتاجِ بیان نہیں۔ رہا جان بوجھ کر اور تسکین کی مقدرت رکھتے ہوئے مشق کی خاطر بھوکا رہنا، تو اس کی تربیت وہ اپنے گھوڑوں اور اونٹوں ہی کو نہ دیتے تھے، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، بلکہ وہ اپنے آپ کو بھی اس مشقت میں برابر کا شریک کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بھوکا پیاسا رہنا ان کے لئے مشقت ہی نہ رہی تھی کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو اس کا اس حد تک خوگر بنا لیا تھا کہ اس نے ان کے لئے ایک مستقل عادت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اور یہ جو ہم نے کہا ہے کہ وہ ایسا جان بوجھ کر کرتے تھے تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ عادت ان کے ہاں قابلِ تعریف سمجھی جاتی تھی اور وہ

لوگ جن کا حال اس کے برعکس ہوتا، وہ ان کے طعن کے تیروں کا نشانہ بنتے۔

تابط شرا نے یہ باتیں کھول کھول کر بیان کی ہیں۔ دوسرے عرب شعراء کے ہاں بھی دھنسے ہوئے پیٹ کی تعریف اور بڑھی ہوئی توند کی مذمت میں بکثرت اشعار ملیں گے۔ حسین بن مطیر کہتا ہے ؎

رأت رجلا اودی بوافر لحمه طلاب المعالی واکتساب المکارم

(اس نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے پُرگوشت جسم کو اولوالعزمی اور شرف کے کارناموں نے سکھا کر رکھ دیا۔)

خفیف المشاش کان ثیابه علی قاطع من جوهر الهند صارم

(وہ ہلکا پھلکا اور چھریرے بدن کا ہے، گویا اس کے کپڑے ایک اصیل جوہر دار تلوار کو پہنا دیئے گئے ہیں۔)

فقلت لها لا تعجبین فاننی ارى سمن الفتیان احدی الشائم

(تو میں نے اس سے کہا "اس میں اچنبھے کی کیا بات ہے، میں تو یہ جانتا ہوں کہ جوانمردوں کے لئے موٹاپا بہت بڑا عیب ہے۔")

عوراء بنت سُبَیع اپنے بھائی عبداللہ بن سبیع کے مرثیے میں کہتی ہے ؎

طیان طاوی الکشح لا یُرخی لمظلمة ازاره

(وہ بھوکا رہنے والا ہے، اس کا پیٹ اس کی پیٹھ سے لگا ہوا ہے، وہ کسی مصیبت کے آنے پر بدحواس نہیں ہوتا۔)

یعصی البخیل اذا اراد المجد مخلوعا عذاره

(وہ جب سخاوت اور فیاضی کا تہیہ کر لیتا ہے تو بخیل کے مشوروں سے یوں منہ موڑ لیتا ہے گویا کہ وہ ایسا سرکش گھوڑا ہو جو اپنی لگام تڑوا بھاگے۔)

میتہ بنت ضرار اپنے بھائی کے مرثیے میں کہتی ہے ؎

لا تبعدن وکل شیء ذاهب زین المجالس والندی قبیصا

(اے کاش تو جو مجلسوں کی زینت اور پنچایت کی جان تھا، ایک مشتِ خاک بن کر ہم سے دور نہ ہو جاتا، مگر ہائے افسوس ہر شے فانی ہے۔)

یطوی اذا ما الشح ابھم قفلہ بطنا من الزاد الخبیث خمیصا

(وہ اس وقت نجس توشے سے اعراض کر کے اپنا پیٹ خالی رکھا کرتا تھا جب کہ بخیل اپنے خزانوں کی کنجیاں کھو بیٹھتے تھے۔)

اور اس کا یہ وصف کہ وہ لوگوں کو اپنے کھانے میں شریک کرتا تھا یوں بیان کیا ہے ؎

لا تعرف الکلم العوراء مجلسہ ولا یذوق طعاما وھو مستور

(اس کی مجلس فحش کلمات سے نا آشنا تھی۔ اور وہ کبھی لوگوں سے چھپ کر کھانا نہیں چکھتا تھا)

اور تابط شرا نے اپنے ماموں کے مرثیے میں اسے یوں خراج تحسین دیا ہے ؎

یابس الجنبین من غیر بوس وندی الکفین شھم مدل

(اس کا پیٹ پیٹھ سے لگا ہوا ہے لیکن مفلسی کے سبب سے نہیں بلکہ اس لئے کہ وہ دوسروں کو کھلاتا ہے اور خود نہیں چکھتا۔ وہ سخی ہے بیدار مغز اور ہوشیار ہے اور اپنے دشمنوں پر اس کی گرفت مضبوط ہے)

اور عنترہ العبسی نے کیا خوب کہا ہے ؎

ولقد ابیت علی الطوی واظلہ حتی انال بہ کریم الماکل

(میں رات بھر بھوکا پڑا رہتا تھا اور دن میں بھی پیٹ خالی رکھتا جب تک مجھے عزت کا کھانا میسر نہ آتا۔)

کیا عجب کہ جب یہ شعر حضورؐ کے سامنے پڑھا گیا ہو تو آپؐ نے فرمایا ہو "کبھی کسی بدو کا میرے سامنے ذکر نہیں ہوا، اور میرے دل میں اسے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی ہو سوائے عنترہ کے" [۱]

(م-۱)

۲۔ حکمت جہاد

ہمارے قدیم مفسرین کا خیال یہ تھا کہ آیت سیف [۲] نے موعظت و نصیحت اور کفار و مشرکین کے لئے رخصت و رعایت کی بہت سی آیتوں کو منسوخ کر دیا۔ ہمارے زمانے کے متکلمین کی ایک جماعت اس

---

[۲] آیت سیف سے مراد سورہ توبہ کی آیت ۵ ہے فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ (جب احترام کے مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں تم ان کو پاؤ اور ان کو پکڑو اور ان کو گھیرو اور ان کے لئے ہر جگہ گھات میں بیٹھو)

کے برعکس یہ سمجھتی ہے کہ آیت سیف نے ان کو منسوخ تو نہیں کیا لیکن اسلام میں جہاد صرف دفاع کیلئے ہے۔ ان کے خیال میں عہد نبوت میں جو غزوات ہوئے ان سب کی نوعیت دفاعی تھی اور بعد میں خلفاءؓ اور صحابہؓ نے جو لڑائیاں لڑیں وہ تمام ترملوکانہ جنگیں تھیں۔ ان کو جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

میرے نزدیک اصل حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ مسلمانوں پر جہاد کو لازم کرنے کی حکمت یہ ہے کہ دنیا میں عدل وقسط کو قائم کیا جائے اور ظلم اور فتنہ (یعنی دین حق کے پیروؤں پر ظلم وستم) کو مٹایا جائے۔

دنیا میں دو چیزوں سے بہت بڑا اختلاف پیدا ہوتا ہے، ایک ظلم سے اور دوسرا ظن وگمان کی پیروی سے۔ اس اختلاف کو مٹانے میں بھی دو ہی چیزیں کارآمد ہوتی ہیں ایک قسط کا قیام اور دوسری علم کی پختگی۔ قسط نام ہے درست عمل کا اور علم نام ہے درست رائے کا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے اس کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ قسط کو قائم کرنے والا ہے۔ اس نے دنیا میں اپنے خلیفہ انسان کے لئے بھی جو راستہ پسند فرمایا وہ قسط ہی کا تھا۔ چنانچہ اس نے قسط کی طرف ہدایت دینے والی کتاب نازل فرمائی اور جس طرح انسانوں کو کتاب پر ایمان لانے کا حکم دیا اسی طرح قسط کو لازم پکڑنے کا بھی حکم دیا۔ یہی وجہ ہے کہ قسط سے خالی کوئی دین خدا کو پسند نہیں۔ وہ خود حق ہے اور حق ہی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

اگر کوئی سرکش طاقت دنیا میں عدل وقسط کو ڈھانے والی اور لوگوں کو دین سے اور اللہ کی اطاعت سے روکنے والی ہو تو اس طاقت کو مٹانے اور دین اور قسط کی نصرت وحمایت کیلئے اٹھ کھڑے ہونے کو خدا نے ہم پر لازم کیا ہے۔ اسی حمایت قسط اور نصرت دین کو قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ کہا گیا۔ اسی حقیقت کی صراحت ذیل کی آیت میں کی گئی ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ (حدید ۲۵)	ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دیکر بھیجا اور ان پر کتاب اور میزان اتاری تا کہ لوگ قسط پر قائم رہیں اور ہم نے لوہا پیدا کیا جس میں زبردست سطوت ہے اور لوگوں کیلئے دوسرے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ خدا ان لوگوں کو

متعین کرے جو غیب میں رہتے ہوئے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں۔

اسی آیت کے مشابہ وہ آیت بھی ہے جس میں مظلوم کی نصرت وحمایت کرکے اور ظالم کے ظلم کا دفعیہ کر کے قسط کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا۔ فرمایا

وَاِنْ طَآئِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ۔ (حجرات ۹)

اور اگر مومنوں میں سے دو فریق لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرادو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرلے۔ پس جب وہ رجوع کرلے تو دونوں فریقوں میں عدل کے ساتھ صلح کرادو اور قسط سے کام لو۔ بیشک اللہ قسط کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس تفصیل سے علم حقیقی اور قسط کا باہمی تعلق بھی واضح ہوا اور وہ تعلق بھی معلوم ہوا جو علم وقسط اور دین وجہاد کے درمیان ہے۔ وہ ایمان معتبر نہیں جو شکوک سے پاک نہ ہو اور وہ دین حقیقی نہیں جس میں بغاوت وسرکشی پائی جائے۔ جہاد اس وقت تک جاری رہے گا جب تک فتنہ (PERSECUTION) اور سرکشی باقی رہے جب یہ دونوں چیزیں نہ پائی جائیں تو جہاد کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اسی لئے فرمایا

لَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ۔ (بقرہ ۱۹۳) ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں۔

جہل وکفر کے حالات سے ہمیں جتنی کچھ واقفیت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتنہ اور خدا سے بغاوت ایک ایسی چیز ہے جس سے دنیا کبھی پاک نہیں ہوسکتی۔ لہذا جہاد کا حکم وقتی نہیں تھا بلکہ ہمیشہ کے لئے ہے قرآن سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا

وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا۔ (بقرہ ۲۱۷)

اور یہ تمہارے ساتھ اسوقت تک جنگ کرتے رہینگے جب تک تمہیں تمہارے دین سے پھیر نہ دیں اگر یہ اس پر قادر ہوجائیں

لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (بقرہ ۱۲۰)

تم سے نہ تو یہودی کبھی خوش ہوں گے اور نہ عیسائی جب تک تم ان کے مذہب کی پیروی نہ اختیار کرلو۔

اس سے دو امر ثابت ہوئے۔ ایک تو یہ کہ جب تک کفر دنیا میں باقی ہے جہاد جاری رہے گا دوسری

یہ کہ جہاد صرف فتنہ و سرکشی کی سرکوبی کے لئے لازم ہے۔

اب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اس وعدہ کی تکمیل کے لئے بھیجا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا اور آپ کو اس ذمہ داری کا وارث بنایا تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اس آیت کے بموجب ڈالی گئی تھی۔

اِنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ○ یہ کہ میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھو۔ (بقرۃ ۱۲۵)

نیز آپؐ نبی خاتم کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کے دین کو اللہ تعالیٰ تمام ادیان پر غالب کرنے والا تھا۔ اس مقصد کے لئے پہلے آپ کو حکم ہوا کہ لوگوں کو وعظ و تلقین فرمائیں کہ لوگ آپ کی باتوں کو سنیں اور مانیں اور اپنے حالات کی اصلاح کریں۔ آپ کو قتال کی اجازت اس وقت تک نہیں دی گئی جب تک لوگوں پر اللہ کی حجت تمام نہیں ہوگئی اور تبلیغ کا فرض اچھی طرح ادا نہیں ہوگیا جب فرض تبلیغ اچھی طرح ادا ہوچکا تب آپ کو حکم ہوا کہ آپ خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرائیں اور عہد ابراہیمی کے بموجب دین حنیفی کو اس سرزمین میں از سرِ نو تازہ کریں اور اگر ضرورت پیش آئے تو اس کے لئے قوت کو بھی استعمال کریں۔ قوت کے استعمال کی یہ اجازت بھی آپ کو ہجرت کے بعد دی گئی۔ ہجرت کے بعد اس لئے کہ ہجرت سے پہلے جہاد سوائے اس کے جو حفاظت نفس کے لئے ہو، سرتاسر ظلم و فساد ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قتال محض دفاع کے لئے نہیں واجب ہوا بلکہ کعبہ کو فتح کرنے اور بنی اسمٰعیل کے اندر دین حنیفی کو از سرِ نو قائم کرنے کے لئے ہوا۔

باقی رہے غیر بنی اسمٰعیل تو ان کے ساتھ جہاد کا حکم اس لئے دیا گیا کہ ان کو عدل و قسط پر قائم کیا جائے اور زمین کو فساد سے پاک کیا جائے۔ اہل کتاب اور غیر بنی اسمٰعیل کو دین کے معاملہ میں آزادی حاصل رہی۔ ان کے لئے ایمان نہ لانے کی صورت میں جزیہ کی راہ کھلی ہوئی تھی لیکن بنی اسمٰعیل کے لئے اتمام حجت کے بعد یہ راہ کھلی نہیں چھوڑی گئی تھی۔

لیکن جہاد کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ فتنہ اور قتل کو روکنے کے لئے بعض اوقات صلح و صفائی کا طریقہ زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ اس لئے جہاد سب سے آخری تدبیر ہے۔ اسی لئے اس کے (باقی بر صفحہ ۵۳)

مقالات

امین احسن اصلاحی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت ایک مدبر اور ماہر سیاست

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے دنیا کے لئے جو دین بھیجا وہ جس طرح ہماری انفرادی زندگی کا دین ہے اسی طرح ہماری اجتماعی زندگی کا بھی دین ہے۔ جس طرح وہ عبادت کے طریقے بتاتا ہے اسی طرح وہ سیاست کے آئین بھی سکھاتا ہے اور جتنا تعلق اس کا مسجد سے ہے اتنا ہی تعلق اس کا حکومت سے بھی ہے۔ اس دین کو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتایا اور سکھایا بھی اور ایک وسیع ملک کے اندر اس کو عملاً جاری و نافذ بھی کر دیا اس وجہ سے حضور اکرم صلعم کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکی نفوس اور ایک معلم اخلاق کے ہمارے لئے اسوہ اور نمونہ ہے اسی طرح بحیثیت ایک ماہر سیاست اور ایک مدبر کامل کے بھی اسوہ اور مثال ہے۔

اس امر واقعی سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پست حال قوم تھی۔ مشہور مؤرخ علامہ ابن خلدون نے تو ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو تاہم اس حقیقت سے تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اہل عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہ ہوئے، بلکہ ہمیشہ ان پر نزاع اور انارکی کا تسلط رہا۔ پوری قوم جنگجو اور باہم نبرد آزما قبائل کا ایک مجموعہ تھی جس کی ساری قوت و صلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لوٹ مار میں برباد ہوتی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعور قومیت اور حکم و اطاعت وغیرہ جیسی چیزیں جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص بدویانہ حالت پر

صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج نزاع پسندی کے لئے اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امر محال بن چکا تھا۔ خود قرآن نے ان کو قوماً لدّا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں۔ اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ اگر تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کر ڈالتے جب بھی ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ نہیں سکتے تھے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ سال کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بُنیان مرصُوص بن گئی۔ یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہو گئی بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسباب نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کر کے دُور ہو گئے۔ یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہو گئی بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بھی بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہو گئی، یہ صرف خود ہی منظم نہیں ہو گئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا۔ اور اس کے اندر حکم و اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں ابھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتربانی کے مقام سے جہاں بانی کے مقام پر پہنچ گئی۔ اور اس نے بلا استثنا دنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست اور جہاں بانی کا درس دیا۔

اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی۔ اس کے پیدا کرنے میں حضورؐ نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصبات سے کوئی فائدہ اٹھایا نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام لیا، نہ دنیوی مفادات کا کوئی لالچ دلایا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دُنیا میں جتنے بھی چھوٹے بڑے مدبر اور سیاست دان گزرے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انہی محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضورؐ بھی ان چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے تو یہ بات آپ کے قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی۔ لیکن آپؐ نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا۔ اور ہر فتنہ کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔ آپؐ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالم گیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلائے کلمۃ اللہ اور خوف آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ تھے اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ ایک بہترین اُمت ظہور میں آئی جس کی تعریف

یہ بیان کی گئی ہے:-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (تم دنیا کی بہترین اُمت ہو جو لوگوں کو نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لئے اُٹھائے گئے ہو)

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جن اصولوں کے داعی بن کر اُٹھے اگرچہ وہ جیسا کہ میں نے عرض کیا فرد معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے۔ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطہ میں آتا تھا لیکن آپؐ نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں فرمائی۔ نہ دشمن کے مقابل میں نہ دوست کے مقابل میں۔ آپ کو سخت سے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا۔ ایسے سخت حالات سے کہ لوہا بھی ہوتا تو ان کے مقابل میں نرم پڑ جاتا لیکن آپ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپؐ نے کسی سختی سے دب کر اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کوئی سمجھوتہ گوارا نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپؐ کے سامنے پیشکشیں بھی کی گئیں اور آپؐ کو مختلف قسم کی دینی اور دنیوی مصلحتیں بھی سمجھانے کی کوشش کی گئی لیکن ان چیزوں میں سے بھی کوئی چیز آپ کو متاثر یا مرعوب نہ کر سکی چنانچہ آپؐ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ کی زبان مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قائم تھی۔ دُنیا کے مدبروں اور سیاست دانوں میں سے کسی ایسے مدبر اور سیاست دان کا نشان آپ نہیں دے سکتے جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دُنیا کو برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہو سکا ہو کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جا سکے کہ اس نے اپنے کسی اصول کے معاملہ میں کمزوری نہیں دکھائی یا کوئی ٹھوکر نہیں کھائی لیکن حضورؐ نے ایک پورا نظام زندگی کھڑا کر دیا جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانہ کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرین سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضور صلعم کو نعوذ باللہ دیوانہ کہتے تھے لیکن حضورؐ نے اس نظام زندگی کو عملاً دنیا میں برپا کر کے ثابت کر دیا کہ جو لوگ آپؐ کو دیوانہ سمجھتے تھے ...... وہ خود دیوانے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ حضورؐ نے کسی ذاتی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کے لئے بھی اپنے اصولوں کی قربانی نہیں دی۔ اصولوں کے لئے جان اور مال اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی۔ ہر طرح کے خطرات برداشت کئے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کئے گئے لیکن اصولوں کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف کسی خاص مدت تک کے لئے

تھی تو اسکا معاملہ اور تھا، وہ اپنی مدت پوری کر چکنے کے بعد ختم ہو گئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی۔ لیکن باقی رہنے والی چیزیں ہر حال میں اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ آپ کو اپنی پوری زند میں یہ کہنے کی نوبت کبھی نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی لیکن اب حکمت عملی کا تقاضا یہ کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ پر فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کر لی جائے۔

حضورؐ کی سیاست اس اعتبار سے بھی دنیا کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپؐ نے سیاست کو عبا کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مبا بلکہ بعض صورتوں میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں جو شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دی جاتی ہیں۔ ا کوئی شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے جھوٹ بولے، چالبازیاں کرے، عہد شکنیاں کرے، لوگوں کو فریب دے یا ان کے حقوق غصب کرے تو اگرچہ اس زمانہ میں اقدار اور پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں تاہم اخلا بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھہراتا ہے، اور قانون بھی ان باتوں کو جرم قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر ایک سیاستدان ا ایک مدبر یہی سارے کام اپنی سیاسی زندگی میں اپنی قوم یا اپنے ملک کے لئے کرے تو یہی سارے کام ا کے فضائل و کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس تعریفیں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد بھی اپنے انہی کمالات کی بنا پر وہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست لئے یہی اوصاف و کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے اور اسکا نتیجہ یہ تھا کہ جو لوگ ا باتوں میں شاطر ہوتے تھے وہی لوگ ابھر کر قیادت کے مقام پر آتے تھے۔

لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمانداری اور سچا جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے ا میں سے بھی ہے بلکہ آپؐ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابلہ میں ایک صاحب اقتدار اور ایک کے جھوٹ کو جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہیں زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ آپؐ کی پوری سیاسی زندگی ہما سامنے ہے، اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپؐ کو پیش آئے جن کے پیش آنے کی ایک سیـ زندگی میں توقع کی جا سکتی ہے۔ آپؐ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا اور کم و بیش اتنا ہی عرصہ آپؐ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپؐ کو حریفوں اور حلیفوں دونوں سے قسم کے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑے، دشمنوں سے متعدد جنگیں کرنی پڑیں، عہد شکنی کرنیو

کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے، قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے - آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفتگوئیں کرنی پڑیں - اور سیاسی گفتگوؤں کے لئے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے - یہ سارے کام آپؐ نے انجام دیئے - لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپؐ نے کبھی کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا - اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی - کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا - کسی معاہدہ کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی - حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا...... اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالات میں بھی انصاف کیا - اگر آپ دنیا کے مدبرین اور اہل سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں تو میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے - پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی سی دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضورؐ کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا - اب آپ اس چیز کو چاہے تدبر سے تعبیر کیجئے یا حکمت نبوت سے -

حضورؐ کی سیاست اور حضورؐ کے تدبر کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ آپؐ نے عرب جیسے ملک کے ایک ایک گوشہ میں امن و عدل کی حکومت قائم کر دی - کفار و مشرکین کا زور آپؐ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقع پر فی الواقع انہوں نے گھٹنے ٹیک دیئے - یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپ نے خاتمہ کر دیا - رومیوں کی سرکوبی کے لئے بھی آپؐ نے انتظامات فرمائے - یہ سارے کام آپؐ نے کر ڈالے لیکن اس سارے جہاد کے اندر انسانی خون بہت کم بہا - نبی کریم صلعم سے پہلے کی تاریخ بھی شہادت دیتی ہے اور آج کے واقعات بھی شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہو جاتی ہیں اور مال و اسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں کیا جا سکتا - لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہو گی جو اس ساری جدوجہد کے دوران میں حضورؐ کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے قتل ہوئے - اور یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ آپ کے دست مبارک سے باوجود اتنے انقلاب اور جنگوں کے پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے - کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہو جاتی ہیں - اس تہذیب و تمدن کے زمانہ میں بھی ہم نے دیکھا ہے کہ

فاتح ملک کی فوجوں نے مفتوح ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام کی نسلوں سے بھر دی ہیں۔ اور ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ارباب سیاست اس صورت حال پر شرمندگی اور ندامت کا اظہار کرنے کی بجائے اس کو ہر انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رونما ہوا اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی کے ناموس پر دست درازی کی گئی ہو۔

اہل سیاست کے لئے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور ایک نظم قاہر کے تحت منظم کرنے کے لئے اٹھتے ہیں وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بیگانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی ہیبت قائم کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں میں سے ہیں اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے تو سیاست کے جو تقاضے ہیں وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اسی طرح کے مقاصد کے پیش نظر جب وہ نکلتے ہیں تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں، جہاں وہ ظاہر ہوتے ہیں ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں، جہاں وہ اُترتے ہیں ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں۔ جلسوں میں ان کے حضور میں ایڈریس پیش کئے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کر جاتے ہیں تو ان کے لئے قصر و ایوان آراستہ کئے جاتے ہیں، ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں، ان کے لئے بری و بحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کئے جاتے ہیں۔ جب کبھی وہ کسی سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ سڑک دوسروں کے لئے بند کر دی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں ان چیزوں کے بغیر کسی صاحب سیاست کا تصور نہ دوسرے لوگ ہی کرتے ہیں اور نہ کوئی ..... صاحب سیاست ان لوازم سے الگ خود اپنا کوئی تصور کرتا ہے لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی دنیا کے تمام اہل سیاست سے الگ رہے۔ جب آپ اپنے صحابہؓ میں چلتے تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں۔ مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ محمد رسول اللہ کون ہیں۔ کھانا کھانے کے لئے بیٹھتے تو دو زانو ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے اسی طرح میں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اس تصور کی بنا پر جو حضورؐ کے بارے میں اس کے ذہن میں رہا ہوگا، سامنے آیا تو حضورؐ کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپ نے اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں میری ماں بھی

سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہوگا اسی طرح کا سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا میں بھی ہوں۔ نہ آپ کے لئے کوئی خاص سواری تھی، نہ کوئی خاص قصر و ایوان تھا، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپ جو لباس دن میں پہنتے اسی میں شب میں استراحت فرماتے اور تمام اہم سیاسی امور کے فیصلے فرماتے۔

یہ خیال نہ فرمائیے کہ اس زمانہ کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور اس ٹھاٹ باٹ سے آشنا نہیں ہوئی تھی، جس طمطراق اور جس ٹھاٹ باٹ کی وہ اب عادی ہوگئی ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے، سیاست اور اہل سیاست کی تاناشاہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔ فرق اگر ہوا ہے تو محض بعض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا۔ جس میں دنیوی کر و فر کے بجائے خلافت الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹ باٹ کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا۔ لیکن اس سادگی اور فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوہ کا یہ عالم تھا کہ روم و شام کے بادشاہوں پر اس کے تصوّر سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور آپ کے تدبر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کرکے تیار کردی جو آپ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصلی مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اس کے تمام مقتضیات کو بروئے کار لانے کے لئے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ اس تاریخی حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا کہ حضورؐ کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھ دیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کرۂ ارض کے تین براعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جما لیں اور اسکی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لئے موزوں اشخاص و رجال کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ میں نے جن تین براعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل آباد نہیں تھے بلکہ وقت کی نہایت ترقی یافتہ جبار و قہار شاہنشاہتیں تھیں لیکن اسلامی انقلاب کی موجوں نے جزیرۂ عرب سے اٹھ کر ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اکھاڑ کر پھینکا گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی۔ اور ان کے ظلم و جور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلادیں جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبرین اور اہل سیاست کی پوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجئے کہ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر آتا ہے جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنائے ہیں کامیابی حاصل کی ہو جو اس کے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے ہوں جن معنوں میں رسول اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقہ کے عالم و عامل ہزاروں صحابہؓ تھے۔

آخر میں ایک بات بطور تنبیہہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مرتبہ اور مقام یہ ہے کہ آپ نبی خاتم اور پیغمبر عالم ہیں۔ سیاست اور تدبر اس مرتبہ بلند کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔ جس طرح ایک حکمران کی زندگی پر ایک تحصیلدار کی زندگی کے زاویہ سے غور کرنا ایک بالکل ناموزوں بات ہے اس سے زیادہ ناموزوں بات شاید یہ ہے کہ ہم سید کونین (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی پر ایک ماہر سیاست یا ایک مدبر کی زندگی کی حیثیت سے غور کریں۔ نبوت اور رسالت ایک عظیم عطیہ الٰہی ہے جب یہ عطیہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو بخشتا ہے تو وہ سب کچھ اس کو بخش دیتا ہے، جو اس دنیا میں بخشا جا سکتا ہے۔ پھر حضورؐ تو صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ خاتم الانبیا تھے، صرف رسول ہی نہیں تھے بلکہ سید الرسل تھے.... صرف اہل عرب ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام عالم کے لئے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی تعلیم و ہدایت صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لئے نہیں تھی، بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی تھی اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ حضور کسی دینِ رہبانیت کے داعی بن کر نہیں آئے تھے بلکہ ایک ایسے دین کے داعی تھے جو روح اور جسم دونوں پر حاوی اور دنیا و آخرت دونوں کی حسنات کا ضامن تھا، جس میں عبادت کے ساتھ سیاست اور درویشی کے ساتھ حکمرانی کا جوڑ محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو گیا تھا بلکہ یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ جب صورت حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ حضورؐ سے بڑا سیاستدان اور مدبر کون ہو سکتا ہے لیکن یہ چیز آپؐ کا اصلی کمال نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا آپ کے فضائل و کمالات کا محض ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔

جناب خالد مسعود صاحب

(۴)

حفاظتِ قرآن

دورِ حضرت عمر فاروقؓ

قرآن کی حفاظت کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں قرآن کی وسیع پیمانہ پر اشاعت کا خاص اہتمام کیا۔ انہوں نے کئی ایسے اقدامات کئے جن کے نتیجہ میں قرآن کا علم مملکت کے گوشے گوشے میں عام ہو گیا اور ہر جگہ بکثرت حفّاظ پائے جانے لگے۔

معلمین قرآن کا تقرر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں بعض صحابہ کو تعلیم قرآن کے مقصد سے مختلف مقامات پر تعینات کیا تھا، حضرت عمرؓ نے یہ سلسلہ جاری رکھا اور اپنی ولایتوں میں عاملین کے ساتھ معلمین قرآن بھی مقرر کئے۔ آپ نے جب حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور عمار بن یاسرؓ کو کوفہ روانہ کیا تو اہل کوفہ کو لکھا کہ میں عمار کو امیر اور ابن مسعود کو معلم و وزیر بنا کر بھیج رہا ہوں، یہ دونوں آنحضرتؐ کے نجیب صحابی اور اہل بدر میں سے ہیں، تم ان کا حکم مانو اور ان کی بات سنو۔ ابن مسعودؓ کے معاملہ میں میں نے اپنے اُوپر تم کو ترجیح دی ہے۔ اس کے باوجود کہ خود مجھے ان کی ضرورت تھی، میں نے ان کو تمہارے پاس بھیج دیا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبلؓ کے ساتھ ابو موسیٰ اشعریؓ کو بھی یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہاں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد میں انہیں کوفہ و بصرہ کا حاکم مقرر کیا۔ بصرہ والوں کو انہی نے قرآن پڑھایا۔

آپ نے معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن الصامتؓ، ابی بن کعبؓ، ابو ایوبؓ اور ابو الدرداءؓ کو بلا کر کہا کہ شام کے مسلمانوں کو معلمین کی ضرورت ہے، آپ لوگ جا کر انہیں قرآن کی تعلیم دیجئے۔ ابو ایوب اور ابی بن

کعب کا جانا تو ممکن نہ ہوا، البتہ باقی تینوں صاحب اس مہم کے لئے تیار ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے ہدایت کی کہ پہلے حمص کو جائیں اور وہاں کچھ عرصہ قیام کریں۔ جب تعلیم پھیل جائے تو ایک شخص کو وہیں چھوڑ دیں، باقی دو صاحبوں میں سے ایک صاحب دمشق اور دوسرے فلسطین جائیں۔ چنانچہ یہ لوگ پہلے حمص گئے۔ جب وہاں تعلیم قرآن کا بندوبست ہو گیا تو عبادہ بن الصامتؓ نے وہیں قیام کیا اور ابوالدرداءؓ دمشق اور معاذ بن جبل فلسطین کو روانہ ہوئے۔ معاذ بن جبل نے طاعون عمواس میں وفات پائی لیکن ابوالدرداءؓ حضرت عثمانؓ کی آخیر خلافت تک زندہ اور دمشق میں مقیم رہے۔

حفظ قرآن کی تحریک حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں میں ہر جگہ قرآن مجید کا درس جاری کیا اور معلم وقاری مقرر کئے۔ آپؓ نے اپنے عمال کو لکھ کر بھیجا کہ جو لوگ قرآن سیکھیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں۔ ایک مرتبہ آپ نے اپنے فوجی افسروں کو اس مضمون کا خط بھیجا کہ حفاظ قرآن کو میرے پاس بھیج دو تاکہ میں ان کو قرآن کی تعلیم کے لئے جا بجا بھیجوں تو سعد بن ابی وقاصؓ نے جواب میں لکھا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ قرآن موجود ہیں۔

آپ نے ہر جگہ یہ تاکیدی احکام بھیجے کہ قرآن مجید کے ساتھ صحت الفاظ و اعراب کی بھی تعلیم دی جائے آپ نے یہ حکم بھی دیا کہ جو شخص لغت کا عالم نہ ہو، وہ قرآن نہ پڑھائے۔

نماز تراویح نماز تراویح کا حکم اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا اور اس پر اپنی زندگی میں عمل بھی فرمایا مگر اس کے لئے باجماعت ادائیگی کی پابندی نہیں کی۔ حضرت عمرؓ نے صحابہ کو نماز تراویح کی باجماعت ادائیگی پر متفق کیا اور پوری مملکت میں یہ حکم بھیجا کہ ہر جگہ اسی پر عمل کیا جائے۔ اس حکم سے نہ صرف حفظ قرآن کی تحریک کو تقویت پہنچی بلکہ یہی حکم قرآن کو نسلاً بعد نسلٍ اُمت کو منتقل کرنے کا باعث بنا۔

دورِ حضرت عثمانؓ

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں شام، مصر اور ایران کا وسیع علاقہ اسلامی سلطنت میں شامل ہوا حضرت عثمانؓ کے عہد میں بھی فتوحات کا یہ سلسلہ اسی رفتار سے جاری رہا۔ آپ کی جو فوجیں آرمینیا اور آذربائیجان میں متعین تھیں، ان میں ایک صحابی حذیفہ بن الیمانؓ بھی تھے۔ انہوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ تلاوت قرآن کے لئے فوجیوں میں مختلف علاقوں کی مناسبت سے مختلف لہجے رائج ہیں اور ان میں بعض اوقات اس اختلاف پر بحث و تکرار بھی ہو جاتی ہے۔ حذیفہؓ نے اس تکرار کو بڑی اہمیت دی اور امیرالمؤمنین کو اہم

ل سے آگاہ کرنے کے لئے مدینہ روانہ ہو گئے۔ حضرت عثمانؓ سے جا کر عرض کی "امیر المؤمنین! امّت یہود و نصاریٰ کے اختلاف میں پڑنے کو ہے، اس کی خبر لیجئے۔" حضرت عثمانؓ نے پوچھا "کیوں کیا ہوا؟" انہوں نے صورت واقعہ تفصیل سے بتا کر کہا کہ قرأت کا یہ معمولی اختلاف آگے چل کر کسی بڑے تفرقہ کا پیش خیمہ ثابت نہ ہو۔ حضرت عثمانؓ نے معاملہ کی سنگینی کو بھانپ لیا اور صحابہ سے اس معاملہ میں مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے خلیفہ کی ذاتی رائے دریافت کی تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ قرآن قریش کی زبان پر نازل ہوا ہے، اس لئے دوسری علاقائی زبانیں یا لہجے اس سے مناسبت نہیں رکھتے۔ لہٰذا قرأت کے معاملہ میں اُمّت کو قریش ہی کی لغت پر جمع کر دینا چاہیئے اور باقی قرأتیں ممنوع قرار دے دی جائیں۔ صحابہ نے اس تجویز کو بالاتفاق قبول کر لیا۔ حضرت عثمانؓ نے چار صحابہ کی ایک کمیٹی قائم کی جس میں حضرت زید بن ثابتؓ کے علاوہ تین قریشی، عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بن حارثؓ بن ہشام شامل تھے۔ اس کمیٹی کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ حضرت ابوبکرؓ کے تیار کردہ سرکاری نسخہ قرآن کی کئی نقلیں تیار کرے، اور کتابت کے دوران میں قریشی زبان اور لہجہ کا التزام کرے۔ اگر ارکان کمیٹی کے مابین قرأت کا کوئی اختلاف واقع ہو تو اسے کمیٹی کے قریشی ارکان کے فیصلہ کے مطابق دور کیا جائے۔ حضرت عثمانؓ کی ان ہدایات کی روشنی میں قرآن کی سات نقلیں تیار کی گئیں جو مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ کو بھیجی گئیں اور ایک نقل مدینہ میں روک لی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے عاملین کو یہ ہدایت کی کہ رائج الوقت قرأتوں کو ختم کر کے نئے مصحف کی قرأت کو رائج کیا جائے اور اسی سے مزید نقلیں تیار کروا کر قرآن کی اشاعت کی جائے۔

قرآن مجید کی اس کتابت کے دوران خلیفۂ وقت نے مصحف صدیقیؓ کی ترتیب سے سرمو انحراف نہیں ہونے دیا۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن زبیرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ کے متعلق حضرت عثمانؓ سے کہا کہ یہ آیت دوسری آیت سے منسوخ ہو چکی ہے، کیوں نہ اس کو نکال دیا جائے۔ تو انہوں نے جواب دیا یا ابن اخی لا اغیر شیئا منه من مکانه (بھتیجے، میں قرآن میں کسی آیت کو اس کے مقام سے نہیں ہٹا سکتا۔)

ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت ملتی ہے کہ انہوں نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ سورۂ انفال اور سورہ توبہ کو الگ رکھنے کے باوجود آپ نے ان دونوں کے درمیان آیت بسم اللہ نہیں لکھوائی آپ نے فرمایا کہ ہمارے علم میں یہ بات نہیں آئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک سورہ قرار دیا ہو یا ان کے

درمیان آیت بسم اللہ لکھوائی ہو۔ ہم نے جو تقسیم پائی ہے، اسی کے مطابق لکھنے کا حکم دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے لغت قریش پر اجماع کرنے کے فیصلہ کو نافذ کرنے میں بالکل کوتاہی نہیں کی۔ آپ نے لوگوں کے مرتب کردہ نسخہائے قرآن کو نہ صرف خلاف قانون قرار دیا بلکہ ان کے تلف کرنے کا حکم بھی دے دیا۔ جب کچھ اہل غرض نے آپ کے خلاف بغاوت کرنے کا ارادہ کیا تو ملک میں شورش برپا کرنے کے لئے انہوں نے دوسرے الزامات کے ساتھ قرآن کے نسخوں کی تلفی کے الزام کا بھی سہارا لیا۔ حالانکہ آپ کا یہ حکم بڑا اہم اور حفاظتِ قرآن کے نقطہ نظر سے نہایت ضروری تھا۔

حضرت عثمانؓ کے اس کارنامہ کو لوگ عموماً کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی حقیقت صرف اسی قدر نہ تھی کہ کچھ لوگوں کے لغت کے اعتراض کو رفع کرنے کے لئے آپ نے قرآن کی کچھ نقلیں قریش کے محاورے کے مطابق لکھوا دی تھیں، بلکہ آپ نے اُمت کے اندر ایک ایسے اختلاف کو بروقت ختم کر دیا جس کے نتیجہ میں کسی بھی وقت قرآن کے الفاظ، لہجہ، ترتیب یا مفہوم پر مسلمانوں میں تلواریں سونت لی جا سکتی تھیں اور اس کی اصل حیثیت مشتبہ ہو سکتی تھی۔ آپ کا یہ فیصلہ کہ قرآن لغتِ قریش کے مطابق لکھا اور پڑھا جائے گا، اس قدر مبنی بر حقیقت تھا کہ اس کو بغیر کسی ردو قدح کے ساری اُمت نے قبول کر لیا۔ صحابہ کی قدر شناسی کا یہ عالم تھا کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہا کرتے تھے "کاش عثمانؓ قرآن کی اس کتابت کا شرف مجھے بخشتے"۔ مزید براں حضرت عثمانؓ نے ہمارے لئے یہ سنت چھوڑی کہ مصحف صدیقی سے ذرا سا انحراف بھی کسی قیمت پر گوارا نہ کیا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد کا دور

حضرت عثمانؓ کی ان خدمات کے بعد ان تمام اسباب کا سدِ باب ہو گیا جن سے قرآن کے متن یا اس کی صحیح قرأت کے ضائع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔ آپ کے بعد مصحف عثمانی کی نقلیں مسلمانوں میں پھیلیں اُنہوں نے رسم الخط میں انہی مصاحف کی مطابقت کا التزام کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عربی کے موجودہ رسم الخط کے لحاظ سے قرآن کے بعض الفاظ کے شوشے یا کچھ ساکن حروف اگرچہ متروک ہو چکے ہیں تاہم قرآن کے موجودہ نسخوں میں ان کا آج تک التزام کیا جاتا ہے۔ جس قرأت پر حضرت عثمانؓ نے اُمت کو متحد کیا تھا وہی قرأت مسلمانوں میں تواتر حاصل کر سکی ہے۔ باقی تمام قرأتیں متروک ہو گئیں۔

اب جبکہ پریس کے وسائل ہر شہر میں موجود ہیں اور قرآن کا نسخہ ایک ایک مسلمان کے گھر میں پایا جاتا

ہے، اُمت نے حفظ قرآن کے فریضہ سے غفلت نہیں کی۔ دنیا کے ہر گوشے میں ہزاروں مسلمان موجود ہیں جن کے سینوں میں قرآن محفوظ ہے، لاکھوں بچے ایسے ہیں جن کی معصوم زبانوں پر قرآن جاری ہوتا ہے اور جن کے تلاوت قرآن کے غلغلوں سے مسجد و مکتب گونجتے رہتے ہیں۔ دنیا میں مسلمانوں کی کوئی عبادت گاہ ایسی نہیں جس میں قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ روزانہ پڑھا جاتا ہو۔ حضرت عمرؓ کی سنت کو اُمت نے آج تک زندہ رکھا ہے اور رمضان المبارک میں مسلمان قرآن سننے کو بڑی فضیلت سمجھتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُمت مسلمہ نے اپنی کتاب کی ہمیشہ حفاظت کی ہے اور کسی زمانہ میں بھی اس سے غفلت نہیں برتی اور یہ اُمت اپنے اس دعویٰ میں مخلص ہے کہ اس نے قرآن میں ایک شوشہ اور ایک لفظ کی تحریف گوارا نہیں کی۔ یہی مطلب ہے اس خدائی وعدہ کا، جس کا ہم نے مضمون کی ابتداء میں ذکر کیا تھا کہ

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○	بیشک ہم ہی نے ذکر نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہر موقع پر یہ وعدہ پورا کیا ہے اور جب تک دنیا قائم ہے وہ اس وعدہ کو پورا کرے گا۔

حفاظتِ قرآن پر چند اعتراضات اور انکے جوابات

جو لوگ قرآن کو غیر محفوظ ثابت کرنا چاہتے ہیں، ان کو اس کے لئے کوئی وزنی دلائل تو ملتے نہیں، البتہ چند چیزیں ایسی ہیں جن سے وہ فائدہ اٹھا کر ناواقفوں کے ذہنوں میں غلط فہمیاں ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اب ہم ان کے اعتراضات کا جائزہ لے کر حقیقت حال کو متعین کرنے کی کوشش کریں گے :۔

حضرت ابن مسعودؓ کا نسخہ قرآن | بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے پاس قرآن کا جو نسخہ تھا اس میں سورہ فاتحہ اور معوذتین درج نہیں تھیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ صحابہ جس قرآن کو جانتے تھے اس کی سورتوں میں اور موجودہ قرآن کی سورتوں میں فرق ہے۔

جہاں تک ان روایات کا تعلق ہے بعض اہل فن انہیں موضوع اور لغو قرار دیتے ہیں اور جو اس حقیقت کو مانتے بھی ہیں تو ان کے نزدیک یہ سورتیں چونکہ حضرت ابن مسعودؓ کو حفظ تھیں اسلئے انہوں نے ان کی کتابت کی ضرورت نہیں سمجھی۔ قاضی ابوبکر، امام سیوطی، امام نووی اور ابن حزم کا یہی نظریہ ہے۔

ہمارے نزدیک ان روایات کی حیثیت سے قطع نظر صحابہ کے ذاتی نسخوں سے کوئی استدلال کرنا ہی صحیح نہیں۔ فرداً فرداً صحابہ نے مکمل قرآن لکھوانے کا اہتمام نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی اپنی ضرورت کے لحاظ سے اس کے بعض حصے لکھ لئے اور بعض حصوں کو نہیں لکھا۔ لہٰذا ان نسخوں میں اختلاف کا پایا جانا ایک قدرتی امر تھا۔ حضرت ابوبکر کے نسخہ قرآن یا حضرت عثمانؓ کی نقلوں کو وہ حیثیت حاصل تھی جو اہم سرکاری دستاویزات کو حاصل ہوتی ہے، انہی کے لئے ان کے شایان شان اہتمام بھی ہوا اور انہی پہ ساری اُمت اور خود ابن مسعودؓ کا اتفاق بھی تھا۔

مذکورہ ضعیف روایات کے برعکس ہمیں حدیث کے مستند مجموعوں میں کئی ایسی روایات ملتی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سورہ فاتحہ اور معوذتین قرآن میں سے ہیں۔

مسلم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ معوذتین وہ سورتیں ہیں جن کی مثل سُورتیں پہلے کسی نبی پر نازل نہیں ہوئیں۔ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نمازوں میں قرآن کی سورتوں کی حیثیت سے معوذتین کو پڑھا کرتے تھے۔

خود حضرت ابن مسعودؓ کی قرآن کی روایت جو عاصم کے واسطہ سے اُمت کو پہنچی ہے اس میں سورۂ فاتحہ اور معوذتین موجود ہیں۔ لہٰذا ان کے نسخہ قرآن سے مذکورہ اعتراض پیدا کرنا بالکل بے بنیاد ہے۔

جمع قرآن کا زمانہ | ایک طبقہ کا خیال ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جمع تدوین قرآن کا خیال کسی کو نہیں آیا قرآن غیر مدون حالت میں ایک عرصہ تک رہا اور بالآخر حضرت عمرؓ یا علیؓ نے اس فریضہ کو انجام دیا۔ ان لوگوں کا تمام تر استدلال ابوداؤد کی دو روایات سے ہے۔

(۱) قال علی لما مات رسول اللہ صلی اللہُ علیہ وسلم الیت ان لا اخذ روائی الا لصلوٰۃ جمعۃ حتی اجمع القرآن فجمعتہ (ابوداؤد)	علیؓ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو میں نے قسم کھائی کہ جب تک میں قرآن جمع نہیں کر لیتا میں نماز جمعہ کے سوا کبھی اپنے اُوپر چادر نہیں لونگا۔ پھر میں نے قرآن کو جمع کر لیا۔
(۲) عمر سال اٰیۃ من کتاب اللہ فقیل کانت مع فلان قتل یوم الیمامۃ فقال انا للہ وامر بجمع القران	حضرت عمرؓ نے کتاب اللہ کی ایک آیت کے بارے میں پوچھا تو انہیں بتایا گیا کہ وہ جنگ یمامہ کے فلاں مقتول کے پاس تھی حضرت عمرؓ نے انا للہ پڑھا اور جمع قرآن

فکان اول من جمعہ فی المصحف (ابوداؤد)

کا حکم دیا۔ آپ پہلے شخص تھے جنہوں نے قرآن کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کیا۔

ان دونوں روایات کا اگر فنی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی اسناد منقطع ہیں اس کے برعکس ہم نے بخاری کی نہایت مضبوط روایت سے اُوپر یہ استدلال کیا ہے کہ جمع قرآن کا کام حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا گیا تھا۔ اس روایت کو ترک کر کے منقطع روایات پر اپنے استدلال کی عمارت اُٹھانا کسی طرح درست نہیں۔ مزید برآں خود ابوداؤد ہی میں ایک حدیثِ حسن موجود ہے جس میں حضرت علیؓ کا ایک قول یوں نقل کیا گیا ہے۔

عن عبد خیر قال سمعت علیا یقول اعظم الناس فی المصاحف اجرًا ابوبکر رحمۃ اللّٰہ علی ابی بکر ھو اول من جمع کتاب اللّٰہ۔ (ابوداؤد)

عبد خیر سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کو یہ فرماتے سنا کہ مصحف کے بارے میں لوگوں میں سب سے زیادہ اجر کے مستحق ابوبکر ہیں۔ خدا ابوبکر پر رحم کرے، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتاب اللہ کو جمع کیا۔

حقیقت یہی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ ہی کو یہ شرف حاصل ہوا کہ وہ قرآن مجید کو ایک مصحف میں قلمبند کروائیں اور اُمت کو اس پر جمع کر دیں۔ دوسرے تمام اکابر صحابہ نے اس کام میں دل وجان سے تعاون کیا کیونکہ یہ کام کسی کا ذاتی کام نہ تھا بلکہ اُمت ہی کی ایک ذمہ داری تھی جس سے کوئی شخص اپنا دامن بچا نہ سکتا تھا۔

آیتِ رجم کی بحث ابن اشتہ کی ایک روایت میں آتا ہے کہ مصحف صدیقی کی کتابت کے وقت حضرت عمرؓ آیتِ رجم لے کر زید بن ثابتؓ کے پاس آئے۔ زید نے دوسرا گواہ طلب کیا تو کوئی نہ تھا۔ لہٰذا یہ آیت لکھنے سے رہ گئی۔

انہی زید بن ثابت کا ایک واقعہ کثیر بن الصلت کے واسطہ سے یوں روایت ہوا ہے کہ جب زید بن ثابتؓ اور سعید بن العاصؓ مصحف کی کتابت کر رہے تھے تو زید نے سعید کو بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ آیت سُنی ہے کہ الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ (جب ایک بوڑھا اور بڑھیا زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو رجم کر دو۔)

ان دونوں روایتوں میں حیرت کی بات یہ ہے کہ وہی زید بن ثابتؓ حضرت عمرؓ سے تو یہ آیت قبول

نہیں کرتے لیکن سعید بن العاص سے خود اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

آیت رجم کی احادیث صورت واقعہ کے پہلو ہی سے مضطرب نہیں بلکہ آیت رجم کے الفاظ کے تعیین میں بھی بے حد مضطرب ہیں۔ مثلاً تین احادیث میں اس کے الفاظ الگ الگ بیان کئے گئے ہیں۔ یعنی

۱۔ الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموھما البتة

۲۔ اذا زنا الشیخ والشیخة فارجموھما البتة بما قضیا من اللذة

۳۔ اذا زنا الشیخ والشیخة فارجموھما نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم

جس قرآن کی تعلیم وحفظ کا باقاعدہ نظام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں محکم بنیادوں پر قائم کر دیا تھا، اس کی کسی آیت کی یہ حیثیت نہیں ہو سکتی کہ اس سے عام مسلمان ناواقف رہ گئے ہوں اور جو چند افراد اس سے واقف بھی ہوئے ہوں ان کی یادداشت کا یہ عالم ہو کہ وہ اس کے لفظوں پر متفق نہ ہو سکیں۔ روایات کا یہ اضطراب ہی حقیقت حال کو کھول دینے کے لئے کافی ہے۔

مزید برآں اس آیت کی زبان کسی اعتبار سے بھی قرآن کی زبان سے میل نہیں کھاتی۔ پھر اس میں واضح قانونی سقم موجود ہے۔ اس کے الفاظ سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ رجم کی سزا صرف بڈھے زانیوں کے لئے ہے جبکہ سنت ثابتہ یہ ہے کہ عادی مجرم اور شادی شدہ مرد وعورت، خواہ وہ بڈھے ہوں یا جوان اگر زنا کے مرتکب ہوں گے تو ان کو رجم کیا جائے گا۔ اس نام نہاد آیت کے الفاظ سے یہ مفہوم ہرگز نہیں نکلتا۔

ہمارے نزدیک ان الفاظ کو قرآن سے منسوب کرنا تو کسی طرح ثابت نہیں ہوتا البتہ حضرت عمرؓ کا وہ خطبہ ضرور قابل غور ہے جو مسلم نے بدیں الفاظ نقل کیا ہے۔

عن عبد اللہ بن عتبہ انہ سمع عبد اللہ بن عباس یقول قال عمر بن الخطاب وھو جالس علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ قد بعث محمدا صلی اللہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب فکان مما انزل

عبد اللہ بن عتبہؓ سے روایت ہے کہ میں نے عبد اللہ بن عباسؓ کو یہ فرماتے سنا کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ کے منبر پر بیٹھے ہوئے یہ کہا کہ خدا نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کیساتھ مبعوث کیا اور آپ پر کتاب اتاری۔ جو کچھ آپ پر اتارا گیا اس میں آیت رجم بھی تھی جسے ہم نے پڑھا، یاد کیا اور سمجھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

علیہ آیۃ الرجم قرأناھا ووعیناھا و عقلناھا فرجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا بترک فریضۃ انزلھا اللہ وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ او کان الحبل او الاعتراف

(مسلم ۔ باب رجم الثیب فی الزنی)

بھی رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ مدت گزرنے کے بعد کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ قرآن میں رجم کا حکم نہیں ہے تو لوگ گمراہ ہو کر وہ وہ فریضہ ترک کر بیٹھیں جو خدا نے مانڈ کیا۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم واجب ہے ہر اس زانی پر جو شادی شدہ ہو، خواہ مرد ہو یا عورت، اس وقت جب دلائل ثابت ہو جائیں یا حمل یا اعتراف کی شکل پیدا ہو جائے۔

اس خطبہ سے حضرت عمرؓ نے جو بات ثابت کرنی چاہی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں زنا کے لئے صرف کوڑوں کی سزا بیان ہوئی ہے ۔ اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ محصن زانی کے لئے رجم کا حکم قرآن کا حکم نہیں ہے ۔ یہ حکم بھی منشاء الہٰی کے مطابق ہے ۔ حضورؐ نے اس کو قرآن کی آیات سے اخذ کیا ، اپنی زندگی میں اسی کو نافذ کیا اور اُمت کو اسی کی تعلیم دی ۔ ہم نے اس حکم کو سمجھا اور یاد رکھا اور حضورؐ کے اتباع میں ہم نے بھی محصن زانیوں کو رجم کیا ۔ اس خطبہ پر اگر غور کیا جائے تو اس میں انکار سنت کے فتنہ سے خبردار کر کے سنت رسول اللہ کے بارے میں صحیح نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے ۔ حضورؐ نے قرآن مجید کے بے شمار احکام کی تفصیل کی اور ان کی حدود و شرائط متعین کیں لیکن یہ تمام پابندیاں قرآن کے اندر موجود نہیں ہیں ۔ یہ اللہ تعالیٰ کے منشاء اور ہدایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو بتائیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کے خطبہ سے جو لوگ آیت رجم کا وجود ثابت کرتے ہیں وہ دراصل اس کے ظاہری الفاظ ہی میں کھو جاتے ہیں ، اس کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش نہیں کرتے ۔

مذکورہ روایت کے علاوہ بھی کچھ روایات ایسی ہیں جن سے قرآن مجید میں کمی بیشی ہونے کا استدلال کیا جاتا ہے ۔ ان میں سے بیشتر روافض کی وضع کردہ ہیں اور فنی لحاظ سے اخبار احاد کی صف میں آتی ہیں ۔ اس لئے قرآن کی اس روایت کے مقابل میں جس کے تواتر پر پوری اُمت گواہ ہے چند اخبار احاد کی کوئی اہمیت نہیں ۔

اقتباسات وتراجم

تسخیر الحسن حمدوی

ربع خالی کے بدوؤں کا اخلاق

ایک انگریز سیاح کے مشاہدات

عرب کا وسیع صحرا "ربع خالی" ڈھائی لاکھ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں بعض مقامات پر کچھ ادویا بھی ہیں جن کی وجہ سے صحرا کے بعض خطے گل وگلزار نظر آتے ہیں۔ اس صحرا میں رہنے والے بدوؤں کی تعداد بہت کم ہے، اس کے باوجود اڑھائی سو بدو ہمہ وقت سیاحوں کی رہنمائی کے لئے تیار رہتے ہیں۔

اس صحرا کا سیاح اس بات کا کوشاں ہوتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ ان مصائب وتکالیف کے برداشت کرنے پر قادر ہو جن کے خوگر اس کے رفیق سفر صحرائی بدو ہوتے ہیں۔ یہاں بہت سے علاقے ایسے ہیں جہاں ۲۵، ۳۰ سال سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا۔ ان علاقوں کے باشندے ہمیشہ چارہ اور پانی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں، اور جہاں کہیں ان کو پانی دستیاب ہو جاتا ہے اپنے ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ چارہ اور پانی کا یہ ذخیرہ جب ختم ہو جاتا ہے تو کسی نئی جگہ کی تلاش میں کوچ کر دیتے ہیں۔

ان خطوں کے باشندے صرف اُونٹ اور شامیانے کے مالک ہوتے ہیں۔ چونکہ ان کی زندگیاں لمبے لمبے تھکا دینے والے سفروں پر مشتمل ہوتی ہیں، اس لئے یہ دونوں چیزیں ان کے لئے بہت ہی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی غذا اونٹ کا دودھ ہوتی ہے اور ان کے محل ان کے شامیانے ہوتے ہیں۔

لیکن پھر بھی یہ بدو قابل تعریف ہیں کہ اس سخت اور تکلیف دہ زندگی، اور دنیا سے منقطع ہونے کے باوجود ایک نظام، ایک قانون، ایک مذہب کے تحت زندگی گزارتے ہیں، جس کو وہ مذہب اسلام نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ اس کے قوانین واحکام پر پابندی سے عمل کرتے ہیں۔ ان کا ایک سلوک یہ بھی ہے اپنے اپنے قبیلوں کیلئے ایک سردار منتخب کرتے ہیں اور پھر اس کی ہر بات کے آگے اپنا سر جھکا دیتے ہیں۔ وہ اس کے ا

پر عمل کرتے ہی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں، خواہ اس کے فیصلے کی رو سے ان کو سخت سے سخت سزا ہی کیوں نہ مل رہی ہو۔ طبیعتوں کے اعتبار سے وہ بہت ہی سادہ دل اور معصوم ہوتے ہیں ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو انگریز کے نام سے ہی واقف نہیں، اکثر نے انگریز کی صورت نہیں دیکھی، اسی طرح اکثر بدو ایسے ملیں گے جنھوں نے کسی محل کو نہیں دیکھا، اور نہ ہی یہ محل کا نقشہ اپنے ذہنوں میں لا سکتے ہیں۔

جب آپ اس صحرائے اعظم میں قدم رکھیں گے تو اپنے آپ کو بالکل تنہا پائیں گے لیکن یہ تنہائی اپنے دامن میں آزادی و محبت کو لئے ہوئے ہوگی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان لمبے لمبے سفر کرنے والے بدوؤں میں محبت و شرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ بدو صرف تفریح طبع کے لئے خوشیاں نہیں مناتے، بلکہ ان کی خوشی کی نوعیت ہی دوسری ہوتی ہے، ان کی خوشی کا ایک وقت وہ ہوتا ہے جب وہ کہیں ٹھنڈا اور شیریں پانی پاتے ہیں اور پھر لطف و تفریح کے ساتھ مل جل کر پیتے ہیں، ان کی خوشیوں کے دوسرے مواقع وہ ہوتے ہیں جب وہ کسی عمدہ قسم کی بھیڑ کا گوشت کھاتے ہیں، یا پھر ان کو اپنی عادت سے زیادہ آرام کرنے کا موقع مل جاتا ہے، یا سخت سردیوں کی راتوں میں وہ کسی الاؤ کے چاروں طرف گرمی حاصل کرنے کے لئے تفریحی گفتگو میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ بس یہی ان کی تفریحات ہیں جن میں ریاء و نمود کا شائبہ بھی نہیں ہے۔

میں اکثر سنا کرتا تھا کہ یہ بدو آپس میں بہت لڑتے ہیں، نیز یہ کہ معمولی معمولی باتوں پر ان میں نزاع پھوٹ پڑتی ہے، لیکن میں نے ان تمام باتوں کو ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مبالغہ ہی پایا۔ ان میں لڑائی جھگڑے شاذ و نادر ہوتے ہیں جبکہ ہمارے یہاں آئے دن چھرے چلتے ہیں، یہ ضرور ہے کہ وہ بسا اوقات ایک ریال کی وجہ سے باہم گتھ جاتے ہیں، لیکن ان لڑائی جھگڑوں میں بھی وہ اپنے اُوپر سے شرافت و وقار کی عبا نہیں اتار پھینکتے، بلکہ جہاں بھی ان کو اپنے وقار کا خطرہ لاحق ہوتا نظر آیا انہوں نے لڑائی سے فوراً ہاتھ کھینچ لیا۔

لیکن اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ وہ بہت جھگڑالو ہوتے ہیں، پھر بھی اس بات سے مجال انکار نہیں کہ وہ بہت بڑے مہمان نواز بھی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی مہمان کے لئے اپنے قیمتی اُونٹ جن کی قیمتیں ۱۵۰ ریال سے کسی طرح کم نہیں ہوتیں، بغیر کسی تکلف کے ذبح کر دیتے ہیں۔ میں نے خود بہت سے بدوؤں کو اس حال میں پایا کہ وہ کئی سال سے قحط سالی کا شکار تھے، اور مصائب و تکالیف میں مبتلا تھے۔ ان پر کئی کئی وقت کے فاقے ہو رہے تھے، اور آئے دن صحرائی آندھیاں ان کی تکالیف میں اضافہ کر رہی تھیں، لیکن جب ہمارے قافلے نے ان کے قبیلوں کے پاس اپنا ڈیرا ڈالا تو ان فاقہ مست بدوؤں نے ہماری خوب خوب خاطر و مدارات کی

ہماری مہمان نوازی میں انہوں نے کسی قسم کی کسر نہیں اٹھا رکھی ۔ انہوں نے بہت سی بھیڑ بکریاں ہمارے سامنے ذبح کر کے ہماری خاطر مدارات کی حالانکہ یہ بھیڑ بکریاں ان فاقہ کشوں کے لئے مہینوں کی غذا کی حیثیت رکھتی تھیں۔

ان بدوؤں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ تمام معاملات میں ایک دوسرے کے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ ہر شخص دوسرے کی مصیبت کو اپنی مصیبت تصور کر کے مصیبت زدہ کی امداد کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے ۔ یہ لوگ چوری سرقہ کے نام سے بالکل ناواقف ہیں ، دوسرے کی چیز کو ہاتھ لگانا ان کی فطرت کے خلاف ہے ۔ان کے پاس آپ اپنا قیمتی سے قیمتی سامان رکھ دیں ، یا بھول جائیں تو یہ اس کو ہاتھ تک نہیں لگائیں گے بلکہ اس کی حفاظت اپنے ذمے لے لیں گے۔ اسیطرح الغرض ان میں ایک دوسرے کیلئے اخلاص و محبت کے جذبات ہمیشہ موجزن رہتے ہیں، البتہ دین کا مقام ان کی نظروں میں تمام دوسری چیزوں سے اعلیٰ وارفع ہے۔

مجھے وہ دن ابھی تک یاد ہے جب ہم ۳۶ گھنٹے کے مسلسل تکلیف دہ سفر کے بعد میٹھے پانی کے کنویں پر پہنچے اور ہم سب کا پیاس کی وجہ سے بہت ہی بُرا حال تھا لیکن ہمارے یہاں پہنچنے سے تھوڑی دیر قبل ہمارے ایک رفیق قافلہ کا اونٹ گم ہو گیا تھا وہ اس کی تلاش میں چلا گیا ۔ بدوؤں کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ کھانا وغیرہ ایک ہی ساتھ کھاتے ہیں اس لئے ہمیں اس وقت تک بھوکے پیاسے بیٹھے رہنا پڑا جب تک ہمارا رفیق اُونٹ کو تلاش کر کے واپس نہیں آگیا ۔ اس کے واپس آنے میں تقریباً ۲ گھنٹے لگے ۔ بسا اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ہم کسی رفیق سفر کے انتظار میں کھانا نصف شب کے بعد کھاتے ،کئی دفعہ یہ اتفاق بھی ہوا کہ ہم شدید انتظار کے بعد اپنے کسی ساتھی کی عدم موجودگی میں کھانا کھا لیتے اور اس کے لئے کھانا رکھ دیتے لیکن جب وہ واپس آتا اور اپنا کھانا دیکھتا تو اپنے ساتھیوں پر بہت ہی خفا ہوتا اور شکوہ کرتا کہ انہوں نے شکم سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا ہے اس کی اس ناراضگی اور شکوہ پر کسی کو اس کا ساتھ مجبوراً دینا پڑتا ، کیونکہ انکار کی صورت میں نزاع کا خطرہ ہوتا تھا

بدوؤں کی ایک جماعت ایسی ہے جو صحرا کی ریت کو دیکھ کر ماضی کے وہ تمام واقعات و حوادث بتا دیتی ہے جو اس خطے پر اب تک پیش آچکے ہیں ، یہاں تک کہ وہ اس پر بھی قادر ہوتے ہیں کہ ان واقعات کے سنین کا تعین کر دیں ۔ اسی طرح اس جماعت کے افراد کی قوت شامہ بھی بہت تیز ہوتی ہے ، یہ لوگ بسا اوقات طرز قیاس و ظن کی بنا پر کسی سمت پانی کی تلاش میں نکل جاتے ہیں ۔ اور چند دنوں کے بعد اپنے تمام برتنوں کو پانی سے بھر کر واپس لوٹ آتے ہیں ۔ فی الجملہ یہ بدو عظیم لوگوں میں سے ہیں ، میں نے ان کو حریت و آزادی کا دلدادہ ، اخلاص

ثبت سے معمور اور طاقت و قوت سے بھرپور پایا ہے۔

بقیہ حکمت صوم و جہاد

صفحہ ۳۲ سے آگے

لئے کئی شرائط بھی ہیں۔

رفع فساد کی خاطر جو لوگ جہاد کے لئے اٹھیں ان کے لئے سب سے مقدم شرط یہ ہے کہ وہ خود اپنے آپ کو شائبۂ فساد سے پاک کریں۔ جب تک خلیفہ اور اس کے متبعین خود عدل پر قائم نہ ہوں اس وقت تک ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ عدل قائم کرنے کے لئے تلوار لے کر اٹھیں۔

پھر اپنے ملک کے اندر بغیر ہجرت کے جہاد جائز نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کی سرگزشت اور ہجرت سے متعلق دوسری آیات سے یہی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بھی اسی بات کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاد اگر صاحب جمعیت اور صاحب اقتدار امیر کی طرف سے نہ ہو تو وہ محض شورش، بدامنی اور فتنہ و فساد ہے۔

پھر قتال کی اجازت حصول قوت کے بعد دی گئی ہے۔ حضرت شعیبؑ کی سرگزشت میں اس کی دلیل موجود ہے۔ انہوں نے فرمایا

وَاِنْ كَانَ طَآئِفَةٌ مِّنْكُمْ اٰمَنُوْا بِالَّذِیْٓ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ یُؤْمِنُوْا فَاصْبِرُوْا حَتّٰى یَحْكُمَ اللّٰهُ بَیْنَنَا۔	اگر ایک جماعت تم میں سے اس چیز پر ایمان لائی ہے جس کو دیکر میں بھیجا گیا ہوں اور دوسری جماعت ایمان نہیں لائی ہے تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ تعالٰے ہمارے درمیان فیصلہ کر دے۔

مذکورہ بالا تینوں شرطوں کے ساتھ جہاد قیامت تک کے لئے واجب ہے۔ دین کے معاملہ میں جبر اور شورش و بدامنی جائز نہیں ہے لیکن حق کی شہادت اور تبلیغ اور مجادلہ حسنہ ہمیشہ ضروری ہے۔

بقیہ مضمون "تذکرہ و تبصرہ" ———— صفحہ ۸ سے آگے

اس کے بعد، جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، حجۃ اللہ البالغہ پڑھانے کا خیال ہے۔ ویسے مجھے توقع ہے کہ یہ طلبہ حجۃ اللہ البالغہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، کم از کم جہاں تک اس کے دوسرے حصے کا تعلق ہے۔ لیکن اگر انہوں نے کچھ زحمت محسوس کی تو اس کا پہلا حصہ سبقاً پڑھا دیا جائیگا اور دوسرے حصہ کا خود اپنی نگرانی میں مطالعہ کرا دوں گا۔

قرآن مجید میں تاویل اور نظام کے ساتھ ساتھ حج اور حکمت کے مباحث سے بھی اب ان کو آشنا کرنے کی کوشش کی جائے گی اور یہ کام ان شاء اللہ اگلے رمضان شریف تک ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد انہیں کسی چیز کے استاذ سے پڑھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ہر چیز خود پڑھ سکیں گے اور اس کو پورے اعتماد کے ساتھ سمجھ سکیں گے۔ قرآن و حدیث کی تعلیم میں ان کی فکری تربیت اس طرح کی جا رہی ہے کہ اسلام کے ہر پہلو پر تحقیقی مطالعہ کا ان کے اندر ان شاء اللہ ذوق سلیم پیدا ہو جائے گا۔ احباب دعا کریں کہ یہ کام پابندی کے ساتھ جاری رہ سکے۔

تقریظ و تنقید

ہفت روزہ ندائے ملت (صدیق حسن نمبر)

صفحات : ۵۶ قیمت : ۵۰ پیسے

مقام اشاعت: دفتر ندائے ملت باغ گونگے نواب لکھنؤ

ہفت روزہ ندائے ملت کے ابتدائی چند شماروں کو دیکھ کر ہی اس کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی تھی۔ اب ایک قلیل عرصے میں اس نے مسلمانانِ ہند کی امنگوں کی ترجمانی میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ جس خلوص، بے باکی، متانت، سنجیدگی، حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اس نے ایک طرف حکومت کو مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے اور ان کے حقوق ادا کرنے پر آمادہ کیا اور دوسری طرف خود مسلمانوں کو ان کے ملی وجود کے تحفظ پر ابھارا ہے وہ اسی کا حصہ تھا۔ حق تو یہ ہے، ہندوستان کے عام مسلمانوں کے لئے نہ تو نیشنلسٹ پریس کی حکومت کی جا و بیجا حمایت کوئی کشش رکھتی تھی اور نہ ہی جماعت اسلامی ہند کے خصوصی ترجمانوں کی گومگو کی پالیسی ان کے باعث تسکین تھی ہند کا مسلمان میدانِ صحافت میں جو عظیم خلا محسوس کرتا تھا، ندائے ملت نے بڑی حد تک اس کو پر کر دیا ہے۔

ندائے ملت کا زیر نظر شمارہ یوپی کے ریونیو بورڈ کے ایک سینیئر ممبر سید صدیق حسن مرحوم آئی سی ایس کی یاد میں نکالا گیا ہے۔ ہند و پاک صحافت میں اس سے پہلے شاید ہی کبھی کسی سرکاری ملازم کو یہ اعزاز حاصل ہوا ہو۔ اس میں کچھ دخل تو مرحوم کی غیر معمولی ہردلعزیزی، دلپسند اخلاق اور عوام دوستی کو ہے اور بہت کچھ ہندستانی مسلمانوں کے احساس تنہائی اور بے چارگی کو ہے ان کے لئے کسی چھوٹے سے سہارے کا ٹوٹ جانا بھی قیامتِ صغریٰ سے کم نہیں ہوتا۔ اس اشاعت کی ترتیب میں بیس پچیس اصحاب نے حصہ لیا ہے جن میں اگرچہ مولانا عبدالماجد دریا بادی اور ڈاکٹر یوسف حسن خان جیسے معروف اصحابِ قلم بھی شامل ہیں، مگر اکثریت ان غیر معروف حضرات کی ہے جن کا کسی نہ کسی حیثیت سے مرحوم کے ساتھ تعلق رہا تھا۔

ان مضامین میں بیشتر وہ تاثرات ملتے ہیں جو مرحوم کے دوستوں، قریبی عزیزوں، عام چاہنے والوں اور ان سے ممنون ہونے والوں نے سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں۔ چونکہ مرتبین نے ان میں کوئی

تصرف نہیں کیا اس لئے تکرار، طول بیانی اور خام کاری کے عیوب باقی رہ گئے ہیں تاہم لکھنے والوں کا خلوص متأثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس اشاعت میں مرحوم بحیثیت ایک انسان اور مسلمان کے زیرِ بحث آئے ہیں۔ وہ ایک آئی سی ایس افسر تھے اپنے والدین کے اطاعت گذار، رشتے داروں کے حقوق کے پاسبان، ہر چھوٹے بڑے کے غمگسار اور روایتی افسرانہ فرعون مزاجی سے کوسوں دُور تھے۔ ان کی اصول پرستی کا یہ حال تھا کہ انگریز گورنر کو اپنی میز پر شراب پلانے سے انکار کر دیا، انگریز افسروں کے مشوروں کے علی الرغم اپنے ہندوستانی بھائیوں سے ملنا جلنا ترک نہ کیا، ہر چھوٹے بڑے کی مقدور بھر اعانت کی اور اسلام کے ساتھ وابستگی کا یہ حال تھا کہ درسِ قرآن کا اہتمام کروایا اور اپنے ملنے جُلنے والوں میں اس کی تڑپ پیدا کی۔ سرکاری اہل کاروں کے لئے مرحوم ایک قابلِ تقلید انسان تھے۔

مرحوم کا ایک مضمون "ذہنی ارتداد" بھی شاملِ اشاعت ہے جس سے ان کی اصابتِ رائے اور اسلام کے لئے بے چینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مرحوم کے متعلق یہ تو ذکر آتا ہے کہ وہ شعر بھی کہتے تھے مگر ان کے منتخب اشعار تک بھی شاملِ اشاعت نہیں۔

ہم اپنے قارئین سے اس نمبر کے پڑھنے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

(م - ا)

محمد الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔

Regd. No L. 7360

Monthly "MEESAAQ" *Lahore.*

JANUARY 1964

فروری
۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت
امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ

جلد (۱۰) شوال ۱۳۸۳ھ شمارہ (۲)

ماہنامہ میثاق لاہور

فہرست مضامین

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ
منیجر ماہنامہ "میثاق"
رحمان پورہ — اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ
منیجر ہفت روزہ "ندائے ملت"
باغ گونگے نواب — لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

بھارت کی حکومت اپنی مسلم اقلیت کے جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت میں جس بُری طرح ناکام رہی ہے اگرچہ یہ بجائے خود تاریخ کی ایک نہایت المناک حقیقت ہے لیکن اس ناکامی سے بھی زیادہ المناک حقیقت یہ ہے کہ بھارت کے لیڈروں کو اپنی اس ناکامی کا کوئی احساس نہیں ہے - وہاں مسلمانوں کے ساتھ تقسیم ملک کے بعد سے برابر سولہ سترہ سالوں میں جو کچھ ہوا ہے اور آج جو کچھ ہو رہا ہے، وہ سب بڑی آسانی کے ساتھ پاکستان کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے اور وہاں کا بڑا سے بڑا لیڈر بھی یہ کہتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے پاکستان میں ہونے والے فلاں اور فلاں واقعات کا "ردعمل" ہے۔

اگرچہ ردعمل کا یہ فلسفہ ہمارے نزدیک بالکل شیطانی فلسفہ ہے اور ہم یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، راج گوپال آچاریہ، جے پرکاش نرائن اور بھارت کے موجودہ فلسفی صدر جیسے لوگوں کے جیتے جی یہ شیطانی فلسفہ گاندھی جی کے فلسفہ پر عین ان کے ملک میں انہی کے نام لیواؤں کے ہاتھوں، اس طرح غالب آجائے گا لیکن اپنی اس رائے کے باوجود ہم سچائی کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ بھارت میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اگر یہ فی الواقع پاکستان میں ہونے والے واقعات ہی کا ردعمل ہوتا تو کم از کم ہمیں بھارت کے لیڈروں اور اس کی حکومت سے کوئی شکایت نہ ہوتی ہم اگرچہ ردعمل اس فلسفہ کو جیسا کہ عرض کر چکے ہیں شیطانی سمجھتے ہیں لیکن بہر حال ہم انسانوں کو انسان ہی سمجھتے ہیں فرشتوں کی جماعت نہیں سمجھتے، اس وجہ سے ہم ان سے اس ظلم کو کچھ بعید نہیں خیال کرتے کہ وہ

ستان کے مسلمانوں کے قصور کا انتقام بھارت کے مسلمانوں سے لیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ صورت حال یہ نہیں ہے اور بھارت کے لیڈر اچھی طرح جانتے ہیں کہ انھوں نے اپنے بہت بڑے ظلم کے لئے یہ ایک نہایت ہی کمزور بہانہ تلاش کیا ہے۔ ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ تقسیم کے بعد سے اکا دکا واقعہ پاکستان میں بھی فساد کی نوعیت کا پیش آیا ہے لیکن ان اکا دکا واقعات کو کیا نسبت ہے مظالم اور تباہیوں کے اس غیر منقطع اور لامتناہی سلسلہ سے جس میں بھارت کی مسلم اقلیت کو مبتلا کر دیا گیا ہے؟ یہاں کوئی ایک واقعہ بھی اس نوعیت کا کبھی پیش نہیں آیا جس نوعیت کے واقعات وہاں علیگڑھ، جبلپور، سنبھل آسام، بہار اور کلکتہ وغیرہ میں ابھی حال ہی میں پیش آچکے ہیں۔ اور تازہ اطلاع اسی قسم کے یکطرفہ ظلم کی بلند شہر کے متعلق آئی ہے۔ صرف تعداد ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ واقعات کی سنگینی کے لحاظ سے بھی دیکھئے تو کون کہہ سکتا ہے کہ ابھی حال ہی میں کلکتہ اور اس کے اطراف میں درندگی، سفاکی، بہیمیت اور حرث ونسل کی جو بربادی اکثریت کے ہاتھوں ظہور میں آئی ہے وہ پاکستان کے کسی واقعہ کا ردعمل ہے۔ آخر اس نوعیت کا واقعہ پاکستان کے کس خطہ میں پیش آیا؟

ہر شخص جانتا ہے کہ ہم پاکستان کی حکومت کے مداحوں میں نہیں بلکہ اس کے نقادوں میں ہیں لیکن اس معاملہ میں ہم حکومت پاکستان کی زیادہ سے زیادہ تعریف کریں گے کہ وہ اقلیتوں کے تحفظ کے معاملہ میں نہایت نیک نیت اور مستعد ہے۔ اول تو یہاں ایسے واقعات پیش آئے ہی بہت کم ، اور اگر کبھی کوئی واقعہ پیش آیا بھی تو حکومت نے فوراً حالات کو قابو میں کر لیا۔ یہاں کے لیڈروں نے کبھی اس عذر کو اپنے لئے سپر نہیں بنایا کہ یہ بھارت کے واقعات کا ردعمل ہے۔ یہاں کی عام فضا اقلیتوں کے حق میں بھارت کی فضا سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں کے عوام میں اقلیتوں کے خلاف کوئی ادنیٰ تعصب بھی نہیں پایا جاتا۔ یہاں کی سیاسی پارٹیوں میں بھی کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے جو ہندوؤں یا کسی غیر مسلم اقلیت کے خلاف کوئی معاندانہ جذبہ رکھتی ہو۔ ان معاملات میں سب سے زیادہ تنگ نظری کا الزام مذہبی جماعتوں پر لگایا جا سکتا ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ پاکستان میں کسی جن سنگھ کا وجود نہیں ہے۔ اقلیتوں کے معاملے میں اسلام کی تعلیم بھی بہت واضح ہے اور مسلمان اپنی عام دینی غفلت کے باوجود اس بات کو بھولے نہیں ہیں کہ ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بڑی تاکید کے ساتھ

اپنی زندگی کے آخری لمحات مبارک میں یہ نصیحت فرمائی ہے کہ اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ کی طرف سے ہے۔ اس وجہ سے کسی مسلمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ کی اس ذمہ داری میں کوئی خلل پیدا کرے، نیز مسلمانوں کو یہ بات بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر اقلیتوں کے ساتھ انہوں نے کوئی بدعہدی اور زیادتی کی تو قیامت کے دن خدا کی عدالت میں خود محمد رسول اللہ صلعم ان اقلیتوں کے وکیل ہوں گے۔ اسلام کی ان تعلیمات کا اور تاریخ کی روشن روایات کا یہ اثر ہے کہ پاکستان کی مذہبی جماعتوں میں سے بھی کوئی جماعت غیر مسلموں کے خلاف کوئی تعصب نہیں رکھتی۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ پاکستان کا وہ کون سا عمل ہے جس کا ردعمل بھارت میں آئے دن مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی عزت و آبرو کی بربادی کی شکل میں ہو رہا ہے۔

ہم یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں کہ پاکستان کے اندر شاید ایک مسلمان بھی ایسا نہ ملے جو عمل اور ردعمل کے اس شیطانی فلسفہ پر اعتقاد رکھتا ہو جس پر بھارت کے لیڈروں کا ایمان ہے۔ یہ فلسفہ اسلامی شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ ہمارے ملک میں جو غیر مسلم اقلیتیں ہیں وہ صرف اپنے قول و فعل کی ذمہ دار ہیں، دوسروں کے قول و فعل کی کوئی ذمہ داری ہم ان پر نہیں ڈالتے۔ وہ اگر ملک کے قانون کی پابند اور ریاست کی وفادار ہیں تو حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ ان کے جان و مال اور ان کے شہری حقوق کی ہر قیمت پر حفاظت کرے۔ اس بات سے ان کی عرفی حیثیت میں کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ کلکتہ میں ان کے ہم مذہبوں نے ہمارے اسلامی بھائیوں کا قتل عام کیا۔

اگرچہ ہم یہ توقع نہیں رکھتے کہ بھارت کے لیڈروں کی سمجھ میں ہماری کوئی بات آسکے گی تاہم حقیقت کا اظہار ایک فرض انسانی ہے اس وجہ سے ہم عرض کرتے ہیں کہ قومی جرائم پر " ردعمل " کا پردہ ڈال کر ان کو ہلکا دکھانا اپنے ضمیر کو موت کی نیند سلانا اور اپنی قوم کو ایسا زہر پلانا ہے جس سے پوری قوم پاگل ہو جائے۔ حکمرانی ایک عظیم ذمہ داری ہے جس کی بنیاد عدل پر ہے۔ ہر حکومت کا یہ ابتدائی فرض ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ہر طبقہ کے لئے امن، عدل اور قانونی انصاف کی ضمانت فراہم کرے۔ اسی سے حکومت کے قیام کے لئے جواز پیدا ہوا ہے اور اسی کو فراہم کرنے کی خاطر خدا نے، جو آسمان و زمین کا حقیقی حکمران ہے، اپنے نظام میں حکومت کے لئے ایک مقام تسلیم کیا ہے۔ اگر کوئی حکومت اپنی رعایا کے لئے امن و عدل فراہم نہیں کرتی تو وہ اپنے وجود کی ضرورت کی خود نفی کر دیتی ہے اور اس کے بعد قدرت اس حکومت کے وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دیتی

ہے۔ اس معاملے میں قدرت بالکل بے لاگ واقع ہوئی ہے۔ اس کی میزان نے اپنے فیصلہ میں کبھی امتیاز نہیں برتا ہے اور آئندہ بھی وہ کبھی امتیاز نہیں برتے گی، خواہ معاملہ بھارت کا ہو یا پاکستان کا۔

عدل کے متعلق یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ کوئی اضافی صفت نہیں ہے کہ ہندو کے لئے آپ عادل ہوں اور مسلمانوں کے لئے غیر عادل۔ جو شخص ایک کے لئے غیر عادل اور ظالم ہے وہ سب کے لئے غیر عادل اور ظالم ہے۔ میں بحیثیت مسلمان کے یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اگر میں ایک غیر مسلم کے ساتھ انصاف نہیں کرتا تو اپنے باپ بھائی کے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکتا۔ یہ حقیقت جس طرح انفرادی دائرے میں حقیقت ہے اسی طرح اجتماعی دائرے میں بھی حقیقت ہے۔ جو قوم مسلمانوں کے ساتھ عدل نہیں کر سکتی اس کے افراد خود اپنے ساتھ بھی انصاف نہیں کر سکیں گے اور جس طرح مسلمانوں کے لئے آپ کے پاس ردعمل کا عذر ہے اسی طرح ان میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی عذر ہاتھ آجائے گا جس کے پردے میں وہ اپنے ہر ظلم کو ثواب بنا لے گا۔ اس وجہ سے ہم بھارت کے لیڈروں سے یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کے لئے بدآموزی کی یہ راہ نہ کھولیں۔ اس کا ہمیں تو جو نقصان پہنچیگا وہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ خدانخواستہ بھارت میں مسلمان ختم ہوجائینگے لیکن اس کا دوسرا پہلو، جیسا کہ ہم نے اُوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ قدرت کے قانون کی رُو سے بھارت کی حکومت اپنے مقصد وجود کی نفی کر دے گی۔ ہم یقین رکھتے ہیں اور اس یقین کے لئے ہمارے پاس نہایت مضبوط دلائل ہیں کہ اگر گاندھی جی اس دنیا میں پھر آجائیں تو وہ اپنی قوم کو اس راستہ پر ہرگز جانے کی اجازت نہ دیں گے اگرچہ انہیں اس کی سزا میں کسی اور گوڈسے کے پستول سے دوبارہ مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔ ہم از راہ محبت انسانی یہ آرزو رکھتے ہیں کہ کاش گاندھی جی کے نام لیواؤں میں کوئی شخص ایسا اُٹھتا جو مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنی قوم کو اس زہر ہلاہل سے بچانے کی خاطر جان کی بازی کھیل سکتا!!

ہم اس امر واقعی کا اظہار و اعلان بھی برملا کرتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان بھارت کے مسلمانوں کے معاملات سے کبھی اپنے آپ کو بے تعلق نہیں کر سکتے۔ ان کے ساتھ ہمارا ایمانی رشتہ بھی ہے اور خونی رشتہ بھی۔ ان دو دو مضبوط رشتوں کی موجودگی میں یہ ناممکن ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان سے اور ان کے حالات و مسائل سے بالکل بیگانہ بنا لیں۔ اسی طرح ہم یہ توقع بھی نہیں رکھتے کہ بھارت کے ہندو پاکستان کے ہندوؤں کے معاملات و مسائل سے بالکل بے تعلق ہوجائیں گے اس لئے کہ

ہماری ہی طرح وہ بھی اپنے بھائیوں سے دو دو بندھنوں میں بندھے ہوئے ہیں لیکن اس امر واقعی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک امر واقعی ہے کہ بھارت کے مسلمان اور پاکستان کے ہندو اپنی اپنی حکومتوں کی رعایا ہیں۔ ان گوناگوں تعلقات اور ذمہ داریوں کو حسن و خوبی اور کامیابی کے ساتھ نباہنے کی بھارت اور پاکستان دونوں کے لئے ایک اور صرف ایک ہی راہ ہے۔ وہ یہ کہ دونوں حکومتیں اپنی اپنی اقلیتوں کو امن، عزت اور عدل کی زندگی فراہم کریں۔ یہ نہایت واضح حقیقت ہے جس کے سمجھنے کے لئے معمولی عقل بھی کافی ہے اور ہمیں خوشی ہے کہ پاکستان نے اس حقیقت کو سمجھنے میں ایک دن کی دیر بھی نہیں لگائی۔ ہمیں یاد ہے کہ قائدِاعظم نے قیام پاکستان کے بعد اپنی [illegible] میں نہایت واضح الفاظ میں اس کا اعلان کر دیا تھا۔ اور یہاں کے مسلمانوں نے صدق دل سے ان کے اس اعلان کو قبول کر لیا۔ گاندھی جی بھی اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے اور انہوں نے بھی اس کے اظہار و اعلان میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن افسوس ہے کہ ہندو قوم نے من حیث القوم اب تک اس حقیقت کو قبول نہیں کیا۔ پاکستان کے قیام سے اس کے دل میں مسلمانوں کے خلاف ایک ایسی گرہ پڑ گئی ہے جو کسی طرح کھلتی ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ پاکستان کو تسلیم کرنے پر اپنے دل کو راضی کر سکی نہ مسلمانوں کو اپنے اندر گوارا کرنے کے لئے۔ اسی بات کا یہ نتیجہ ہے کہ وہاں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کا موسم ہمیشہ گرم رہتا ہے اور یہ بات شاید اب تک وہاں بڑے بڑوں کی سمجھ میں بھی نہیں آئی کہ غصہ اور انتقام کے جذبات وقتی طور پر تو اپنے اندر کچھ جواز کے پہلو ممکن ہے رکھتے ہوں لیکن اگر کوئی قوم انہی جذبات کو اپنا کیش و مشرب بنائے تو عالم انسانی کی پوری تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ایسی قوم دوسروں کو بہانے کے بجائے خود ان جذبات کے سیلاب میں بہ گئی ہے۔

اب ہمارے بھارت کے ہندو بھائیوں کو یہ بات مان لینی چاہیئے کہ پاکستان ایک حقیقت ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی مان لینی چاہیئے کہ ۵ کروڑ مسلمان جو بھارت میں موجود ہیں وہ بھارت کے شہری ہیں اور اکثریت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کے حقوق تسلیم کرے اور ان کی حفاظت کرے۔ حقائق اور ذمہ داریوں کو تسلیم کرنے ہی سے قومیں سرخرو ہوتی اور عزت پاتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر کوئی قوم حقائق کو جھٹلائے اور ذمہ داریوں کو پامال کرے تو اس سے وہ دوسروں کی راہ میں جتنی مشکلیں پیدا کرتی ہے اس سے کہیں زیادہ خود اپنی راہ کانٹوں سے بھر دیتی ہے۔ اب پاکستان کی مخالفت کا وقت

گزر گیا اب پاکستان اور بھارت دونوں واقعات کی شکل میں موجود ہیں اور دونوں کی بہتری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دوست اور خیر خواہ بنیں اور ان باتوں سے بچیں جو باہمی تعلقات کو خراب کرنے والی ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن سے بے تعلق رہنا پاکستان کے مسلمانوں کے لئے ممکن نہیں ہے اس وجہ سے اگر بھارت میں مسلمان اسی طرح پامال ہوتے رہے جس طرح آج پامال ہو رہے ہیں تو اس کا یہ ردعمل تو انشاء اللہ ہرگز نہیں ہوگا کہ یہاں کی ہندو اقلیت کو کوئی ضرر پہنچے لیکن یہ نتیجہ ضرور نکلے گا کہ بھارت اور پاکستان ایک دوسرے کے کبھی دوست نہ ہو سکیں گے۔ اب یہ بھارت کے لیڈروں کا کام ہے کہ وہ ذہنی توازن کے ساتھ سوچیں کہ یہ عمل اور ردعمل کا خونیں ڈراما ان کے لئے اور ہمارے لئے مفید ہے یا دوستی اور اعتماد کی وہ فضا جس میں دونوں ملک اپنی تعمیری سرگرمیوں میں مصروف ہو سکیں۔

آخر میں ہم بھارت کے مظلوم مسلمانوں سے بھی ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ ان کی زندگی اور عزت دونوں کی ضمانت ایمان میں مضمر ہے۔ ایمان کے ساتھ زندگی بھی زندگی ہے اور موت بھی زندگی ہے۔ ایمان پر جمے رہنے کی صورت میں مومن مرتا نہیں ہے بلکہ اپنی موت سے ہزاروں لاکھوں زندگیاں پیدا کرتا ہے۔ اصلی طاقت انسانوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا ہاتھ غیر مرئی ہے لیکن ہے بڑا طاقتور۔ وہ دیر میں نمودار ہوتا ہے لیکن مظلوموں کے لئے نمودار ضرور ہوتا ہے اور جب نمودار ہوتا ہے تو کوئی اس کو روک یا پکڑ نہیں سکتا۔ اس کے نمودار ہونے کا وقت وہ ہوتا ہے جب مومن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگتا ہے لیکن وہ بے صبر یا مایوس نہیں ہوتا بلکہ اپنے رب اور صرف اپنے رب ہی سے آس لگائے، اُمید کا دیا جلائے، ناصر غیب سے لو لگائے ایمان پر جما رہتا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اگر بھارت کے مسلمانوں نے ایمان کی حبل اللہ مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھی تو وہ کتنے ہی بے سہارا اور ناتواں کیوں نہ ہوں لیکن یہ رسی بڑی مضبوط ہے، انہیں کوئی طاقت بھی ہلا نہ سکے گی۔ کیا عجب کہ خدا نے تمام جھوٹے سہاروں سے اسی لئے ان کو الگ کیا ہو کہ ان کے لئے تنہا اپنے سہارے کی شانیں دکھائے۔ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ خدا ہر آزمائش میں ان کا یار و مددگار و ناصر ہو۔

سب سے آخر میں ہم پاکستان کے مسلمانوں کو وہ بات پھر یاد دلانی چاہتے ہیں جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے کہ انفرادی، اجتماعی اور سیاسی زندگی کے کسی گوشے میں بھی "ردعمل" کا فلسفہ

ہمارے لئے رہنما نہیں بن سکتا جو زید کے جرم کا انتقام بکر سے لینے کو جائز ٹھہراتا ہو۔ اس ملک کی اقلیتوں کے ساتھ ہمارا معاملہ اسلام کے اسی اصول پر مبنی ہوگا جس کا حوالہ ہم نے اُوپر دیا ہے کہ جب تک وہ ملک کی وفادار ہیں ہم ان کے جان، مال، عزت، مذہب اور حقوق کے محافظ ہیں اور ہماری حکومت کا فرض ہے کہ وہ ان کی ان ساری چیزوں کی حفاظت کرے اور ملک کی سیاسی زندگی میں ان کو تمام آئینی وسائل سے فائدے اُٹھانے کے مواقع بہم پہنچائے۔ یہ صرف سیاست اور جہاں بانی ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ ہر مسلمان اور ہر اسلامی حکومت پر خدا اور رسول کا مقرر کیا ہُوا فریضہ ہے اور جو مسلمان بھی اس کی خلاف ورزی کریگا وہ اسلامی شریعت کی مخالفت کرے گا اور قیامت کے دن خدا کی عدالت میں اس کے خلاف خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استغاثہ دائر فرمائیں گے۔ اس اصول کے احترام میں اس بات سے کوئی فرق واقع نہیں ہو سکتا کہ بھارت میں مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ بھارت کے ہندوؤں کے کسی فعل کی ذمہ داری بھی ہماری اقلیتوں پر نہیں ہے۔ پاکستان کی حکومت کو اگر بھارت کے مسلمانوں کا درد ہے (اور یہ درد اسلامی رشتے کی بنا پر لازماً ہونا چاہیئے) تو وہ حکومتی سطح پر اس سلسلے میں جو قدم مناسب خیال کرے اُٹھائے (اور اس پر یہ حق ہے کہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے وہ قدم اُٹھائے) لیکن یہ بات ہم صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارے مذہب کا مطالبہ ہم سے یہی ہے کہ ہمارے ملک کی اقلیتیں جب تک اپنے عہد کی وفادار ہیں ہم پر فرض ہے کہ ان سے کئے ہوئے عہد اور ان کو دی ہوئی ضمانت کے ہم وفادار رہیں۔

اس معاملے کا ایک نازک پہلو بھی ہے جس کو خاص طور پر ہر پاکستانی کو ملحوظ رکھنا چاہیئے وہ یہ کہ بھارت نے چونکہ مسلمانوں پر مظالم ڈھانے کے لئے ردعمل کا بہانہ اختیار کیا ہے اس وجہ سے اس کا طریقہ یہ ہے کہ پاکستان میں اگر رائی کے برابر بھی کوئی زیادتی کی بات ہو تو وہ اس کو پربت بنا تا ہے تاکہ مسلمانوں پر پہاڑ گرانے کے یہ رائی اُوٹ کا کام دے سکے۔ اس پہلو سے بھی ہمارے لئے صحیح روش یہی ہے کہ ہم کوئی چھوٹا سے چھوٹا بہانہ بھی ایسا نہ پیدا ہونے دیں جو اسلام کی بدنامی اور ہمارے دینی بھائیوں کی بربادی کے لئے پردے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

تدبرِ قرآن

امین احسن اصلاحی

(۳۷)

تفسیر سورۃ البقرۃ

۴۷۔ آگے کا سلسلۂ کلام (آیات ۲۱۵-۲۲۱)

اُوپر کا مضمون، واضح ہو چکا ہے، کہ حج کے مضمون سے بطور ایک التفات کے پیدا ہو گیا تھا جس سے اہل نفاق کو ایک مناسب موقع تنبیہ ہو گئی اور اہل ایمان کو ایک برمحل تذکیر۔ اصل سلسلہ بیان حج اور جہاد و انفاق سے متعلق تھا چنانچہ اس ضمنی مضمون کے ختم ہونے کے بعد سلسلہ کلام پھر لوٹ آیا اور مذکورہ چیزوں سے متعلق اس دوران میں لوگوں کے اندر جو سوالات پیدا ہوئے ان کے جوابات دیئے گئے۔

یہ سوالات، جیسا کہ آگے کی تفصیلات سے واضح ہو گا انہی مسائل سے متعلق ہیں جو اُوپر زیر بحث آئے ہیں۔ البتہ شراب اور جوئے سے متعلق جو سوال ہے وہ اس موقع پر ان لوگوں کو شاید بے جوڑ معلوم ہو جو عرب کے اس زمانے کے تمدنی و معاشرتی حالات سے واقف نہیں ہیں جس زمانے میں یہ آیتیں اُتری ہیں۔ یہ سوال در حقیقت اس انفاق کے تعلق سے یہاں پیدا ہوا ہے جس کا ذکر اُوپر ہو چکا ہے۔ ہم آیات کی وضاحت کرتے ہوئے بتائیں گے کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کے جہاں بہت سے مضر پہلو تھے وہاں ان کے بعض مفید پہلو بھی تھے۔ عرب کے سخی اور حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ قحط، خاص طور پر سردیوں کے زمانے میں، وہ جگہ جگہ اکٹھے ہوتے، خوب شراب پیتے، پھر شراب کی مستی میں جس کسی کے اُونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے، اس کے مالک کو منہ مانگے دام دے دیتے اور پھر اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جتنا گوشت جیتتا جاتا وہ ان غریبوں اور فقیروں میں لٹاتا جاتا جو اس طرح کی کسی تقریب کی خبر سن کر موقع پر

پہلے جمع ہو جاتے ۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب روایت تھی ۔ جب شمال کی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں اور ملک میں قحط کی سی حالت پیدا ہو جاتی تو جو لوگ اس قسم کی تقریبیں منعقد کرتے یا ان میں شریک ہوتے ان کو بڑا سخی داتا سمجھا جاتا اور سوسائٹی میں ان کی بڑی عزت ہوتی ۔ اس کے برعکس جو لوگ اس چیز سے الگ رہتے ان کے لئے ایک خاص لفظ " برم " کا استعمال ہوتا جس کے معنی بخیل کے ہیں ۔

عرب شعراء اس جوئے اور شراب کا ذکر اپنے قصائد میں بڑی دھوم دھام سے کرتے ہیں ۔ میں یہاں بعض مشہور شعراء کے کلام کے حوالے نقل کرنا چاہتا ہوں لیکن اس قسم کی خالص علمی چیزوں سے عام قارئین کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھاتے اس وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ یہ اشعار یہاں نقل کرنے کے بجائے اصل کتاب میں ... (جب اس کے کتابی صورت میں چھپنے کی نوبت آئے) حاشیہ پر نقل کر دیئے جائیں ۔

غرض جوئے اور شراب کا یہ پہلو تھا جس کی وجہ سے عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں ان کا شمار فیاضی اور سخاوت کے خصائل اور خدمتِ خلق اور ہمدردی غربا کے محرکات میں سے ہوتا تھا ۔ چنانچہ جب قرآن نے انفاق اور ہمدردی غربا پر بہت زور دیا تو بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب اسلام غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی اور ان کی امداد کے لئے مال خرچ کرنے پر اتنا زور دیتا ہے تو آخر اس جوئے اور شراب میں کیا خرابی ہے جو قحط کے زمانے میں غربا کی امداد کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ قرآن نے یہاں اسی سوال کو نقل کر کے اس کا جواب دیا ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ ان چیزوں سے سوسائٹی کو بعض اعتبارات سے کچھ فائدے تو ضرور پہنچ جاتے ہیں لیکن ان سے فرد اور سماج دونوں کو جو مادی و اخلاقی نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد کی نسبت سے بہت زیادہ ہیں اس وجہ سے اسلام نے ان کو حرام قرار دیا ۔

یہ سوال بالکل اسی طرح کا سوال ہے جس طرح کا سوال وہ لوگ اٹھاتے ہیں جو آج قحط ، زلزلہ اور سیلاب وغیرہ کے مصیبت زدوں کی امداد کے لئے فنڈ جمع کرنے کی خاطر رقص و سرود کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں یا سنیما کے شو دکھاتے ہیں یا فلم اسٹاروں کے مظاہرے اور ان کے میچ کراتے ہیں ۔ ان لوگوں کو بھی اگر ان بُرے راستوں کے اختیار کرنے پر (اگرچہ وہ کسی اچھے ہی مقصد سے اختیار کئے گئے ہوں) ملامت کی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ جب ہم یہ کام انسانیت کی خدمت کے لئے کر رہے ہیں تو آخر اس میں کیا خرابی ہے ؟ درحقیقت یہ لوگ بھی عرب جاہلیت کی طرح اپنی ان حماقتوں کے صرف انہی پہلوؤں کو دیکھتے ہیں جو ان کی نگاہوں میں بظاہر نفع عوام کے ہیں ، ان کی نظر ان ہولناک نقصانات کی طرف نہیں جاتی جو ان سے پورے معاشرے کو پہنچتے ہیں

یہاں ہم صرف اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ آگے آیات کی تفسیر کے تحت اس کی ضروری تفصیل آئے گی۔
اسی طرح اس ضمن میں یتامیٰ سے متعلق بھی ایک سوال پیدا ہوا۔ اوپر انفاق کے سلسلہ میں والدین اور اقرباء کے ساتھ یتیموں کا بھی حوالہ دیا گیا تھا کہ اس انفاق کے مستحق وہ بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے خاندان کے کسی یتیم کے معاملات کو جس کی اس کے سر ذمہ داری ہے اپنے ساتھ شامل کر لے اور اس کی ماں کے ساتھ نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے اس سوال کے بھی بعض پہلوؤں کو واضح فرمایا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجئے تو وہ بالکل مربوط کڑیوں کی شکل میں نظر آئیں گی۔

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝۲۱۵ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝۲۱۶ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَنْ يَرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝۲۱۷ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝۲۱۸ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِنْ نَفْعِهِمَا ۗ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ۝۲۱۹ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۗ وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَأَعْنَتَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝۲۲۰ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَّ ۚ وَلَأَمَةٌ مُؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ ۗ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُؤْمِنُوا ۚ وَلَعَبْدٌ مُؤْمِنٌ خَيْرٌ مِنْ مُشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ ۗ أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۖ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ ۖ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ

ع ۲۷ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۝۲۲۱

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا کچھ خرچ کریں؟ کہہ دو جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو تو وہ والدین، قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہو اور جو نیکی بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے - ۲۱۵

تم پر کفار سے جنگ فرض کی گئی اور وہ تمہارے لئے ایک ناگوار شے ہے۔ ممکن ہے تم ایک شئے کو ناگوار خیال کرو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہو اور ممکن ہے کہ تم ایک شئے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمہارے لئے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے - ۲۱۶

وہ تم سے شہر حرام میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اس میں جنگ بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا، اس کا کفر کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس جنگ سے بھی زیادہ سنگین ہے اور جبر و ظلم کے ذریعہ سے لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے، یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں اگر وہ پھیر سکیں اور تم میں سے جو اپنے دین سے پھر جائے گا اور حالت کفر میں مرے گا تو یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے۔ اور یہی لوگ دوزخ میں پڑنے والے ہیں، اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ البتہ جو لوگ ایمان پر جمے رہیں گے اور جنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا وہ اللہ کی رحمت کے متوقع ہیں۔ اللہ بخشنے والا' مہربان ہے۔ ۲۱۷ - ۲۱۸ -

وہ تم سے شراب اور جوئے کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دو ان دونوں چیزوں کے اندر بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑھ کر ہے۔

اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں کہہ دو کہ جو ضروریات سے بچ رہے۔ اسی طرح اللہ تمہارے لئے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم غور کرو، دنیا اور آخرت دونوں کے معاملات میں - ۲۱۹-

اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو جس میں ان کی بہبود ہو وہی بہتر ہے اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ کون بگاڑ چاہنے والا ہے اور کون بہبود، اور اگر اللہ چاہتا تو تم کو مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب و حکیم ہے - ۲۲۰

اور مشرکہ عورتوں سے جب تک وہ ایمان نہ لائیں نکاح نہ کرو۔ ایک مومنہ لونڈی ایک آزاد مشرکہ سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بھلی لگے۔ اور مشرکوں کو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اپنی عورتیں نکاح میں

نہ دو، ایک مومن غلام ایک آزاد مشرک سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمہیں بھلا لگے۔ یہ لوگ دوزخ کی طرف بلانے والے ہیں اور اللہ اپنی توفیق بخشی سے جنّت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اور اپنی آیتیں لوگوں کے لئے واضح کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں - ۲۲۱

۷۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۥ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۥ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۲۱۵

اس سورہ میں شروع ہی سے انفاق اور زکوٰۃ کا حکم بار بار آرہا ہے۔ خاص طور پر آیت ۱۹۵ میں بیت اللہ کی آزادی کے جہاد کے سلسلے میں بڑی تاکید سے انفاق پر ابھارا ہے۔ وہاں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے تو خطاب عام ہے لیکن رُوئے سخن درحقیقت ان مسلمانوں کی طرف ہے جو جان و مال کی قربانی میں کمزور تھے۔ قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو تو وہ اس کے کرنے کی ہمّت نہ کر رہا ہو، تو وہ اپنی اس کمزوری کو چھپانے کے لئے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے اس کو کرنے کے لئے تو وہ جی جان سے حاضر ہے لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ یہی بھید ہے کہ سوالات سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کئے گئے، زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کیے گئے جو کم ہمت اور بخیل تھے اور اپنی اس کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جنہوں نے انفاق کے حکم کے جواب میں یہ سوال اُٹھایا جس کا آیت زیر بحث میں حوالہ دے کر جواب دیا گیا ہے۔ اس سوال سے خود اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ گویا وہ انفاق کے مطالبوں سے دبے جا رہے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ مطالبے کس حد پر جا کر رکیں گے۔ چنانچہ قرآن نے سوال کرنیوالوں کی اس ذہنیت کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے اور اس جواب کے دو حصّے ہیں۔ ایک حصّہ تو یہ ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کا کوئی حصّہ بھی خدا کے جیب میں نہیں جاتا، وہ کسی کے مال و اسباب کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ ایک ہاتھ سے جو کچھ لیتا ہے دوسرے ہاتھ سے ہماری ہی طرف لوٹا دیتا ہے، ہمارے ہی ماں باپ، ہمارے ہی

خویش واقارب، ہمارے ہی یتیم، ہمارے ہی مسکین اور ہمارے ہی مسافر ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ گویا خدا کی راہ میں ہم جو کچھ خرچ کرتے ہیں کسی دوسرے کی خدمت پر نہیں بلکہ اپنی ہی خدمت پر خرچ کرتے ہیں بس فرق ہے تو یہ ہے کہ اس خرچ کی نوعیت ایک اجتماعی نظم کی ہے جس کا فائدہ سب کو بحیثیت مجموعی پہنچتا ہے۔ یہی حقیقت تؤخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم (ان کے مالداروں سے لے کران کو غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے) کے الفاظ سے واضح فرمائی اور اسی بات کی طرف سورۂ سبا کی آیت قُلْ مَا سَأَلْتُكُمْ مِنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۴۷ (کہہ دو میں نے جو تم سے اجر مانگا ہے وہ تمہارے ہی لئے ہے) بھی اشارہ کر رہی ہے۔

اس جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ انسان جو نیکی بھی کرتا ہے اسے اطمینان رکھنا چاہیئے کہ اس کا ایک ایک ذرہ سب خدا کے علم میں ہے، کوئی چیز نہ تو اس کے علم سے باہر ہے اور نہ کسی چیز کو وہ فراموش کرنے والا ہے، پھر جب وہ سب کچھ جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ اس کا بھرپور صلہ بھی دے گا، پھر جب ہر چیز کا صلہ ملنے والا ہے اور وہ بھی دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے انسان کیوں گھبرائے؟ وَلَا يُنْفِقُونَ نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۱۲۱ - توبہ (اور وہ خدا کی راہ میں جو چھوٹا یا بڑا انفاق کرتے ہیں یا کوئی وادی قطع کرتے ہیں تو یہ ان کے لئے لکھ لیا جاتا ہے تاکہ اللہ ان کو اس سے بہتر بدلہ دے)

یہ جواب اگرچہ نہایت واضح اور جامع تھا لیکن اس کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ غالباً اسی کمزوری کے سبب سے جس کی طرف ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے، سوال کرتے ہی رہے چنانچہ آگے آرہا ہے وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ۲۱۹ (اور وہ تم سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہ دو جو ضروریات سے فاضل بچ رہے) اس جواب نے انفاق کی آخری حد معین کر دی کہ یہ انفاق چونکہ اُمت کے تحفظ و بقا کے جہاد کے سلسلہ کا انفاق ہے اس وجہ سے اس میں دین کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان اپنی ناگزیر ضروریات سے جو کچھ بچا سکے وہ سب خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے تیار رہے۔

مولانا فراہیؒ اس آیت کو ذرا اس سے مختلف زاویہ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی تاویل یہ ہے کہ چونکہ یہ انفاق اس جہاد کے لئے تھا جس کا حکم خانہ کعبہ کو مشرکین کے قبضہ سے آزاد کرانے کے لئے ہوا تھا اس وجہ سے اس نے مسلمانوں کی ساری توجہ اپنی طرف جذب کر لی اور اس جہاد کی تیاریوں میں وہ اس قدر منہمک ہو گئے کہ انفاق

کے دوسرے مصارف ــــ والدین، اقربا، یتامٰی، مساکین وغیرہ ــــ کی طرف ان کو وہ توجہ نہیں رہی جو ہونی چاہیئے تھی اس وجہ سے لوگوں میں یہ سوال پیدا ہُوا کہ انفاق کی مقدار کیا ہو۔ اس کے جواب میں ارشاد ہُوا کہ خدا کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس کے اول حقدار وہ مستحقین ہیں جن کا ذکر ہُوا، پھر مزید جو کچھ خرچ کیا جائے تو وہ سب اللہ کے علم میں رہے گا اور وہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ یہاں مقدار کی تشریح نہیں فرمائی کہ لوگ خود اپنی عقل سے کام لیں اور مختلف دینی ضروریات میں توازن قائم کریں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی بعض لوگوں کے ذہن میں مقدار سے متعلق شبہ رہ گیا تو انہوں نے پھر سوال کیا۔ ان کے جواب میں یہ تصریح کر دی گئی کہ جو کچھ مستحقین سے فاضل بچے وہ خرچ کرو، چونکہ اُوپر مستحقین کا ذکر ہو چکا تھا اس وجہ سے یہ مختصر جواب کافی ہُوا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ٢١٦

اُوپر یہ بات تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ یہ انفاق اور یہ جنگ دونوں ایک ہی سلسلے کی باتیں ہیں اس لئے کہ جہاد جان اور مال دونوں سے ہوتا ہے۔ اُوپر والی آیت میں اس تردد کو دور کیا ہے جو بعض ذہنوں میں مالی قربانی سے متعلق پیدا ہُوا اب اس آیت میں وہ تردد رفع کیا جا رہا ہے جو جان کی قربانی کے معاملہ میں تھا۔ اس تردد کو رفع کرنے کے لئے ایک اصولی حقیقت جو واضح فرمائی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے لئے فوز و فلاح اور عروج و کمال کا راستہ خود نہیں طے کر سکتا بلکہ وہ خدا ہی طے کر سکتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے، اس لئے کہ اسی کو علم ہے کہ انسانی فطرت کے مضمرات اور اس کی صلاحیتیں کیا ہیں اور وہ طریقے اور قاعدے کیا ہیں جن کو اختیار کر کے وہ اپنی تمام صلاحیتیں اُجاگر کر سکتا ہے۔ اگر اپنے لئے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کا سارا معاملہ انسان کی اپنی ہی خواہش اور اس کی اپنی ہی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو عجب نہیں کہ وہ اپنی خواہشات نفس کی پیروی میں اپنی زندگی کے پروگرام سے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے خارج کر دیتا جو اس کے عروج و کمال اور اس کے روحانی و اخلاقی ارتقا کا ذریعہ ہیں کیونکہ ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے نفس کے لئے دل پسند ہو بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر نفس پر شاق گزرنے والی ہیں۔ اسی طرح اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ وہ اپنے اندر وہ ساری باتیں جمع کر لیتا جو اس کو اسفل سافلین میں لے جانے والی ہیں کیونکہ یہ ساری باتیں نفس کے لئے نہایت آسان اور لذیذ ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ جو چیزیں اس کے نفس کو مرغوب ہیں وہ اس کو پست کرنے والی ہیں اور جو چیزیں اس کو بلند کرنے والی ہیں وہ اس کے نفس کو عموماً بہت شاق ہیں۔ اس وجہ سے اس کی فلاح

کی راہ بتانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہے اور اپنے رسولوں اور کتابوں کے ذریعہ سے اس کی رہنمائی کی ہے۔

جنگ وجہاد کے معاملے کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔ اس کے ظاہری پہلو پر نگاہ ڈالی جائے تو اس سے زیادہ ہولناک چیز کیا ہوسکتی ہے لیکن بسا اوقات اس ہولناک شے کو سب سے زیادہ محبوب بنانا پڑتا ہے اس لئے کہ اگر اس سے گریز کیا جائے تو تمام انسانی اقدار بالکل تباہ ہو کر رہ جائیں۔

یہ جو فرمایا ہے کہ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انسان کسی معاملے میں خیر و شر کے پہلو کو متعین کر ہی نہیں سکتا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو اس راہ میں بہت سے مغالطے پیش آتے ہیں اس وجہ سے وہ بسا اوقات ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کی شان ہے کہ اس کا علم ظاہر، باطن اور ماضی و مستقبل سب کو محیط ہے اس وجہ سے اس نے انسان کی رہنمائی کے لئے زندگی کا سارا پروگرام خود بنا کر نازل فرمادیا ہے۔ اور یہ پروگرام ایسا جامع ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی و ترقی کا ضامن ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ۭ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَھُوَ كَافِرٌ فَاُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اوپر آیات ۱۹۰ — ۱۹۵ میں اس بات کی طرف اشارہ فرمادیا تھا کہ اگر مشرکین تمہارے ارادۂ حج میں مزاحم ہوں اور ان کی اس مزاحمت کے سبب سے جنگ کی نوبت آجائے تو تم ان سے جنگ کرو اور ان کو قتل کرو اگرچہ یہ جنگ اشہر حرم میں بلکہ عین حدود حرم میں لڑنی پڑے۔ یہ بات اگرچہ واضح تھی لیکن اشہر حرم کے معاملہ میں زمانہ جاہلیت سے عربوں کی روایات اتنی سخت تھیں اور ان میں جنگ و خون ریزی کو وہ اتنا بڑا گناہ سمجھتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ بات آسانی سے نہیں اتر سکتی تھی۔ اس طرح کے معاملات میں چونکہ جذبات کو بڑا دخل ہوتا ہے اس وجہ سے مخالفین کو پروپگنڈے کا بھی بڑا موقع ہاتھ آجاتا ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق لوگوں کی طرف سے سوال ہوا اور قرآن نے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا۔

قرآن نے جس طرح اُوپر کی آیات میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اشہر حرم میں قتل و خونریزی بڑا سنگین گناہ ہے اسی طرح یہاں بھی اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ "قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ" (کہہ دو کہ اشہر حرم میں جنگ کرنا بڑی سنگین بات ہے) لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی واضح فرما دی ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ کا کفر کرنا، مسجد حرام سے اللہ کے بندوں کو محروم کرنا اور جو اپنے اعمال و عقائد کے اعتبار سے اس مسجد حرام کے سب سے زیادہ حق دار ہیں ان کو یہاں سے ہجرت پر مجبور کرنا، اشہر حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان سنگین تر جرائم کے سدباب کے لئے اشہر حرم میں جنگ کرنی پڑ جائے تو یہ اشہر حرم کی حرمت کا قصاص ہوگا اور یہ گناہ نہیں بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔

پھر خاص طور پر "فتنہ" کا حوالہ دیا ہے کہ اَلْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ کہ یہ فتنہ جو مکہ میں پایا جا رہا ہے تو یہ قتل سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ فتنہ کی تحقیق ہم اُوپر بیان کر آئے ہیں کہ اس سے مراد وہ سنگدلانہ اذیتیں اور تکلیفیں ہیں جو کفار و مشرکین مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لئے پہنچا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ پھر جب یہ فتنہ آج عین بلد امین اور بلد حرام میں موجود ہے، نہ سرزمین حرم کا احترام اس سے ظالموں کو روک رہا ہے اور نہ اشہر حرم کا احترام اس میں مانع ہے تو آخر مظلوموں کی مدافعت کے لئے اشہر حرم میں جنگ کیوں گناہ ٹھہرے!

پھر اس فتنہ کی سنگینی کو واضح کرنے کے لئے فرمایا کہ کفار و مشرکین مسلمانوں کو دین حق سے پھیرنے کے لئے جو مظالم کر رہے ہیں ان کی نوعیت صحیح انفرادی واقعات کی نہیں ہے جو کسی وقتی جوش کے تحت صادر ہو گئے ہوں بلکہ مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لئے یہ لوگ خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ چھیڑنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور یہ (اگر ان کے امکان میں ہو تو) اس وقت تک دم لینے والے نہیں ہیں جب تک تمہیں اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیا ایسے سخت و شدید فتنہ کے مقابلہ کے لئے بھی اشہر حرم میں لڑائی گناہ ہی رہے گی!

یہاں تک تو اصل سوال کا جواب تھا۔ اس کے بعد ارتداد کے ذکر کے تعلق سے ایک مناسب موقع تنبیہ مسلمانوں کو بھی کر دی کہ اگر ان کے ظلم و ستم سے مرعوب ہو کر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا تو اس کے تمام اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے اور وہ دوزخ میں پڑے گا جس میں ہمیشہ رہے گا۔ یہاں اکارت ہونے کے لئے حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ کے الفاظ

استعمال ہوئے ہیں۔ اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو بظاہر نیکی کے ہیں اور حبط سے مراد ان کا بالکل بے نتیجہ اور بے اثر ہو جانا ہے۔ یعنی اس کفر کے بعد اس نے اسلام کے جو کام کئے وہ بھی بالکل برباد ہو کر رہ جائیں گے۔

اس آیت میں ایک خاص نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ اعمال کے اکارت ہونے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت ہو کر رہ جائیں گے، حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فِي الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ۔ آخرت میں مرتد ہو جانے والوں کے اعمال کا اکارت ہو جانا تو واضح ہے البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کی شکل کیا ہوگی؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص مرتد ہو جاتا ہے وہ اسلامی ریاست میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہو جاتا ہے، ریاست پر اس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری باقی نہیں رہ جاتی۔ چنانچہ اسی اصول پر اسلامی تعزیرات کا وہ قانون مبنی ہے جو مرتدوں کی سزا سے متعلق ہے۔

اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِيۡنَ هَاجَرُوۡا وَجَاهَدُوۡا فِيۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرۡجُوۡنَ رَحۡمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۲۱۸

کفار کے ظلم و ستم سے گھبرا کر مرتد ہو جانے والوں کا انجام بتانے کے بعد اُن لوگوں کا مقام بھی بتا دیا جو کفار کی ان تمام ستم رانیوں کے باوجود اپنے ایمان پر جمے رہیں گے اور ہجرت و جہاد کی بازیاں کھیلیں گے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بے شک اس بات کے سزاوار ہیں کہ اپنے رب کی رحمت کے امیدوار ہوں۔ موقع و محل دلیل ہے کہ یہاں لفظ "اٰمَنُوۡا" اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے، اسی وجہ سے ہم نے اس کا ترجمہ "اپنے ایمان پر جمے رہے" کیا ہے۔

اس وقت ہجرت اور جہاد مسلمانوں پر بیک وقت دونوں واجب تھے، بیت اللہ کی آزادی اور فتنہ کے قلع قمع کے لئے جہاد کا بھی حکم ہو چکا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور ایمان کے تحفظ کے لئے ہجرت کا بھی، اور یہ دونوں ہی معرکے بڑے سخت تھے اس وجہ سے ان دونوں ہی باتوں کا ذکر فرمایا۔ اس میں مسلمانوں کے لئے یہ رہنمائی بھی تھی کہ کفار کی ستم رانیوں کا جواب ارتداد نہیں بلکہ ہجرت اور جہاد ہے جو لوگ یہ بازیاں کھیل سکیں ان کے متعلق فرمایا کہ یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ یعنی یقین تو ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی کسی کو نہیں کرنا چاہیئے، اس لئے کہ کوئی بھی اپنے عمل سے نجات نہیں حاصل کرے گا بلکہ جس کو بھی نجات حاصل ہوگی خدا کی بخشش اور اس کی مہربانی ہی سے ہوگی، چنانچہ آگے فرماد

واللہ غفور رحیم۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا

اُوپر فصل کی تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ شراب اور جوئے سے متعلق یہ سوال ان کے ان فوائد کو سامنے رکھ کر بعض لوگوں نے کیا جو اس وقت کی عرب کی مخصوص سوسائٹی کی روایات کی بنا پر ان میں پائے جاتے تھے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عرب جاہلیت کی سوسائٹی میں جوئے اور شراب کی نوعیت موجودہ قمار بازی اور موجودہ بادہ خواری سے بالکل مختلف تھی۔ ہمارے ہاں جوا زری قسمت آزمائی اور بربادی اور شراب نوشی نری عیاشی ہے لیکن عرب جاہلیت میں ان کے اندر ہمدردی خلق کے بعض ایسے پہلو بھی تھے جن کی بنا پر اہل عرب ان کو رذائل میں نہیں بلکہ فضائل میں گنتے تھے۔ اسی پہلو سے یہاں انفاق اور جہاد کے سلسلے میں ان کے متعلق بھی سوال پیدا ہوا کہ انفاق کی ایک راہ تو یہ بھی ہے کہ قحط کے زمانے میں مالدار لوگ شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں اور جو کچھ جیتتے جاتے ہیں وہ غریبوں میں لٹاتے جاتے ہیں، پھر اس کے متعلق قرآن کا کیا ارشاد ہے؟

قرآن نے اس کا جواب دیا کہ ٹھیک ہے، ان میں بعض پہلو فائدے کے بھی ہیں لیکن ان سے سوسائٹی کو جو نقصانات پہنچتے ہیں وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطہ نظر سے یہ ناجائز ہیں۔ گویا قرآن نے یہاں اسلامی شریعت کا یہ مزاج بتا دیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زائد ہے وہ اس شریعت میں ممنوع ہیں۔

بعض لوگوں نے یہ خیال کیا ہے کہ قرآن نے یہاں جوئے اور شراب کے جن فوائد و منافع کا اعتراف کیا ہے وہ ان کے مادی اور طبی منافع ہیں لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اول تو قرآن کو اشیا یا اعمال کے طبی و مادی فوائد سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور اگر کسی پہلو سے ہو بھی تو آخر دنیا میں کون سی بری سے بری اور ناپاک سے ناپاک چیز ہے جس کے اندر مضرت کے ساتھ ساتھ کچھ پہلو فوائد کے نہ ہوں، پھر جوئے اور شراب ہی کی کیا خصوصیت ہے کہ قرآن نے ان کے ان فوائد کا اعتراف کیا؟ آخر چوری، زنا، سود، اور خنزیر وغیرہ کے اندر جو بعض پہلو فوائد کے ہیں قرآن نے ان کا اظہار کیوں نہیں کیا؟

ہمارے نزدیک اس ساری غلط فہمی کے سبب تین ہیں۔ ایک تو یہ کہ لوگوں نے اس جوئے اور

شراب کو بالکل اس جوئے اور شراب پر قیاس کیا جس کا رواج ہماری سوسائٹی میں ہے اس وجہ سے وہ اس کے اندر کسی اخلاقی اور انسانی قدر کے پائے جانے کا تصور ہی نہیں کرسکے۔

دوسرا یہ کہ لوگوں کی نظر عام طور پر عرب جاہلیت کے کلام، ان کی روایات اور ان کے معروف و منکر پر بہت کم ہے اس وجہ سے قرآن کے ایسے اشارات تک مشکل سے نگاہ پہنچتی ہے۔

تیسرا یہ کہ لوگ قرآن کے الفاظ پر بھی غور کرنے کا حق پورا پورا ادا نہیں کرتے۔ سرسری طور پر جو بات سامنے آجاتی ہے اسی کو لے اُڑتے ہیں۔ دیکھئے یہاں آیت میں "نفع" کا مقابل لفظ "اثم" استعمال کرکے قرآن نے بالکل واضح کردیا تھا کہ یہاں زیر بحث ان کے مادی اور طبی فوائد نہیں ہیں بلکہ اخلاقی فائدے ہیں اس لئے کہ اثم کا لفظ طبی نقصانات کے لئے نہیں استعمال ہوتا بلکہ اخلاقی مفاسد اور گناہوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، اگر سوال شراب کے طبی نفع و نقصان سے متعلق ہوتا تو نفع کے مقابل میں "ضرر" کا لفظ استعمال ہوتا نہ کہ "اثم" کا۔

اس آیت نے اسلامی شریعت کا یہ مزاج واضح کردیا کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں اگر ان سے کوئی فائدہ بظاہر بنی نوع انسان کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جاسکتا ہو جب بھی ان کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کے سبب سے اسلام میں ان سے احتراز ہی واجب ہے۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ لاٹری ڈالیں تاکہ اس کی یافت سے ایک شاندار مسجد تعمیر کریں یا فلم اسٹاروں کا ایک امدادی شو منعقد کریں تاکہ اس کے ٹکٹ فروخت کرکے کسی مصیبت زدہ علاقے کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بظاہر یہ کام نیکی اور خدمت خلق کے ہیں لیکن اسلام نے اس نیکی کو جائز نہیں رکھا کیونکہ اس نیکی کے پردے میں جو بدی پرورش پاتی ہے وہ اس نیکی سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ، قُلِ الْعَفْوَ ، كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ، فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

ایک ہی چیز سے متعلق اس بار بار کے سوال کا سبب میں واضح کرچکا ہوں کہ یہ سوالات ان کمزور قسم کے لوگوں کی طرف سے ہیں جو انفاق میں مشقت محسوس کررہے تھے۔ ان کی اسی کمزوری کا لحاظ تھا کہ قرآن نے ان کو جواب بھی درجہ بدرجہ دیا تاکہ ان پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ دوا سے گھبرانے والے مریض کو اگر پوری خوراک ایک مرتبہ میں نہ دی جاسکتی ہو تو تقاضائے حکمت یہی ہے کہ دو تین مرتبہ میں دی

جائے۔ چنانچہ انفاق کے متعلق بار بار سوال کرنے والوں کو بھی قرآن نے آخری اور فیصلہ کن جواب تیسری مرتبہ میں دیا۔ یہ جواب اگر پہلی ہی مرتبہ میں دے دیا جاتا تو عجب نہیں کہ زیادہ کمزور قسم کے لوگوں کے ایمان کے لئے آزمائش بن جاتا۔

یہ جواب نہایت مختصر ہے مگر ساتھ ہی نہایت واضح اور قطعی ہے۔ فرمایا کہ "قُلِ الْعَفْوَ" (جو فاضل بچے وہ خرچ کرو) فاضل سے مراد ظاہر ہے کہ آدمی کی اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچے وہ ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں وہ انفاق زیر بحث نہیں ہے جو عام مستحقین کے لئے صدقات واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہے بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کی جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کی یہ آخری حد بتا دی گئی ہے کہ اگر ملت کی حفاظت و مدافعت کے لئے ضرورت پڑ جائے تو اپنی ناگزیر ضروریات سے جو فاضل بچا سکو وہ سب اس جہاد میں قربان کر دو۔ قومی زندگی میں ایسے حالات و اوقات بھی پیش آتے ہیں جب قوم و مذہب کے لئے سب کچھ قربان کرنا پڑتا ہے اور دنیا کی ہر غیرت مند قوم خواہ کافر ہو یا مومن، یہ بازی کھیلنے پر مجبور رہتی ہے، اسلام نے یہ چاہا ہے کہ ہم اس قربانی و جاں بازی کے لئے اپنی خوشی سے تیار رہیں۔

"كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ" یہ اُوپر کے پورے سوال و جواب پر تبصرہ ہے۔ ہم عرض کر آئے ہیں کہ یہ سارے سوالات انہی مسائل سے متعلق ہیں جو اشہر حرم، جہاد اور انفاق سے متعلق حج کے سلسلہ میں مذکور ہوئے تھے۔ انہی مسائل سے متعلق بعد میں کچھ مزید سوالات پیدا ہوئے تو ان کی وضاحت فرمائی اور بطور ذکر نعمت کے اشارہ فرما دیا کہ یہ اُوپر کے اجمالات کی توضیح اور اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے کہ "ان علينا جمعه وقرآنه فاذا قرأناه فاتبع قرآنه ثم ان علينا بيانه" (کہ ہمارے ذمہ ہے اس کا جمع کرنا اور اس کا سنانا، تو جب ہم سنا چکیں تو اس سنانے کی پیروی کرو، پھر ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت)

یہاں اس تبیین کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ "لعلكم تتفكرون" تاکہ تم غور و فکر کرو۔ قرآن مجید نے مسائل کے بیان کرنے میں یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ ہر بات کے ہر پہلو کو ایک ہی ساتھ نہیں پیش کیا بلکہ ان کے بعض پہلوؤں کو مجمل چھوڑ دیا یہاں تک کہ جب ذہنوں میں ان سے متعلق سوالات پیدا ہوئے تو تدریج کے ساتھ ان کی وضاحت فرمائی، یہ محض اس لئے ہے کہ لوگوں کو غور و فکر کی تربیت حاصل ہو اور لوگ دین

م ہے جس کا تعلق جہاد، اعلائے کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاع ملت سے ہے ان مقاصد کیلئے ایک مسلمان پر انفاق

کے معاملات میں محرد لکیر کے فقیر نہ رہیں بلکہ اس کے اسرار و رموز اور فوائد و مصالح تک پہنچنے کے لئے خود اپنی عقل بھی استعمال کریں۔

بظاہر تو یہ آیت لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ پر ختم ہوجاتی ہے لیکن یہاں اس کے بعد فی الدنیا والآخرۃ کا اضافہ بھی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اضافہ نہایت قیمتی ہے۔ اوپر کے سارے سوالات پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ سوالات جو پیدا ہوئے تو محض اس وجہ سے پیدا ہوئے کہ لوگوں کی نگاہوں میں عام طور پر وہ توازن نہیں ہوتا جو دین اور دنیا دونوں کے فوائد و مصالح کو صحیح صحیح تول سکے۔ اس عدم توازن کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دینداری کی طرف میلان ہوا تو لوگ دین کو نری رہبانیت بنا کے رکھ دیتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ و جہاد خواہ کسی حالت میں بھی ہو ان کے ہاں خلاف تقویٰ قرار پاجاتا ہے اور اگر دنیا داری کی طرف میلان ہوگا تو جوئے اور شراب جیسی چیزوں کو بھی محض اس خیال کی بنا پر نیکی قرار دینے کی کوشش کریں گے کہ آخر ان میں بھی تو کچھ پہلو فائدے کے ہیں۔ قرآن نے فکر انسانی کی تربیت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ اس عدم توازن کو دور کرکے اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا حق صحیح صحیح پہچان سکے۔

"عفو" کے لفظ سے اشتراکی نظریات سے متاثر لوگوں نے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے کہ ناگزیر ضروریات سے فاضل آمدنی ایک اسلامی حکومت اجتماعی مقاصد کے لئے اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اول تو یہاں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام افراد سے ہے کہ وہ اپنی آزادی رائے سے اس حد تک ایثار کے لئے تیار رہیں، دوسرے یہ کہ اس چیز کا تعلق، جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، عام حالات سے نہیں ہے بلکہ ایمرجنسی کے حالات سے ہے جب ملت کے تحفظ کا سوال سامنے آن کھڑا ہو۔ ایسے حالات میں اول تو افراد خود ہی ہر طرح کی قربانیاں کرنے کے لئے تیار ہوجاتے ہیں اور اگر حکومت کوئی پابندی عاید کرنے کی ضرورت محسوس کرتی ہے تو اس میں بھی کوئی قباحت نہیں سمجھتے۔ اگرچہ اسلام کا حقیقی رجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر ارادہ اور اختیار کی آزادی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ اسلام کی نظر میں اس آزادی کی جتنی قدر ہے، اتنی قدر جبوری اور پابندی کی نیکی کی نہیں ہے۔

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَإِن تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ۚ

وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰہُ لَاَعْنَتَکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ○

یتامیٰ سے متعلق یہ سوال بھی اس معاشرتی خدمت و تعاون کے تعلق سے پیدا ہوا جس کی ہدایت آیت (۲۱۵) میں دی گئی ہے۔ اسلام نے جب ہر شخص پر اس کے والدین و اقربا کے ساتھ ساتھ یتامیٰ اور خاص کر خاندان کے یتامیٰ کی ذمہ داری بھی ڈالی کہ اگر وہ محتاج و بے وسیلہ ہوں تو ان پر خرچ کرو اور اگر ان کے پاس مال ہو تو پوری احتیاط کے ساتھ (حتی الامکان بلامعاوضہ) اس کی نگرانی اور اس کو نشو ونما دینے کی کوشش کرو تو لوگوں میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ایک شخص انتظامی سہولت کے پیش نظر کسی یتیم کے مال یا اس کے کاروبار کو اپنے مال اور کاروبار میں شامل کرے اور اس کے حقوق کی حفاظت کے پہلو سے ایسے یتیم کی ماں سے نکاح کر لے تو اس میں کوئی حرج تو نہیں ہے؟ یہ سوال خاص طور پر اس وجہ سے پیدا ہوا کہ اسلام کے یتیموں کے حقوق اور ان کے مال کے تحفظ سے متعلق جن احتیاطوں کی تاکید فرمائی ہے وہ بڑی ہی سخت ہیں۔ قرآن میں صاف ارشاد ہے کہ نیک مقصد کے سوا یتیموں کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکو، یہ بھی تنبیہ ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں، ایک متقی آدمی ان تنبیہات کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کی اجازت کے بغیر یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ یتیموں کے معاملات اور اپنے معاملات کو یکجا کر سکے۔

اس سوال کے جواب میں قرآن نے اصولی بات جو فرمائی وہ یہ ہے کہ "اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَیْرٌ" اصل مقصود یہ ہے کہ ہر پہلو سے یتیموں کی بہبود پیش نظر رہے جس چیز میں ان کی بہتری ہو وہی بہتر ہے۔ اگر تمہارے حالات کے لحاظ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ ان کے معاملات الگ رکھ کر ان کی دیکھ بھال کرو تو ایسا کرو، اور اگر محسوس کرو کہ اپنے ساتھ شامل کر کے زیادہ بہتر طریقہ سے یہ فرض انجام دے سکتے ہو تو تمہیں اس کی بھی اجازت دی جاتی ہے، آخر وہ تمہارے اپنے ہی بھائی بند تو ہیں، پھر علیحدگی کیوں لازم قرار دی جائے؟ لیکن اس اجازت کے ساتھ یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ، یعنی ہر شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس اشتراک سے کس کے پیش نظر یتیم کی بہبود ہے اور کس کے پیش نظر اس پردے میں اس کے مال کو ہڑپ کرنا۔ اگر کسی نے اس اجازت سے غلط فائدہ اٹھایا تو وہ یاد رکھے کہ خدا عزیز و حکیم ہے، کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکے گا۔ ساتھ ہی اس احسان کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ یہ محض اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے تمہاری سہولت کے پیش نظر تمہیں اس قسم کے اشتراک کی اجازت

دے دی ورنہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ تمہیں اس اشتراک سے روک دیتا اور ساتھ ہی یہ حکم دے دیتا کہ یتیم کے مال یا جائداد کی حفاظت کرو، اگر ایسا ہوتا تو تم ایک بڑی مشقت میں پڑ جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ بڑا کرم فرمایا کہ اس نے بغیر کسی مشقت میں ڈالے تمہارے لئے خدمت اور نیکی کی ایک راہ کھولی تو تم میں سے ہر شخص خدا کے اس احسان کا شکر گزار ہو اور اس اجازت سے کوئی غلط فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے۔

"عنت" کے معنی زحمت اور مشقت کے ہیں اور "اعنات" کے معنی مشقت میں ڈالنے کے ہیں۔ اس سے اسلامی شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے کہ اس شریعت نے مشقت میں ڈالنے کی نہیں بلکہ مشقتوں سے بچانے کی راہیں کھولی ہیں۔

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝

اُوپر یتیموں کی بہبود کے پہلو سے جس اشتراک کی اجازت دی گئی ہے اس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی یتیم کا ولی یتیم کے حقوق ہی کے تحفظ کے نقطہ نظر سے یہ مناسب خیال کرے کہ اس یتیم کی ماں سے نکاح کر لے تاکہ اس طرح ایک بیوہ کی پرورش اور اس کی حفاظت و عصمت کا انتظام بھی ہو جائے اور یتیم کے حقوق کی نگہداشت کے لئے اس کے گھر میں ایک بیدار نگاہ رکھنے والی بھی آ جائے تو اس کا حکم کیا ہے؟ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مصلحت بجائے خود اہمیت رکھنے والی ہے اور اس کو پیش نظر رکھ کر یتامیٰ کی ماں سے نکاح کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مومنہ ہوں۔ یہ شرط اس وجہ سے لگائی ہے کہ اس وقت تک صورت حال یہ تھی کہ بہت سے ایسے یتیم بھی تھے جن کی مائیں اسلام میں داخل نہیں ہوئی تھیں اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اس مصلحت کی خاطر بھی مشرکات سے نکاح کی اجازت بہر حال نہیں ہے کیونکہ اس سے دوسرے مفاسد کے پیدا ہونے کے اندیشے ہیں جن کی طرف آگے اشارہ فرمایا ہے۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ مشرکین اور مشرکات کا لفظ قرآن میں خاص عرب کے مشرکین اور مشرکات کے لئے بطور لقب یا علم کے استعمال ہوا ہے، دوسری قومیں جن میں شرک پایا جاتا ہے، خواہ وہ اہل کتاب میں

سے ہوں یا مشابہ اہل کتاب میں سے، وہ براہ راست اس لفظ کے تحت نہیں ہیں اس وجہ سے ان کے احکام کی تفصیل اپنی جگہ پر آئے گی۔

یہاں بنی اسمٰعیل کے مشرکین اور مشرکات سے متعلق یہ وضاحت فرمادی کہ نہ ان کی عورتوں کو اپنے نکاح میں لینا تمہارے لئے جائز ہے اور نہ اپنی لڑکیاں ان کو دینا جائز ہے۔ اس ممانعت کے ساتھ یہ وضاحت بھی بڑی تاکید کے ساتھ فرمادی کہ ایک مسلمان لونڈی ایک آزاد مشرکہ پر ترجیح رکھتی ہے اگرچہ وہ تمہیں کتنی ہی دلکش معلوم ہو، اسی طرح ایک غلام مومن ایک آزاد مشرک پر ترجیح رکھتا ہے، اگرچہ وہ تمہیں کتنا ہی بھلا لگتا ہو۔ پھر اس کی وجہ بتادی کہ اسلام میں پسند اور ناپسند کے لئے معیار نہ ظاہری شکل وصورت ہے، نہ نسل ونسب اور نہ آزادی اور غلامی بلکہ ایمان اور عمل صالح ہے۔ اس وجہ سے اب تمہارے رشتے ناتے ذاتوں اور برادریوں کے پابند نہیں رہ گئے بلکہ عقیدے اور عمل کے تابع ہو گئے ہیں، قریش کی ایک مہ جبین شہزادی تمہارے لئے دو کوڑی کی ہے اگر وہ ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں ہے اور سواحل افریقہ کی ایک کالی کلوٹی لونڈی تمہارے لئے حور جنت ہے اگر اس کا دل جمال ایمان و اسلام سے نورانی ہے۔ اسی طرح تمہارے لئے یہ بات تو جائز ہے کہ تم اپنی لڑکی کا ہاتھ ایک غلام زنگی کے ہاتھ میں پکڑا دو اگر وہ دولتِ ایمان رکھتا ہے اور قریش کے ایک صاحب شوکت سردار کو بھی اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دو اگر وہ ایمان واسلام سے محروم ہے۔

پھر اس کا فلسفہ بتایا کہ رشتے ناتے کے اثرات زندگی پر سطحی اور سرسری نہیں ہوتے بلکہ بڑے گہرے ہوتے ہیں، اگر آدمی ان چیزوں میں عقائد واعمال کو کوئی اہمیت نہ دے، صرف حسن، یا مال، یا خاندان یا مصلحت ہی کو سامنے رکھے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی خرچ پر اپنے گھر میں ایک ایسی بلا پال لے جو صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کی آئندہ نسلوں کے ایمان واسلام کا بیج بھی مار دے۔ شادی بیاہ کے تعلقات نے مذہب، روایات اور تہذیب وتمدن میں جو عظیم تبدیلیاں کی ہیں اس کی عملی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بے شمار عقائدی گمراہیاں ان عورتوں کے ذریعہ سے پھیلیں جو وہ دوسری بت پرست قوموں میں سے بیاہ کے لائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں مغل سلاطین نے ہندو راجوں کے ہاں سیاسی مصالح کے تحت جو شادیاں کیں تو ان کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد، اوہام، رسوم اور عبادت کے طریقے بھی اپنے گھروں میں گھسا

لائے۔ آج بھی جو لوگ قوموں اور مذہبوں کے امتیازی نشانات و نظریات کو ختم کرنے کے درپے ہیں وہ اس کا سب سے زیادہ کارگر نسخہ آپس کی شادیوں ہی کو سمجھتے ہیں اس وجہ سے ایک مسلمان کو اس معاملے میں بے پڑا اور سہل انگار نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس عظیم حقیقت کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ جس رب پر وہ ایمان رکھتا ہے اس کی دعوت مغفرت اور جنت کی طرف ہے اور جو لوگ اس ایمان سے محروم ہیں وہ دوزخ کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں، عام اس سے کہ عورت ہوں یا مرد۔

یہ آیت بھی چونکہ اُوپر کے مباحث کی وضاحت کے طور پر نازل ہوئی ہے اس وجہ سے آخر میں فرما دیا کہ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔ اور اللہ اپنی آیتوں کی وضاحت کر رہا ہے تاکہ لوگ یاددہانی حاصل کریں۔

اُوپر کی دو آیتوں میں یتامیٰ سے متعلق جو باتیں کہی گئی ہیں سورۂ نساء میں بھی ان کی طرف اشارے ہیں۔ ہم متعلق آیات یہاں نقل کئے دیتے ہیں تاکہ دونوں کو سامنے رکھنے سے ہر پہلو واضح ہو جائے۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ○	اور یتیموں کا مال ان کے حوالہ کرو اور ان کے اچھے مال کے بدلے اپنا بُرا مال نہ دو اور ان کے مال کو اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر نہ کھاؤ، یہ بہت بڑا گناہ ہے
وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتَامَىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَىٰ وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَلَّا تَعُولُوا ○	اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے ساتھ کما حقہٗ انصاف نہ کر سکو گے تو جو راضی ہوں عورتوں میں سے ان سے نکاح کر لو، دو دو، تین تین چار چار تک۔ اگر یہ اندیشہ ہو کہ عورتوں میں عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر قناعت کرو یا پھر جو تمہاری لونڈیاں ہوں۔ اور یہ زیادہ اس بات کے قرین ہے کہ تم عدل سے نہ ہٹو
وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا ○	اور ان عورتوں کو راضی خوشی ان کے مہر دو، اگر وہ اس کا کوئی حصہ تمہارے لئے بخوشی چھوڑ دیں تو اس کو باطمینان اپنے تصرف میں لاؤ۔
وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ○	اور بے وقوف یا نادان بچوں کو اپنا وہ مال حوالہ نہ کرو جو خدا نے تمہاری قیام معیشت کا ذریعہ

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ۝ (۶-۲ نساء)

بتایا ہے، البتہ اس میں ان کو کشادگی کے ساتھ کھلاؤ پہناؤ اور ان کو تسلی دیتے رہو اور یتیموں کو جانچتے رہو، جب وہ شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تو اگر تم ان میں معاملات کی سوجھ بوجھ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ کرو اور فضول خرچی اور جلد بازی کے ساتھ کہ کہیں وہ بڑے ہو جائیں ان کا مال ہڑپ نہ کرو۔ جو غنی ہو تو چاہیئے کہ وہ احتراز کرے اور جو محتاج ہو تو وہ دستور کے مطابق اس میں سے لے، پھر جب تم ان کا مال ان کے حوالہ کرنے لگو تو ان پر گواہ ٹھہرا لو، ویسے اللہ حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

۴۷۔ آگے کا سلسلۂ کلام (۲۲۲ - ۲۳۱)

اُوپر آپ نے دیکھا کہ کس طرح حج کے تعلق سے جہاد، جہاد کے تعلق سے انفاق، انفاق کے تعلق سے جوئے اور شراب اور ساتھ ہی یتامیٰ کی ہمدردی کے مسائل یکے بعد دیگرے پیدا ہو گئے، اسی طرح یتامیٰ کی ماؤں کے ساتھ نکاح کے مسئلہ نے ایک طرف تو طلاق و نکاح سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لئے تقریب پیدا کر دی اور دوسری طرف عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے تقاضے سے بعض احکام و ہدایات کے نزول کے لئے نہایت سازگار فضا پیدا ہو گئی اور قرآن مجید کا طریقہ یہی ہے کہ جب ایک بات کے بیان کے لئے موزوں حالات پیدا ہو گئے ہیں تو بارش کی طرح کلام ایک وسیع دائرے میں برس گیا ہے چنانچہ یہاں بھی متعلق مسائل کا ایک نہایت اہم حصہ بیان ہو گیا ہے۔ ان مسائل کا آغاز ایام ماہواری سے متعلق ایک سوال کے جواب سے ہوا ہے۔ اس خاص سوال کی اہمیت اس سلسلے میں یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے بہت سے مسائل کی، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا، یہی چیز حد بندی کرتی ہے اس وجہ سے اصل مسائل سے پہلے خود اس چیز سے متعلق شریعت کے احکام و ہدایات کا جاننا نہایت ضروری تھا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ

حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ
وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ۝۲۲۲ نِسَاۗؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا
لِاَنْفُسِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۲۲۳ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ
عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۴
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۲۲۵ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ
فَاۗءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۲۶ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۲۲۷ وَ
الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْۗءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ
اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ
فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ
عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝۲۲۸ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۠ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ
تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـــًٔا اِلَّآ اَنْ
يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا
فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ۭ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰۗىِٕكَ
هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۲۲۹ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ۭ فَاِنْ
طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۲۳۰ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاۗءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۠ وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ ھُزُوًا ۡ وَّاذْكُرُوْا نِعْمَتَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۲۳۱

اور وہ تم سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو: یہ ناپاکی ہے تو عورتوں سے حیض کے میں الگ رہو، اور ان سے قربت نہ کرو جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں۔ پس جب وہ صفائی کر

ان کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے، اللہ توبہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور
پاکیزگی اختیار کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ عورتیں تمہارے لئے بمنزلہ کھیتی ہیں تو اپنی کھیتی میں
جس طرح چاہو آؤ، اور اپنے لئے آگے بڑھاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ تمہیں اس سے
ضرور ملنا ہے اور ایمان والوں کو خوشخبری دے دو۔ ۲۲۲ - ۲۲۳

اور اللہ کو اپنی ایسی قسموں کا ہدف نہ بناؤ کہ احسان نہ کروگے یا حدود الٰہی کا احترام نہ کروگے
یا لوگوں کے درمیان صلح نہ کراؤ گے، اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ تم سے تمہاری عادی قسموں
کے باب میں تو کوئی مواخذہ نہیں کرے گا لیکن ان قسموں کے باب میں تم سے ضرور مواخذہ کرے گا
جو تمہارے دل کے ارادے کا نتیجہ ہیں اور اللہ بخشنے والا اور حلیم ہے۔ جو لوگ اپنی بیویوں سے نہ
ملنے کی قسم کھا بیٹھیں ان کے لئے چار ماہ کی مہلت ہے، اگر وہ رجوع کرلیں تو اللہ بخشنے والا، مہربان ہے،
اور اگر طلاق کا فیصلہ کرلیں تو اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۲۲۴ - ۲۲۵ - ۲۲۶ - ۲۲۷ -

اور مطلقہ عورتیں اپنے بارے میں تین حیض تک توقف کریں، اور اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان
رکھتی ہیں تو ان کے لئے جائز نہیں ہے کہ اللہ نے ان کے رحموں میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس کو چھپائیں۔
اور اس دوران میں ان کے شوہر ان کے لوٹانے کے زیادہ حقدار ہیں، اگر وہ سازگاری کے طالب
ہیں اور ان عورتوں کے لئے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر
ذمہ داریاں ہیں، ہاں مردوں کے لئے ان پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا
ہے۔ ۲۲۸

طلاق دو مرتبہ ہے پھر دستور کے مطابق یا تو روک لینا ہے یا احسان کے ساتھ رخصت کر
دینا ہے، اور تمہارے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم نے جو کچھ ان عورتوں کو دیا ہے اس میں سے
کچھ واپس لو۔ جو کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ حدود الٰہی کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ پس اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ دونوں
حدود الٰہی پر قائم نہیں رہ سکتے تو ان پر اس چیز کے باب میں کوئی گناہ نہیں ہے جو عورت فدیہ میں دے۔
یہ اللہ کے حدود ہیں تو ان سے تجاوز نہ کرو اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو وہی لوگ ظالم
ہیں۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو وہ عورت اس کے بعد اس کے لئے جائز نہیں ہے تاآنکہ
وہ اس کے سوا کسی دوسرے شوہر سے نکاح نہ کرے۔ پس اگر وہ اس کو طلاق دے دے تو پھر ان

دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ مراجعت کرلیں، اگر یہ توقع رکھتے ہوں کہ وہ اللہ کے حدود پر قائم رہ سکتے ہیں، یہ اللہ کے مقرر کردہ حدود ہیں، وہ ان کو واضح کر رہا ہے، ان لوگوں کے لئے جو علم کے طالب ہیں۔ ۲۲۹-۲۳۰

اور جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ پہنچ جائیں اپنی مدت کو تو ان کو دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق رخصت کردو اور تم ان کو نقصان پہنچانے کے ارادے سے نہ روکو کہ تم حدود سے تجاوز کرو اور جو ایسا کرے گا تو وہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا اور اللہ کی آیات کو مذاق نہ بناؤ اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو یاد رکھو اور اس کتاب و حکمت کو یاد رکھو جو اس نے تمہاری نصیحت کے لئے اتاری اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ۲۳۱

۷۵۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ۝

ایام ماہواری سے متعلق یہ سوال صرف اسی پہلو سے نہیں پیدا ہوا کہ اس زمانے میں عورت سے قربت جائز ہے یا نہیں، اس زمانے میں قربت تو نہ صرف تمام آسمانی مذہب میں ممنوع رہی ہے بلکہ عرب جاہلیت بھی اس کو ناجائز سمجھتے تھے، ان کے اشعار میں مختلف پہلوؤں سے اس کا ذکر ملتا ہے۔ البتہ اس سے متعلق دوسرے بہت سے مسائل تھے، جن میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی تھی مثلاً یہ کہ اس زمانے میں عورت سے اجتناب کے حدود کیا ہیں، اس کے لئے طہارت کے کیا آداب و شرائط ہیں اور طلاق و عدت وغیرہ کے معاملات میں اس کی اہمیت کیا ہے؟ بالخصوص مؤخر الذکر سوال کی بڑی اہمیت تھی اس لئے کہ اس کے اثرات نکاح، طلاق، عدت، وراثت اور دوسرے تقریباً تمام عائلی مسائل پر پڑتے تھے اس وجہ سے نکاح و طلاق کی اس بحث میں قرآن نے سب سے پہلے اسی سوال کو لیا اور اس کا جواب دیا۔

اس زمانے میں عورت سے علیحدہ رہنے (اعتزال) کا جو حکم دیا ہے اس کی صحیح حد آگے کے الفاظ

وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ (اور تم ان سے قربت نہ کرو، یہاں تک کہ وہ پاک ہو جائیں تو جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں تو ان کے پاس آؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے) سے خود واضح ہو رہی ہے کہ یہ علیحدگی صرف زن و شو کے خاص تعلق کے حد تک مطلوب ہے، یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو بالکل اچھوت بنا کے رکھ دو۔ جیسا کہ دوسرے مذاہب میں ہے۔ اس چیز کی وضاحت احادیث اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہوئی ہے۔

اس آیت میں "طہر" اور "تطہر" دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ طہر کے معنی تو یہ ہیں کہ عورت کی ناپاکی کی حالت ختم ہو جائے اور خون کا آنا بند ہو جائے اور تطہر کے معنی یہ ہیں کہ عورت نہا دھو کر پاکیزگی کی حالت میں آ جائے۔ آیت میں عورت سے قربت کے لئے طہر کو شرط قرار دیا ہے اور ساتھ ہی فرما دیا ہے کہ جب وہ پاکیزگی حاصل کر لیں تب ان کے پاس آؤ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ چونکہ قربت کی ممانعت کی اصلی علت خون ہے اس وجہ سے اس کے انقطاع کے بعد یہ پابندی تو اُٹھ جاتی ہے لیکن صحیح طریقہ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لے تب اس سے ملاقات کرو۔

"فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ" (تو ان کے پاس آؤ، جہاں سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں حکم دیا ہے) سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ تمام بدیہیات فطرت اللہ کے اوامر میں شامل ہیں اور اس پہلو سے وہ شریعت الٰہی کے اجزاء ہیں اگرچہ لفظوں میں خدا کی طرف سے ان کا حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو۔ مثلاً یہ کہ اگرچہ اس بات کا کہیں حکم نہیں دیا گیا ہے کہ لقمہ مُنہ میں ڈالنا چاہیئے، ناک یا آنکھ میں نہیں ڈالنا چاہیئے، تاہم یہ خدا کا حکم ہے اس لئے کہ فاطر نے ہماری فطرت یہی بنائی ہے، اگر کوئی شخص اس کی خلاف ورزی کرے تو در حقیقت وہ خدا کے ایک واضح بلکہ واضح تر حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے اور اس پر وہ خدا کے ہاں سزا کا مستحق ہوگا۔ ہم نے اس کو واضح کے بجائے واضح تر اس لئے قرار دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح کے معاملات کو صرف اسی لئے ہماری فطرت پر چھوڑ دیا ہے کہ ہماری فطرت ان کی وضاحت کی وجہ سے ان میں کسی رہنمائی کی محتاج نہیں تھی۔ بعینہٖ یہی معاملہ محل مباشرت کا ہے، اگر کوئی شخص اس میں اندھے پن کا ثبوت دیتا ہے تو وہ حیوانات سے بھی گیا گزرا ہے اس لئے کہ وہ اس میں کوئی غلطی نہیں کرتے اگرچہ وہ کسی قرآن اور کتاب سے آشنا نہیں ہیں۔

"إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ" توبہ اور تطہر کی حقیقت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا

کہ تو یہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے۔ اس اعتبار سے ان دونوں کی حقیقت ایک ہوئی اور مومن کی یہ دونوں خصلتیں اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ ان سے محروم ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں۔ یہاں جس سیاق میں یہ بات آئی ہے اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ جو لوگ عورت کی ناپاکی کے زمانے میں قربت سے اجتناب نہیں کرتے یا اقتضائے شہوت کے معاملے میں فطرت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ اللہ کے نزدیک نہایت مبغوض ہیں۔ احادیث میں اس بات کی وضاحت موجود ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ ۖ وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُم مُّلَاقُوهُ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

"حرث" کے معنی عربی میں کھیتی کے ہیں، عام اس سے کہ وہ باغوں کی نوعیت کی ہو یا دوسری فصلوں کی۔ عورتوں کے لئے کھیتی کے استعارہ میں ایک سیدھا سادا پہلو تو یہ ہے کہ جس طرح کھیتی کے لئے قدرت کا بنایا ہوا یہ ضابطہ ہے کہ تخم ریزی ٹھیک موسم میں اور مناسب وقت پر کی جاتی ہے، نیز بیج کھیت ہی میں ڈالے جاتے ہیں کھیت سے باہر نہیں پھینکے جاتے، کوئی کسان اس ضابطے کی خلاف ورزی نہیں کرتا اسی طرح عورت کے لئے فطرت کا یہ ضابطہ ہے کہ ایام ماہواری کے زمانے میں اور کسی غیر محل میں اس سے قضائے شہوت نہ کی جائے اس لئے کہ حیض کا زمانہ عورت کے جمام اور غیر آمادگی کا زمانہ ہوتا ہے، اور غیر محل میں مباشرت باعث اذیت و اضاعت ہے، اس وجہ سے کسی سلیم الفطرت انسان کے لئے اس کا ارتکاب جائز نہیں۔ اپنے اس پہلو سے یہ آیت اوپر والی آیت کی گویا توضیح مزید ہوئی۔

"فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ" (پس اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو آؤ) میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو اس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی کے مالک کو اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے اور دوسری اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک باغ یا کھیتی والا اپنے باغ یا کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اس دوسری چیز کی طرف "حرث" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف "أَنَّىٰ شِئْتُمْ" کے الفاظ۔ وہ آزادی اور یہ پابندی، یہ دونوں چیزیں مل کر اس رویہ کو معین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو بیوی کے معاملہ میں اختیار کرنا چاہیئے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ازدواجی زندگی کا سارا سکون و سرور فریقین کے اس اطمینان میں ہے کہ ان

کی نعمت کی آزادیوں پر فطرت کے چند موٹے موٹے قیود کے سوا کوئی قید، کوئی پابندی اور کوئی نگرانی نہیں ہے۔ آزادی کے اس احساس میں بڑا کیف اور بڑا نشہ ہے۔ انسان جب اپنے عیش و سرور کے اس باغ میں داخل ہوتا ہے تو قدرت چاہتی ہے کہ وہ اپنے اس نشہ سے سرشار ہو لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے قدرت نے رکھ دی ہے کہ یہ کوئی جنگل نہیں بلکہ اس کا اپنا باغ ہے اور یہ کوئی ویرانہ نہیں بلکہ اس کی اپنی کھیتی ہے، اس وجہ سے وہ اس میں آنے کو تو سو بار آئے اور جس شان، جس آن، جس سمت اور جس پہلو سے چاہے آئے لیکن اس باغ کا باغ ہوتا اور اس کھیتی کا کھیتی ہونا یاد رکھے، اس کے کسی آنے میں بھی اس حقیقت سے غفلت نہ ہو۔

اپنی کھیتی سے متعلق ہر کسان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس سے اسے برابر نہایت اچھی فصل حاصل ہوتی رہے، مناسب وقت پر اس میں ہل چلتے رہیں، ضرورت کے مطابق اس کو کھاد اور پانی ملتا رہے، موسمی آفتوں سے وہ محفوظ رہے، آیند و روند، چرند و پرند اور دشمن اور چور اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں، جب وہ اس کو دیکھے تو اس کی طراوت و شادابی اس کو خوش کر دے اور جب وقت آئے تو وہ اپنے پھلوں اور پھولوں سے اس کا دامن بھر دے۔

قرآن نے عورت کے لئے کھیتی کے استعارے میں یہ ساری باتیں جمع کر دی ہیں اور اس استعارے نے ان لوگوں کے نظریے کی تو جڑ ہی کاٹ دی ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیمیں چلاتے ہیں۔ اس لئے کہ کھیتی سے متعلق یہ رہنمائی تو معقول قرار دی جا سکتی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی سے اچھی پیداوار کس طرح حاصل کی جائے لیکن یہ بات بالکل غیر منطقی ہے کہ لوگوں کو اس بات کے سبق پڑھائے جائیں کہ وہ بیج تو زیادہ سے زیادہ ڈالیں لیکن فصل کم سے کم حاصل کریں۔ اس قسم کی نامعقول منطق صرف نادانوں ہی کو سوجھ سکتی ہے۔

وَقَدِّمُوا لِأَنْفُسِكُمْ، (اور اپنے لئے آگے بڑھاؤ) کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح زمین کی کھیتی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے تم اپنے مستقبل کی معاش کا انتظام کرو اسی طرح عورت کی کھیتی کی اصلی غایت یہ ہے کہ اس سے تم نسل انسانی کے مستقبل میں اپنی جگہ محفوظ اور اس کے قیام و بقا میں اپنا حصہ ادا کر سکو۔ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ، کے بعد ان الفاظ کے اضافے نے یہ حقیقت نہایت واضح الفاظ میں سامنے رکھ دی کہ عورت سے مواصلت کی اصل غایت ابقائے نسل ہے، لذت اس کا صرف ضمنی فائدہ ہے، اس

وجہ سے ہر وہ طریقہ جو اس مقصد کو ضائع کرنے والا یا اس کو نقصان پہنچانے والا ہو اگرچہ لذت کے تقاضے اس سے پورے ہو جاتے ہوں، فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے تقاضوں کے بالکل خلاف ہے۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان جس طرح اپنی اولاد کے ذریعہ سے نسل انسانی کے اندر اپنا ایک مقام محفوظ کرتا ہے اسی طرح ان کے ذریعہ سے اگر وہ ان کی اچھی تربیت کرسکے آخرت میں بھی اپنے سرمائے میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے اس لئے کہ اولاد صالح کی نیکی ایک خیر جاری ہے جس کا سلسلہ آدمی کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ احادیث میں اس کی دلیل موجود ہے۔ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ میں یہ دونوں ہی پہلو موجود ہیں۔

بعض اہل تاویل نے اس کی تاویل اس سے مختلف کی ہے لیکن ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی سورہ میں، دوسری جگہ اس طرح وارد ہے۔ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْھُنَّ وَابْتَغُوْا مَاکَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ ۱۸۷۔ بقرہ (پس اب تم ان سے مباشرت کرو، اور وہ چیز چاہو جو اللہ نے تمہارے لئے مقدر کی ہے) اس آیت کی تاویل اُوپر گزر چکی ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّکُمْ مُّلٰقُوْہُ (اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ بالآخر تمہیں اس سے ملنا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم فطرت کے ان قوانین اور اللہ کے ان حدود کو آج خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی توڑ سکتے ہو اور تمہیں اس کی مہلت ملی ہوئی ہے لیکن یاد رکھو کہ ایک دن تمہیں خدا کو بھی منہ دکھانا ہے جس کی آنکھیں تمہیں ہر جگہ دیکھ رہی ہیں اور جس کی پکڑ سے تمہیں کوئی بھی نہ بچا سکے گا۔ اس دھمکی کے ساتھ ان اہل ایمان کو بشارت بھی دے دی جو نفس کی تمام ترغیبات کے باوجود اس امر کو یاد رکھتے ہیں کہ ایک دن انہیں اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ

ضروری نوٹ:۔

اگست ۱۹۶۳ء سے غلطی سے تفسیر سورۂ بقرہ کا قسط نمبر غلط شائع ہو رہا ہے۔ قارئین کرام اس حالیہ شمارہ کے مطابق تصحیح فرمالیں۔

(ادارہ)

افاداتِ فراہی

جناب خالد مسعود صاحب

نبی اور مقامِ رسالت

قرآن مجید اور دوسرے آسمانی صحیفوں پر گہری نگاہ رکھنے والے شخص سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہتی کہ انبیائے کرام کا گروہ انسانوں کا وہ گروہ تھا جس کی بشریت کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور رب فیاض نے ان کی انفرادی استعداد کے مطابق ان پر وحی بشری کا فیضان کیا تھا۔ فطرت انسانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اور قرآن بھی اس کی خبر دیتا ہے، کہ انسان کی تخلیق کے وقت خدا نے اس کے اندر روح قدسی پھونک کر اسے عزت بخشی۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان کو ایک عادل و رحیم رب کے وجود کا الہام کیا گیا ہے جس کی تعبیر ذیل کی آیات سے ہوتی ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ (فاتحہ ۱ – ۳)

شکر حقیقی کا مستحق اللہ ہے جہانوں کا رب، رحمان و رحیم، روز جزا کا مالک۔

یہ الہام کثیف نفوس میں تو دب جاتا ہے، لیکن جہاں تک پاکیزہ طبیعت اور صحیح فطرت رکھنے والے انسانوں کا تعلق ہے، انہیں اس حقیقت کا اتنا واضح یقین ہوتا ہے کہ اس میں شک و تردد کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ انسان جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبوت کے منصب پر فائز کئے جاتے ہیں، پہلے سے جزا و سزا اور عدل و قسط پر یقین رکھتے ہیں اور ظلم اور کفران نعمت سے اپنا دامن بچائے رکھتے ہیں ان کے دلوں میں نبوت سے پہلے بھی مخلوقات کے لئے رحم و شفقت اور رب منعم کے لئے عبودیت و توکل کے جذبات موجزن ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کو بچپن ہی سے خدا کی صفت عدل پر پورا یقین تھا

اور وہ اپنے بھائیوں کی زیادتی [illegible] سے واقف تھے، اس لئے جب ان کے بھائیوں نے انہیں اندھے کنوئیں میں پھینکا تو فوراً انہیں اشارہ ہوا کہ بھائیوں کا ظلم کسی روز آشکارا ہو کے رہیگا۔ قرآن میں ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبُوا بِهِ وَأَجْمَعُوا أَنْ يَجْعَلُوهُ فِي غَيَابَتِ الْجُبِّ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِأَمْرِهِمْ هَٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۝ (یوسف ۱۵)

پھر جب وہ اس کو لے کر گئے اور اس کو اندھے کنوئیں میں پھینکنے کا فیصلہ کر لیا تو ہم نے اس کی طرف وحی کی کہ تو ان کی اس کرتوت سے انہیں ضرور باخبر کرے گا اور وہ شعور نہ رکھتے ہوں گے۔

اسی طرح حضرت موسٰی علیہ السلام ابھی نوعمر ہی تھے کہ ایک مظلوم کی نصرت وحمایت کے جذبے کے تحت انہوں نے ایک ظالم قبطی کو مُکا رسید کر دیا۔ دوسرے انبیائے کرام کے حالات میں بھی اسی طرح کے واقعات ملتے ہیں۔

بندہ جب اپنے رحیم پروردگار کو پہچان لیتا ہے اور اس حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے کہ وُہ خدا کی نعمتوں کی بدولت زندہ ہے تو اس کے اندر شکر کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، وہ خدا کے عدل پر بھروسہ کرتا ہے اور قیامت کی جزا و سزا کے ایک شدنی امر ہونے کا یقین کر لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بندہ ہر طرف سے کٹ کر خدا کا ہو رہتا ہے، اس کی مقرر کردہ بندشوں میں رہ کر تسکین پاتا ہے اور تمام معاملات میں اسی کی مدد کا طالب ہوتا ہے۔ بندے کی اسی کیفیت کو اس دُعا سے تعبیر کیا گیا ہے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ (فاتحہ - ۴)

ہم تیری ہی بندگی کرتے اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

اس وقت آدمی کی سب سے اہم و برتر حاجت، جس کا وہ خدا سے سوال کرتا ہے، یہ ہوتی ہے کہ وہ اسے عدل کے ان رستوں پر چلائے جو پروردگار کے ہاں پسندیدہ ہیں۔ انہی رستوں پر چل کر اطاعت وعبودیت کا وہ مقصود حاصل ہوتا ہے جس کا تقاضا مخلوقات سے کیا گیا ہے۔ اس طریقہ سے آدمی خدا کے مطیع بندوں کے نقشِ قدم پر چلتا اور گمراہی کے ان گڑھوں میں گرنے سے بچ جاتا ہے جو رب سے اس کو دُور کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہی حقیقت ذیل کی آیات میں بیان ہوئی ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ صِرَاطَ

ہمیں سیدھے راستے پر چلا یعنی عدل وحق کے

الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ○ (فاتحہ ۵، ۶)	راستے پر جو خدا تک پہنچاتا ہے) ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام کیا (یعنی وہ انصاف پسند لوگ جن کو خدا نے اپنے راستے پر چلنے کی توفیق دی) نہ

ان کا جن پر غضب ہوا (کیونکہ انہوں نے علم ہونے کے بعد حق کو چھوڑا اور اس پر دنیوی زندگی کو ترجیح دی) اور نہ گمراہوں کا (جن کے دل بداعمالی کے سبب سے سیاہ ہو گئے، انہوں نے علم کے دروازے اپنے اُوپر بند کر لئے اور جانوروں کی طرح اندھے بہرے بن گئے)۔

اسی سیدھے راستے کی ہدایت وہ کامل بشری وحی ہے جو فطرت انسانی کے کمال کے مطابق حاصل ہوتی ہے۔ ایک طاہر و مطہر نفس اپنی پاکیزہ فطرت کے باعث اسے سنتا ہے کیونکہ صرف پاکیزہ فطرت ہی روح قدسی کا مہبط بن سکتی ہے۔

نبی جب اس فطری الہام سے بھر چکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف وحی کا اضافہ کر دیتا ہے تاکہ وہ ظالم لوگوں کو تنبیہہ کرے۔ نبی کی تعلیم کی ابتدا توحید اور قیامت کی جزا و سزا کے تصور سے ہوتی ہے، جس کی بنیاد شکر اور جس کا ضد کفر ہے۔

نبی اپنی ذات میں ایک پیغام ہوتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں اس کا ذکر پیغام کے بدل کے طور پر آیا ہے۔ سورہ طلاق میں ہے۔

قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ○ (طلاق ۱۰)	اللہ نے تمہاری طرف ذکر نازل کیا ہے یعنی رسول جو تمہیں اللہ کی واضح آیات پڑھ کر سناتا ہے تاکہ تمہیں تاریکی سے روشنی کی طرف نکالے

اسی لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے جواب میں کہا کہ آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ یعنی قرآن کے آئینہ میں حضور کا عکس دیکھ لو۔ جو کچھ اس میں ہے وہ آپ کے اخلاق کے موافق ہے۔ یہ حقیقت بالکل اسی طرح ہے جس طرح ایک فنکار کی تصویر میں اس کا ذہن جھلکتا ہے۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی وحی ہے لیکن نبی کے اخلاق سے پوری مطابقت رکھتی ہے کیونکہ خدا کا کلام اسی شخص پر نازل ہوتا ہے جس کے اندر اس

کے قبول کرنے کی پوری استعداد ہو۔

قرآن میں رسول کا لفظ "ذکر" کے بدل کے طور پر بالکل اسی طرح آیا ہے جس طرح "عذاب" ا
بدل فرعون آیا ہے۔ فرمایا

وَلَقَدْ نَجَّيْنَا بَنِيْ إِسْرَآئِيْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِيْنِ مِنْ فِرْعَوْنَ إِنَّهُ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ ٥ (دخان)	ہم نے بنی اسرائیل کو ذلت کے عذاب یع فرعون سے نجات دی۔ بلاشبہ وہ حد سے گز والوں میں کا ایک جابر تھا۔

یہاں بھی یہ حقیقت ظاہر کرنی مقصود ہے کہ فرعون مجسم عذاب تھا۔

بعثتِ انبیاء کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انبیاء بھیجنے کا سلسلہ کیوں شروع فرمایا؟ یہ ایک اہم سوال ہ
ہمارے نزدیک اس سوال کا یہ جواب صحیح نہیں کہ انسان کی عقل خدا کی معرفت اور عدل کے تص
سے خالی تھی، اس لئے خدا نے انبیاء کو اس کی ہدایت پر مامور فرمایا۔ یہ دونوں چیزیں تو عقل انسا
میں موجود تھیں۔ انبیاء صرف ان کی یاد دہانی کرانے کے لئے آئے۔ مزید برآں ان کی بعثت کا ایک
مقصود یہ بھی تھا کہ انسان کے لئے حقیقت کے دو گواہ ہوں، ایک اس کے باطن میں عقل، دو
خارج میں وحی۔ تاکہ ہدایت حاصل کرنے کے متنوع ذرائع کی موجودگی میں اس پر خدا کی حجت تما
ہو سکے۔ اس حقیقت کو سورہ انعام میں یوں بیان فرمایا ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰى أَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ أَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ذٰلِكَ أَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ	اے گروہ جن و انس، کیا تمہاری طرف تمہی میں سے رسول نہیں آئے جو تمہیں میری آیا سناتے تھے اور اس دن کی ملاقات سے تمہیں متن کرتے تھے۔ وہ کہیں گے، ہم اپنے اوپر گواہ ہیں دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکے میں رکھا اور د اپنے خلاف یہ گواہی دیں گے کہ وہ کافر تھے۔ اس لئے ہے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے گناہ

اَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ○ — کے سبب سے اس حال میں ہلاک کرنے والا نہیں جبکہ وہ بے خبر ہوں۔ (انعام-۱۲۹)

دوسری جگہ فرمایا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ○ (نساء-۱۶۵)

اور بھیجے رسول بشارت دینے والے اور تنبیہہ کرنیوالے تاکہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس خدا کے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

گویا حق و باطل میں فرق کرنے کے لئے تو اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت میں بصیرت ودیعت کر دی لیکن ہم پر مزید فضل یہ فرمایا کہ تنبیہہ و تذکیر کے لئے رسول بھیجے۔

ایک عقلمند آدمی جب یہ دیکھتا ہے کہ دُنیا میں خواہشات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھائے ہُوئے ہیں، عقل کی گمراہیاں پھیلی ہُوئی ہیں اور نفس کی تربیت کے سلسلہ میں ارباب عقل کی رائیں باہمدگر مختلف ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے رسول بھیج کر راہ ہدایت روشن رکھی ہے۔ وہ اسی کو ذریعہ نجات سمجھ کر مطمئن ہوجاتا ہے، اسی پر ثابت قدم رہتا ہے اور اسی کا مطیع و فرمانبردار ہوتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں نجات کا راستہ اس کے لئے آسان ہوجاتا ہے اور وہ امن چین اور قلبی اطمینان کے ساتھ اس پر اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ ہدایت کے نقطہ نظر سے اس شخص کے لئے نبی کا وجود اسی طرح غنیمت ہوتا ہے جس طرح دُنیا کے مسائل میں اسٹیٹ کا وجود غنیمت ہوتا ہے جو ملک میں احکام عدل کے نفاذ کا باعث ہوتی ہے اور جس کے تحت رہتے ہوئے ہر شخص کا مفاد حاصل ہوتا اور تہذیب و تمدن جس سے ترقی پاتا ہے۔

جو شخص نبوت کی ضرورت کا منکر ہو، اس کی مثال اس شخص سے بھی بدتر ہے جو اسٹیٹ کی ضرورت کا قائل نہ ہو اور معاشرت و تمدن جیسے فطرت انسانی کے اہم ترین تقاضوں کو ختم کرنے کی دعوت دیتا ہو۔ اگر حقیقت یہی ہوتی کہ نیکوکاروں کے لئے انبیاء کا وجود اسی طرح ضروری نہ ہوتا جس طرح بادشاہوں کا وجود ضروری ہے تو ہمیں تاریخ انسانی میں ریاست اور نبوت دونوں کا پہلو بہ پہلو وجود نظر نہ آتا۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ پایا جانا ہی اس بات کا ثبوت مہیا کرتا ہے کہ انسان کی فطرت میں

دونوں کا داعیہ موجود ہے اور انسان اصلاً عدل کو پسند کرتا ہے، یوم آخرت کے وقوع اور عملوں کی جزا پر یقین رکھتا ہے اور ایک عادل خدا کو مانتا ہے۔

باقی رہا یہ اعتراض کہ اگر انسان کی اصل فطرت یہی تھی تو دنیا میں گمراہی و سرکشی کے علمبرداروں کا وجود کیا معنی ؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ جس طرح ریاست کے باغیوں، ملک میں فساد پھیلانے والوں اور رعایا پر ظلم کرنیوالے جابر حکمرانوں کے پائے جانے سے انسان کے اندر عدل کی فطرت کی نفی نہیں ہوتی، اسی طرح گمراہوں اور بدکرداروں کے وجود کی بنا پر انسان کی نیکی کی فطرت کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح کے لوگ ہمارے نزدیک ایک بیماری میں مبتلا ہیں جبکہ فطرت انسانی ان امور پر مشتمل ہے جن کا تقاضا ایک انسان اپنی صحت کی حالت میں کرتا ہے۔ اور اُوپر ہم واضح کر چکے ہیں کہ توحید انسان کی اصل فطرت ہے۔

انبیاء کی ضرورت کے بارے میں دو باطل نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ فطرت انسانی کو اس سے زیادہ اہمیت دیتا ہے جس اہمیت کی وہ واقعی مستحق ہے۔ یہ لوگ انبیاء کی ضرورت کے قائل نہیں۔ دوسرا گروہ فطرت کو اس کے اصل مقام سے گرا کر یہ کہتا ہے کہ انسان کے فطری شر اور نفس کی ناپاکی کے باعث نجات کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ دونوں گروہ انسان کی فطرت کو اس کی اصل شکل میں نہیں دیکھتے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ مخلوقات کے معاملات محض امکان یا اتفاق پر منحصر نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قوتوں میں اضافہ پہ اضافہ کر کے ان پر احسان کرتا ہے۔ مثلاً وُہ چاہتا تو کھانے کی ایک ہی قسم پیدا کرتا یا روزی کمانے کا ایک ہی ذریعہ مقرر کر دیتا۔ اسی طرح اگر وہ انسانوں کو ایک آنکھ اور ایک کان عطا کرتا تو انہیں اسی پر قناعت کرنی پڑتی لیکن اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بندوں کو اَن گنت نعمتیں عطا کرتا ہے اور بے شمار امور میں دوسری مخلوقات پر ان کو فضیلت بخشتا ہے۔ ہدایت کے معاملہ میں بھی اس نے انسانوں کیلئے متعدد اسباب ہدایت پیدا کئے اور اسے صرف فطرت ہی پر نہیں چھوڑ دیا۔ اس طرح اس نے ایک طرف تو انسان پر اپنی نعمت تمام کی اور دوسری طرف اس پر حجت قائم کی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر وہ ہدایت کے معاملہ میں محض فطرت کی بنیاد پر انسانوں کا مواخذہ کرتا تو یہ بھی عدل ہوتا کیونکہ آسمان و زمین خدا کی نشانیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن اس نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ رسُول اور کتابیں بھیج کر ان پر مزید احسان فرمایا۔ قرآن

یں شریعت کو نعمت قرار دینے[1] کی ایک وجہ یہ بھی ہے ۔ رسول بندگان الٰہی کو ان لوگوں کے بُرے اعمال کی تقلید سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں جو نیکی کے راستے سے ہٹ کر چلتے ہیں اور جو اپنے حقیقی آقا اور مولیٰ سے منہ موڑے ہوئے ہوتے ہیں ۔

اب اگر کوئی شخص رسولوں کی بات پر دھیان نہیں دیتا حالانکہ وہ پورے جذبہ خیر خواہی، پوری وضاحت اور نہایت قطعی دلائل کے ساتھ کہی جا رہی ہے تو وہ خود اپنے آپ کو ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے ۔ اور اس پر وہ خود ہی ملامت کا مستحق ہے نہ کہ کوئی اور ۔ اولاً تو وہ خود اپنے آقا سے بھاگا ہے ۔ ثانیاً وہ بلانے والے کی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں ہے ۔ ثالثاً وہ ان تمام بُرے نتائج کا منکر ہے جو اس کی شرارت کی پاداش میں اس کے سامنے آنے والے ہیں ۔

نبی کی بعثت قوم کا یومِ حساب ہوتا ہے

یہ بھی جاننا چاہیئے کہ کسی قوم میں نبی کی بعثت ان کے لئے حساب اور فیصلہ کے دن کی حیثیت رکھتی ہے ۔ یہ بات قرآن سے بھی واضح ہوتی ہے اور دوسرے صحیفوں سے بھی اسی کی تصریح ہوتی ہے ۔ لہٰذا بعثت کے بعد باطل پر حق کے غلبہ کا وقت قریب آجاتا ہے ۔ قوم کے اس بحران کے زمانہ میں تین حالتوں میں سے کوئی نہ کوئی حالت ضرور ظہور میں آجاتی ہے ۔

---

[1] مثال کے طور پر حسب ذیل آیات ملاحظہ کیجئے :

۱ - يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ (بقرہ - ۴۷)	اے بنی اسرائیل میرے اس انعام کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور میں نے تم کو دنیا والوں پر فضیلت دی ۔

اس آیت میں اس نعمت کا حوالہ دیا گیا ہے جو بنی اسرائیل کو شریعت عطا کر کے برگزیدہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوئی

۲ - وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ (مائدہ - ۷)	اور یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو اور اس کے اس عہد کو جو اس نے تمہارے ساتھ ٹھہرایا ۔

اس آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے، انہیں نعمت شریعت کا احساس دلایا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ شریعت اللہ تعالیٰ کے درمیان اور ان کے درمیان ایک معاہدہ کی حیثیت رکھتی ہے ۔ (مترجم)

چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار بخشا ہے اس لئے اس نے اختیار سے فائدہ اُٹھانے کے لئے ایک وسیع مدت مقرر کردی ہے۔ اس مدت میں انسان اپنی طبعی خباثتیں خوب نکال لیتا ہے جب ایک قوم فطرت کی حدوں کو پامال کرتی چلی جاتی ہے اور باطل ہی کی طرف جھک کر اسی میں غوطہ زن ہوجاتی ہے تو خدا اس کی آزمائش کا پیمانہ لبریز کر دیتا ہے، عدل وجزا کے ظاہر ہونے کا وقت آجاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس قوم کو تباہ کرکے کسی دوسری قوم کو زندگی بخشتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور پیغمبر عالمؐ کی بعثت میں یہی معاملہ پیش آیا۔ حضرت یعقوبؑ اور حضرت ابراہیمؑ کی ذریت کے انتقام میں فرعون اور کسریٰ کی قومیں مٹا دی گئیں۔

کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی شرارتوں کی پاداش میں ہلاک کردی جاتی ہے مگر اس کی ذریت میں سے خدا ایک نئی اُمت برپا کر دیتا ہے۔ اور یہی جماعت ہلاک ہونے والوں کی جگہ زمین کی وارث بنتی ہے۔ یہ عمل بالکل اسی طرح کا ہے، جس طرح کا عمل ہمیں حیوانات و نباتات میں نظر آتا ہے۔ ان کے لئے ایک مُدت مقرر ہے۔ جب یہ مدّت ختم ہوجاتی ہے تو نئی نسل ان کی قائم مقام بن جاتی ہے۔ اکثر انبیاء کی اُمتوں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم اپنی سرکشی کے سبب سے تباہی اور ہلاکت کی آخری منزلوں تک پہنچ جاتی ہے مگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کی غفلت پر گرفت نہیں کرتا۔ پھر یہ قوم ایک نیک پیغمبر کی دعوت سے چوکنی ہوجاتی ہے، اس کا ایک حصّہ خدا کے آگے عاجزی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان کو برکت دیتا ہے اور باقی قوم پر حجت تمام کرنے کے لئے انہی لوگوں کو منتخب کرلیتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت یونسؑ، حضرت یوسفؑ اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔

بہرحال نبی کی بعثت کے ساتھ ہی عدل کے ظہور کا وقت قریب آجاتا ہے اور نبی کی ذات گویا عدل وحساب کا مظہر ہوتی ہے۔ اسی لئے فرمایا

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ — حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل
إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا — مٹنے ہی والی چیز ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی طرف قرآن مجید کی متعدد آیات میں اشارات کئے گئے ہیں۔ سورۂ یونسؑ

میں ہے -

اِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِىَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِىْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝

(یونس ۴۶ - ۴۹)

یا تو جس چیز کی ہم ان کو دھمکی دے رہے ہیں، اس میں سے کچھ ہم تم کو دکھا دیں گے یا یہ ہوگا کہ ہم تم کو توفات دیں گے اور ان کا پلٹنا ہماری طرف ہوگا۔ پھر اللہ ان کے اعمال پر گواہ ہوگا۔ ہر اُمت کے لئے ایک رسول ہے۔ جب ان کا رسول آجاتا ہے تو عدل کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی جاتی۔ وہ کہتے ہیں اگر تم سچے ہو تو بتاؤ یہ دھمکی کب پوری ہو گی۔ کہہ دو میں تو اپنی جان کے لئے بھی کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں۔ مگر جو اللہ چاہے۔ ہر اُمت کے لئے ایک اجل معین ہے۔ جب ان کی اجل آ جائے گی، نہ ایک گھڑی پیچھے ہٹیں گے، نہ ایک گھڑی آگے بڑھیں گے۔

گویا انبیاء کی بعثت کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو اُمت صالح اور نیکوکار ہے وہ زندگی اور حیات کے ولولوں سے معمور ہو جائے اور جو قوم راہِ حق و ہدایت سے ہٹ کر گمراہیوں اور شرارتوں میں پڑ چکی ہے وہ تباہ ہو جائے۔ اور یہ بات حق و باطل کی کشمکش کے لازمی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ ظہور میں آجاتی ہے۔

نبی کا مخصوص معیارِ کارکردگی

چونکہ نبی کی ذات خدا کے عدل کا مظہر اور اس کی بعثت کا زمانہ قوم کی عدالت کا زمانہ ہوتا ہے، اس لئے اللہ تعالٰے نبی کے مواخذہ میں بھی کمالِ عدل کا اظہار فرماتا ہے۔ اس پر ان معاملات میں بھی گرفت کی جاتی ہے جن معاملات پر دوسروں سے اس شدت سے گرفت نہیں کی جاتی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ کو شفقت پر، حضرت داؤدؑ کو تمنا پر اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو محبت و رافت پر عتاب ہوا۔ اور حضرت یونسؑ کا حیا پر اور حضرت سلیمانؑ کا جہاد فی سبیل اللہ کی تیاریوں میں حد درجہ انہماک پر محاسبہ کیا گیا۔

انبیاء پر شدید گرفت کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو دنیا میں پاکیزہ رکھنا اور برائی میں پڑنے سے بچانا چاہتا ہے۔ ہم انبیاء کے مواخذہ کے ذکر کے لئے یہاں اسی پر اکتفا کرتے ہیں، اس کی تفصیل آگے "عصمت انبیاء" کی بحث میں آئے گی۔

خود انبیاء کی فطرت بھی چونکہ عدل پر ہوتی ہے اس لئے وہ پروردگار کے ہاں تقرب کے باعث تمام لوگوں سے زیادہ خدا خوفی رکھنے والے اور عاجزی کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے احساسات کی شدت کی وجہ سے خدا کے آگے جھکے ہوئے رہتے ہیں۔ ان کا یہ حال انہیں رب کی عنایات کا خاص طور پر مستحق بنا دیتا ہے۔ ان کے معاملہ میں اللہ کی سنت ان کی استعداد کے مطابق اور اس عدل کے مطابق ظاہر ہوتی ہے، جس کا مظاہرہ پورے زمانہ بعثت میں ہوتا ہے۔

اعلان! —— اپیل!

ماہنامہ "میثاق" کے فروری ۱۹۶۴ء کے شمارہ سے رسالہ کے صفحات میں عارضی طور پر چار ورق کی کمی کی جارہی ہے۔ اس کا سبب کاغذ اور وسائلِ طباعت واشاعت کی موجودہ گرانباری ہے۔ اس وقت رسالہ جس تعداد میں شائع ہو رہا ہے اس کے پیش نظر فی پرچہ (۴۸ صفحات پر) کم از کم پینتالیس پیسے لاگت آتی ہے اس کے بعد جو کچھ تھوڑا سا پس انداز ہوتا ہوا نظر آتا ہے وہ ایجنٹ حضرات کے کمیشن اور بعض کی بے اعتنائی کی بھینٹ چڑھ کر نقصان کا باعث بنتا ہے۔ مزید براں پرچہ کی ایک کثیر تعداد تبادلہ اور نمونہ وتعارف میں بھی نکل جاتی ہے۔ ہم نے "میثاق" کے خریدار حضرات سے نئے خریدار بنانے کی اپیل کی تھی اور اس ذریعہ سے مدد واعانت چاہی تھی مگر افسوس ہے اب تک اپیل کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس رسالہ کو پسند کرنیوالا ہر فرد اگر ایک نیا خریدار بنائے تو اس کی اشاعت فوراً دگنی ہو جاتی ہے —— اب ہم نے زبردستی "میثاق" کو پڑھنے والے ہر شخص سے (چار ورق کی کمی کی) اعانت حاصل کر لی ہے لیکن چونکہ یہ چیز بہرحال ہے ناگوار خاطر، اس لئے جونہی حالات نے اجازت دی یہ خلا فوراً پُر کر دیا جائے گا۔ اس دوران میں یہ کمی عبارت کم قدرے خفی کرکے بھی ایک حد تک پوری کی جائے گی۔

اقتباسات و تراجم

قرآن سے بے تعلقی

جناب محمود احمد صاحب

قرآن سے بے تعلقی کی متعدد شکلیں ہیں۔ کبھی اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قرآن سُننے کا شوق ختم ہو جاتا ہے اور اس پر ایمان اُٹھ جاتا ہے۔ کبھی اس پر عمل کرنے اور اس کے ٹھہرائے ہوئے حرام و حلال پر رہ اِنفس کو روکنے میں بے بسی کا اظہار ہوتا ہے، خواہ بظاہر اسے پڑھنے کا اہتمام بھی ہو اور اس پر ایمان کا دعویٰ بھی۔ ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ بندہ قرآن کو حکم بنانا اور دین کے اصول و فروع میں قول فیصل کے لئے اس کی طرف رجوع کرنا ترک کر دیتا ہے، اس کے دل میں یہ بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے کہ یقین حاصل کرنے کے لئے قرآن کچھ مفید نہیں، اس کے دلائل الفاظ کا گورکھ دھندا ہیں جن سے حقیقی علم حاصل نہیں ہوتا قرآن سے بے تعلقی کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ اس پر غور و فکر کرنے، اس کو سمجھنے اور کہنے والے کے منشا سے واقف ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ وہ لوگ بھی اسی ضمن میں آتے ہیں جو جملہ قلبی امراض اور وساوس نفس میں قرآن سے چارہ جوئی اور شفاء طلبی نہ کریں اور اسکو نظر انداز کر کے دوسری چیزوں سے شفاء چاہیں۔
قرآن کی آیت

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔

"اور رسول پکار اُٹھا کہ میرے پروردگار میری قوم نے تو اس قرآن کو پس پشت ڈال دیا"

بے تعلقی کی ان تمام شکلوں پر حاوی ہے، اگرچہ ان میں سے بعض شکلیں نسبتاً معمولی ہیں۔

قرآن کی طرف سے بے اطمینانی اور دل کی تنگی کا بھی یہی حال ہے کبھی تو اس کے منزل من اللہ ہونے اور خدا کا برحق کلام ہونے کے بارے میں کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، کبھی دل میں یہ وسوسہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ مخلوقات ہی میں سے کسی کا شاہکار ہے جسے اس نے لوگوں سے ہمکلام ہونے کیلئے الہام کیا۔ کبھی اس کی کفایت اور عدم کفایت کے پہلو سے دل تنگ ہونے لگتا ہے اور یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ قرآن بندوں کے لئے کافی نہیں بلکہ اس کے ہوتے ہوئے بھی معقولات، قیاس آرائیوں، عقلی گدعل اور سیاسی ہیر پھیر کے بغیر چارہ نہیں۔ بعض اوقات یہ گمان قرآن کی دلالت اور ان حقائق

کے بارے میں ہوتی ہے جو اس کی آیات سے مراد ہوتے ہیں۔ لوگ ان حقائق کی ایسی ایسی تاویلات کر لیتے ہیں جن کا اصل سے کوئی جوڑ نہیں ہوتا۔ کبھی ان حقائق کا اصل مقصود ہی مشتبہ ہونے لگتا ہے۔ اور یہ سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ یہ باتیں فی الحقیقت مراد ہیں یا ان کا ذکر صرف مصلحت کی خاطر کیا گیا ہے۔ قرآن کے بارے میں اسطرح کے خیالات رکھنے والے تمام لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے گھٹن پیدا ہوجاتی ہے خود انہیں اس کا شعور ہوتا ہے اور اسے وہ اپنے دلوں میں جاگزیں پاتے ہیں چنانچہ تم کوئی بدعتی ایسا نہیں پاؤ گے جس کے دل میں ان آیات کے بارے میں کھٹک نہ ہو جو اس کی بدعت کے خلاف پڑتی ہوں۔ اسی طرح کوئی ظالم اور فاجر ایسا نہ ملے گا جو ان آیات کے سبب سے دل گرفتہ نہ ہو جو اس کے منصوبوں کے راستے میں حائل ہوتی ہوں۔ پس یہ نکتہ اچھی طرح دلنشین کر لو اور پھر جو راہ چاہو اختیار کر لو۔

اللہ پر توکل

توکل علی اللہ کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بندہ اپنی دنیاوی آسائشوں اور حاجتوں کے حاصل کرنے اور دکھ درد سے چھٹکارا پانے میں اللہ پر توکل کرے۔ دوسری یہ کہ بندہ ان چیزوں کے حصول کے لئے خدا پر توکل کرے جنہیں اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے اور جو اس کے نزدیک پسندیدہ ہیں، مثلاً ایمان، جہاد اور دعوت الی اللہ۔ توکل کی اس قسم کو پہلی قسم پر جو فضیلت حاصل ہے اس کا احاطہ خدا ہی کر سکتا ہے البتہ یہ ایک حقیقت ہے کہ بندہ جب دوسری قسم کا توکل کرتا ہے اور اس کا حق ادا کر دیتا ہے تو اس کا یہ توکل پہلی قسم کے توکل کو خود بخود سمیٹ لیتا ہے۔ ہاں جب وہ صرف پہلی قسم کے توکل پر اکتفا کرے تو یہ بھی اگرچہ ایک حد تک کفایت کرتا ہے لیکن اس کی عاقبت بہر حال اس بندے کی سی نہیں ہو سکتی جو خدا کی محبوب اور پسندیدہ چیزوں میں اس پر توکل کرتا ہے۔ لہٰذا توکل کا عظیم ترین درجہ یہ ہے کہ ہدایت، توحید خالص، پیروی رسول اور اہل باطل سے جہاد جیسے اہم معاملات میں اللہ پر توکل کیا جائے اور یہی توکل خدا کے فرستادوں اور ان کے خاص متبعین کا امتیاز تھا۔

توکل کبھی تو اضطرار اور مجبوری کا توکل ہوتا ہے جب بندہ اس کے سوا کوئی دوسری راہ ہی نہ پا رہا ہو، اسباب و وسائل تنگ ہو جائیں، دل گھٹنے لگے اور یہ یقین ہو جائے کہ اب پناہ مل سکتی ہے تو صرف خدا کے ہاں، لیکن کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ ایسا توکل آسانی اور کشائش حاصل ہونے پر بھی برقرار رہے۔ اس

کے برعکس توکل اختیاری بھی ہوتا ہے جب یہ ان اسباب و وسائل کے ہوتے ہوئے کیا جائے، جن کے ذریعے سے مراد اور مقصود کے حصول کا گمان ہو۔ اسباب و وسائل حرام و حلال دونوں قسم کے ہوتے ہیں اگر یہ اسباب ایسے ہوں جن کے اہتمام کا ہمیں حکم دیا گیا ہے تب تو ان سے بے پرواہی قابلِ ملامت ہوگی۔ لیکن اگر توکل سے صرف نظر کر کے صرف وسائل ہی پر بھروسہ کیا جائے تو یہ اور بھی زیادہ مذموم حرکت ہوگی کیونکہ نص قرآنی اور اجماع اُمت کی رُو سے اسباب اور توکل دونوں کو بیک وقت جمع کرنا واجب ہے۔ البتہ مطلوب تک پہنچنے کا اگر ایک ہی وسیلہ ہو، اور وہ حرام ٹھہرایا جا چکا ہو تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہیئے اور توکل ہی کو واحد وسیلہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ مراد تک پہنچنے اور مکروہات سے جان چھڑانے کے لئے توکل ایک مؤثر وسیلہ ہی نہیں بلکہ مؤثر ترین وسیلہ ہے۔ جب یہ صورت ہو کہ کسی سبب کا حرام و حلال ہونا ثابت نہ ہو تو بندے کو خوب غور کر کے یہ متعین کرنا چاہیئے کہ آیا اس کے اختیار سے توکل کمزور پڑتا ہے یا نہیں۔ اگر اس کے اختیار سے پائے توکل میں لغزش آئے، دلجمعی کی کیفیت باقی نہ رہے اور ارادہ متزلزل ہو جائے تو ایسے وسیلے سے صرف نظر بہتر ہے۔ البتہ اگر اس سے توکل میں کوئی کمی نہ آئے تو اختیار اولیٰ ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ احکم الحاکمین کی حکمت نے ہی توکل کا مسبب سے ناتا جوڑا ہے، لہٰذا بندے کے لئے یہ کسی طرح روا نہیں کہ اس کی حکمت کو معطل کرنے کے درپے ہو تاوقتیکہ کہ اس حکمت کا لحاظ رکھنا ممکن نہ رہے۔ جب کسی وسیلے کو اختیار بھی بندگی ہی کے جذبے کے ساتھ کیا جائے تو کیا کہنے، پھر تو گویا دل اور اعضاء و جوارح سب خدا کی بندگی میں شریک ہو گئے۔ دل خدا پر توکل کر کے اور اعضاء و جوارح اس وسیلے کا اہتمام کر کے جس سے مقصود تک پہنچنے کی توقع ہو۔ توکل کا ثبوت جس چیز سے ملتا ہے وہ اسباب و وسائل کے حصول کی کوشش ہی ہے۔ جو شخص یہ کوشش نہ کرے اس کا توکل صحیح نہیں۔ جس طرح مناسب اسباب و وسائل کا اہتمام ہی مال و دولت حاصل کرنے کے خواب سچ کر دکھاتا ہے اور ان اسباب سے بے پرواہی برتنے والے کی اُمیدیں بے بنیاد تمنا سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں اسی طرح اسباب و وسائل سے غفلت آدمی کے توکل کو بھی بے چارگی میں تبدیل کر دیتی ہے اور وہ اسی بے چارگی کو توکل کا نام دیتا ہے۔

حقیقت میں توکل کی بنیاد اور اس کی اصل خدائے واحد پر پورا قلبی اعتماد ہے۔ جس طرح غیر اللہ پر اعتماد اور بھروسہ رکھتے ہوئے خدا پر توکل کا زبانی دعویٰ کسی کام نہیں آتا اسی طرح توکل کے ساتھ اسباب و وسائل کے حصول سے بھی کسی نقصان کا اندیشہ نہیں بشرطیکہ آدمی کے دل کے کسی گوشے میں بھی ان پر اعتماد نہ

ہو اور وہ ان پر بھروسہ نہ کرے۔ پس زبان کا توکل ایک شے ہے اور دل کا توکل ایک الگ شے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے زبان کی توبہ، جب کہ دل گناہوں سے چمٹا رہے، ایک چیز ہے اور دل کی توبہ، خواہ زبان گنگ ہی کیوں نہ رہے، ایک الگ چیز۔ چنانچہ اللہ پر توکل کا دعویٰ، درآنحالیکہ دل میں کسی دوسرے پر اعتماد جاگزین ہو، ایسا ہی ہے جیسے کوئی زبان سے توبہ توبہ کی ضربیں لگائے اور حال یہ ہو کہ وہ گناہوں میں لت پت ہو اور ان سے چمٹا رہنے کا تہیہ بھی کئے ہوئے ہو۔

(الفوائد)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا

Regd. No. L. 7360

Monthly "**MEESAAQ**" *Lahore.*

FEBRUARY 1964

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر قرآن (قرآن فہمی کی رہنما)	1—25
تدبر قرآن (تفسیر آیہ بسم اللہ و سورہ فاتحہ)	1—75
اسلامی قانون کی تدوین	3—00 و 00—
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ	—25
تزکیہ نفس	6—00 و 75—

مطبوعات دیگر مصنفین

حضرت محمد ص	2—50
(آنحضرت ص) سیرت ابن ہشام	0—00
ابوبکر رض صدیق اکبر	0—00
عمر رض فاروق اعظم	0 00
امام اعظم رح	4—00
حیات امام احمد بن حنبل رح	0—00
آثار امام شافعی رح	2—00
حیات امام مالک رح	0—00
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح	1—00
تعبیر کی غلطی (جماعت اسلامی کا جائزہ)	6—00
زاد سفر (حصہ اول)	3—75
قادیانیت	4—00
ISLAM & THE WORLD	4—00

مکتبہ میثاق (رحمان پورہ) اچھرہ ۔ لاہور۔12

۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

جلد نمبر ۱   شمارہ نمبر ۷

ربیع الاول سنہ ۱۳۸۴ھ

ماہنامہ میثاق لاہور

فہرستِ مضامین

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ

مینجر ماہنامہ میثاق

رحمانپورہ ـــ اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیل زر کا پتہ

مینجر ہفت روزہ ندائے ملت

باغ گونگے نواب ـــ لکھنؤ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

مجھے نہایت گہرے احساس ندامت کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ میں میثاق کی اشاعت کی بے نظمی پر انتہائی کوشش کے باوجود قابو نہ پا سکا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ رسالہ برابر خسارہ کے ساتھ نکل رہا ہے اور یہ خسارہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کو پورا کرنا سخت مشکل ہو رہا ہے۔ اس خسارے کا زیادہ حصہ اگرچہ رسالے کے بعض قدرداں اب تک پورا کر رہے ہیں اور یقیناً وہ یہ ایثار اس کام کو ایک دینی خدمت سمجھ کر کر رہے ہیں لیکن جو رسالہ پانچ سال کی مدت میں اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکا اس کو کھڑے رکھنے کے لئے ان مخلصین کو برابر زحمت دیئے جانا چاہے ان پر بار نہ ہو لیکن یہ خود میری طبیعت پر ایک ایسا بار ہے کہ اس کو مزید اٹھانا مجھ پر بڑا شاق گزر رہا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر رسالے کے مضامین کی نوعیت اور اس کے مزاج میں مذاق عام کی رعایت سے کچھ تبدیلی کر دی جائے تو اس کے خریداروں میں کچھ اضافہ ہو جائے گا لیکن یہ بات میرے اختیار میں نہیں ہے۔ میں صرف اسی طرح کی چیزیں لکھ سکتا ہوں جس طرح کی چیزیں رسالے میں نکلتی رہی ہیں۔ پھر سوال صرف لکھ سکنے ہی کا نہیں ہے بلکہ ضمیر کا بھی ہے۔ میرا دل اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ اس رسالے میں کوئی ایسی چیز نکلے جس کی کوئی خاص مذہبی و علمی قدر و قیمت نہ ہو اور مقصود جس سے محض توسیع اشاعت ہو۔ اگر اس پابندی کے سبب سے رسالے کا حلقہ وسیع نہیں ہو سکتا تو نہ ہو، اس کو دور کرنا میرے امکان میں نہیں ہے۔

مالی خسارہ کے علاوہ بعض اور باتیں بھی وقتاً فوقتاً مزاحم ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میری اور

میرے متعلقین کی معاش کا انحصار ایک مدت سے تمام تر زمینداری پر ہے۔ اگر میں اس کی دیکھ بھال کروں تو معاش کا مسئلہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اگر اس کی دیکھ بھال کی طرف توجہ کرتا ہوں تو علمی مشاغل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ یہ دونوں کام ایک دوسرے کے رقیب واقع ہوئے ہیں اور ان دونوں رقیبوں کی کشاکش کے درمیان میرا حال کم و بیش وہی ہے جس کا ذکر مرزا غالب صاحب نے فرمایا ہے۔

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

علاوہ ازیں اب میری صحت بھی کچھ اچھی نہیں رہی۔ اگر زیادہ مشقت کا بار پڑ جائے تو ایسے عوارض اُبھر آتے ہیں جن سے لکھنے پڑھنے کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور پھر اس کے بحال ہونے میں دیر لگ جاتی ہے۔ میثاق کی اشاعت میں اس سے بھی خلل پڑتا ہے۔ رفقاء میں سے جو اس کام میں میری مدد کرتے ہیں ابھی وہ تنہا اپنے اعتماد پر رسالہ شائع کر دینے کی ذمہ داری نہیں اٹھاتے۔ شاید ان کو اپنے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے میرے مرنے کا انتظار ہے۔ ویسے ان بیچاروں کی اپنی مصروفیات بھی بہت ہیں۔ میرے کاموں میں وہ کوئی شرکت اگر کرتے ہیں تو اپنے ذاتی حالات سے لڑ کر کرتے ہیں اور محض علم دین کی محبت میں کرتے ہیں۔

میثاق کے علاوہ میرے سر اور بھی بعض کام ہیں جو مجھے لاہور میں رہتے ہوئے لازماً انجام دینے ہوتے ہیں۔ صحت کی حالت میں تین چار گھنٹے روزانہ تفسیر تدبر قرآن کی تسوید و تحریر پر صرف ہوتے ہیں کم از کم حلقۂ تدبر قرآن کے لئے تیاری اور درس و تعلیم پر صرف ہو جاتے ہیں، دو تین گھنٹے مراسلات، اخبارات و رسائل اور ملاقاتوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ کام کرنے کی قوت اب مجھ میں باقی نہیں رہی ہے۔

یہ حالات میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس لئے لکھ دیئے ہیں کہ میثاق کے قارئین پر یہ بات واضح رہے کہ رسالہ اس وقت ایک مشکل دور سے گزر رہا ہے، اگر یہ بند ہو جائے تو وہ اس کو مجبوری پر محمول فرمائیں۔ بند ہو جانے کی صورت میں ان خریداروں کے قرضوں کی ادائیگی میں ذمہ دار ہوں جن کی مدت خریداری ابھی باقی ہے۔ ان شاء اللہ مکتبہ کی کتابوں کی صورت میں یا نقد کی صورت میں ان کے قرضے ضرور ادا کر دوں گا۔

یہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض ایک اندیشے کا اظہار ہے، آخری فیصلہ نہیں ہے۔ آخری فیصلہ رسالہ کے ہمدرد اور معاونین حضرات فرمائیں گے۔ جہاں تک میرے دل کا تعلق ہے وہ اس کے بند ہوجانے پر راضی نہیں ہے۔ لیکن ہمیشہ وہی نہیں ہوتا جس کو انسان کا دل چاہتا ہے بلکہ ہوتا وہ ہے جس کو خدا چاہتا ہے اور میرا عقیدہ بھی ہے اور زندگی بھر کا تجربہ بھی کہ خدا وہی چاہتا ہے جو بہتر ہوتا ہے۔ اگر اس کی مرضی یہی ہے کہ یہ بند ہوجائے تو میں اس کے فیصلہ پر راضی ہوں۔

ابھی حسابات کی جانچ پڑتال نہیں ہوئی ہے لیکن سرسری اندازہ یہ ہے کہ اس وقت رسالے پر کم و بیش ایک ہزار کا بار ہے اور اگر اس کے کل واجبات وصول ہوجائیں جس کی اُمید بہت کم ہے تب بھی اس بار کا زیادہ حصہ مجھی کو ادا کرنا پڑے گا۔ ہرچند کہ پانچ سال کے عرصے میں اس رسالے سے کوئی مالی فائدہ بھی میں نے نہیں اُٹھایا۔

اگر رسالہ بند ہوتا ہے تو اس کے ذریعہ سے اس کے قدردانوں سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔

(۲)

ماضی قریب میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان میں بھارت کے وزیراعظم پنڈت جواہرلال نہرو کی موت ایک عظیم حادثہ ہے۔ اگرچہ وہ خدا اور مذہب کے منکر تھے لیکن اپنی قوم اور اپنے وطن کے سچے پرستار تھے اور اس معاملے میں وہ وفاداری اور پختہ زناری کی مثال قائم کرگئے۔ دنیا میں وزیراعظم بہت گزرے ہیں اور بہت گزریں گے لیکن بھارت جیسے وسیع الاطراف اور مختلف الاقوام ملک میں ہردل عزیزی کا جو مقام جواہرلال کو حاصل ہُوا اس کی مثال مشکل سے مل سکے گی یہ ماننا پڑتا ہے کہ انہوں نے اپنے طویل دورِ حکومت میں اپنی قوم کے جسموں ہی پر نہیں بلکہ ان کے دلوں پر حکومت کی ہے اور حکومت درحقیقت وہی ہے جو دلوں پر ہو۔

پنڈت جی کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام اقتدار آئی ہے ہماری دلی آرزو ہے کہ وہ پنڈت جی کے ناتمام کاموں کو تکمیل تک پہنچا سکیں۔ پنڈت جی جمہوریت کے بڑے دلدادہ تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ اس کو قائم رکھنے میں کامیاب رہے لیکن جمہوریت کا ایک کمزور پہلو یہ ہے کہ جب تک اس کی پشت پر نہایت مضبوط ہردل عزیز عوامی لیڈر نہ ہو اس کی حفاظت

ناممکن ہے۔ جواہر لال کے بعد اب یہ چیز بھارت کو حاصل نہیں رہی۔ اس مسئلہ پر اب اس کے لیڈروں کو سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا ورنہ جمہوریت کا مستقبل اب اس ملک میں خطرناک اندیشوں سے دوچار ہے۔ اور اس کے جو بدل متوقع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا خوش دلی سے خیر مقدم کیا جا سکے۔

پنڈت جی سیکولرزم کے بھی بڑے دلدادہ رہے لیکن اس میں ان کو شدید ناکامی سے سابقہ پیش آیا۔ رجعت پسند عناصر نے اس سلسلے کی ان کی تمام مساعی کو ناکام بنا دیا اور پنڈت جی ان کے مقابل میں وہ زور نہ دکھا سکے جس کی ان سے اُمید تھی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں ہمیں ان سے بڑی مایوسی ہوئی۔ اس کے وجوہ سے بحث نہیں۔ وجوہ جو کچھ بھی ہوں بہر حال ہم یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے دَورِ اقتدار میں مسلمانوں کا اس طرح شہر شہر میں قتل عام ہوگا جس طرح ہوا اور پنڈت جی اس کو اس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر لیں گے جس طرح انہوں نے برداشت کر لیا ہمیں ان سے گاندھی جی کی جرأت کی اُمید تو نہیں تھی لیکن اس کمزوری کی بھی اُمید نہیں تھی جو ان سے ظاہر ہوئی۔ اگر وہ اپنے دَورِ اقتدار میں صرف حکومت کے کارندوں اور اپنی پولیس ہی کو سیکولرزم کا پابند بنانے میں کامیاب ہو گئے ہوتے تو بھارت میں مسلمان خود اپنی حفاظت کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور اس طرح کے واقعات ہرگز نہ پیش آتے جن کو دیکھ کر بھارت کے مسلمان تو درکنار خود انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوسی ہو جاتی ہے۔

پنڈت جی کے جانشینوں سے ہمیں اُمید ہے کہ وہ اس مسئلہ میں پنڈت جی کی نہیں بلکہ مہاتما گاندھی جی کی پیروی کریں گے اور سر دے کر اپنے ملک کے ناموس کو وحشیوں اور درندوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ ہم ان لوگوں میں نہیں ہیں جو یہ رائے رکھتے ہوں کہ جو کام پنڈت جواہر لال نہرو سے نہ ہو سکا وہ لال بہادر شاستری کیا کر سکیں گے۔ کر سکنے اور نہ کر سکنے کا سوال نہیں ہے، سوال صرف کرنے کے سچے اور پکے ارادے کا ہے۔ ہمیں تو اگر یہ نظر آ جائے کہ بھارت میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو انسانی اقدار گاندھی جی کی طرح عزیز ہیں تو ہمارے اطمینان کے لئے بس ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ ان کی جان بازیوں کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔

کشمیر کے مسئلہ میں بھی پنڈت جی کی روش ہمارے لئے نہایت حیران کن رہی۔ اس مسئلہ

میں انھوں نے حیرت انگیز پریشان خیالی بلکہ نہایت مایوس کن ضد کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے ان کے اور ان کے ملک کے وقار کو بڑا نقصان پہنچا۔ لیکن اب زندگی کے آخری ایام میں غالباً ان پر خاص اس معاملے میں جذباتیت کی جگہ حقیقت پسندی غالب آگئی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے شیخ عبداللہ کو رہا کر کے اس کے طے کرنے کی راہ کھولی۔ اگرچہ افسوس ہے کہ اب وہ اس دنیا پر نہیں رہے لیکن ہمارا اندازہ یہ ہے کہ اس سے اس معاملے کے طے ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی بلکہ شاید اس کے لئے زیادہ سازگار فضا پیدا ہوگئی ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ اندازہ صحیح نکلے اور بھارت اور پاکستان کے لیڈر اور شیخ عبداللہ اس قضیے کو طے کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اسی قضیہ کے طے ہونے پر پاکستان اور بھارت کی دوستی کا انحصار ہے اور اسی دوستی پر دونوں کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ ہمیں خوشی ہے کہ صدر ایوب اور بھارت کے وزیر اعظم لال بہادر شاستری دونوں اس دوستی کی قدر و قیمت سمجھتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان دونوں لیڈروں کے ذریعہ سے پاکستان اور بھارت کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوگا اور شیخ عبداللہ اس دور کے فاتح باب قرار پائیں گے۔

(۳)

ہمارے ملک میں اب انتخابات کی گہما گہمی شروع ہونے والی ہے جس کے ابتدائی آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ انتخابات جمہوریت کی جان ہیں اور ان کی قدر و قیمت کا انحصار اس امر پر ہے کہ یہ ہر قسم کے سرکاری اور غیر سرکاری اثر و اقتدار کی ناروا مداخلت سے آزاد ہوں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ذمہ داروں کی طرف سے بار بار یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اس میں کوئی مداخلت نہ ہونے دی جائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ یہ اطمینان دہانی بالکل سچی ثابت ہوگی اور صدر ایوب جس طرح پچھلے انتخابات کے معاملے میں نیک نام رہے ہیں اس سے زیادہ وہ ہونے والے انتخابات میں نیک نام رہیں گے۔ مملکت کے سربراہ ہونے کے پہلو سے انہی پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اس ملک کو جو بدقسمتی سے گزشتہ ادوار میں جمہوریت کے آداب و رسوم سے آشنا نہ ہو سکا، اس چیز سے آشنا کریں اور اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ اس ملک میں جو انقلاب وہ لائے اس سے مقصود ملک کے عوام کو اختیار و آزادی سے محروم کرنا نہیں بلکہ اختیار و آزادی سے ہم کنار کرنا ہے۔

ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوریت کی کوئی ایک ہی متعین شکل نہیں ہے بلکہ اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ اس وجہ سے ہم یہ مانتے ہیں کہ اس راہ سے بھی جمہوریت کے نصب العین تک پہنچا جاسکتا ہے جو ہمارے ملک میں صدر ایوب نے اختیار فرمائی ہے لیکن اس کے لئے یہ شرط ضروری ہے کہ انتخابات اپنے ہر مرحلہ میں آزادانہ ہوں اور حکومت اپوزیشن پارٹیوں کے معاملہ میں فراخ دلانہ رویہ اختیار کرے۔ اگرچہ اپوزیشن پارٹیوں پر بھی یہ بہت بھاری ذمہ داری عاید ہوتی ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل میں سنجیدہ ہوں اور ملک وملت کے مفاد کو ہر چیز پر مقدم رکھیں اور مخالفت برائے مخالفت کی کورانہ روش سے احتراز کریں لیکن حقیقی جمہوریت کی پسندیدہ روایت یہی ہے کہ حزب اقتدار ان معاملات میں اپوزیشن کو بہت دور تک گنجائش دیتی ہے اور اس چیز کو ملک میں جمہوریت کے فروغ کی ایک علامت سمجھا جاتا ہے۔

اسی معروف روایت کے تحت ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی اپوزیشن پارٹیوں کے ساتھ حزب اقتدار فیاضانہ روش اختیار کریگی۔ رواداری سے رواداری اور فیاضی سے فیاضی پیدا ہوتی ہے اور اس طرح ملک میں صحتمندانہ رجحانات کو ترقی ہوتی ہے۔ ہم صدر ایوب سے یہ بھی درخواست کرتے ہیں کہ اگر وہ کالعدم جماعت اسلامی سے پابندی اٹھا کر اس کو بھی انتخابات میں حصہ لینے کا موقع دیں تو اس سے ہونے والے انتخابات کی قدر و قیمت میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ ہمیں اس معاملے کے قانونی پہلوؤں سے بحث نہیں، کسی امر کے قانونی پہلوؤں کو طے کرنا عدالتوں کا کام ہے۔ ہم اس کے سیاسی پہلو کو سامنے رکھ کر یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر جماعت اسلامی کو بھی انتخابات میں حصہ لینے کا موقع دے دیا جائے تو اس طرح ان لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی جو ملک کے اندر اور باہر لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہیں گے کہ یہ انتخابات اپوزیشن پارٹیوں کو جیلوں میں بند کر کے کرائے گئے ہیں ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے کہ اس وقت ملک میں صدر ایوب کو اور ان کے واسطہ سے ان کی پارٹی کو جو مقبولیت حاصل ہے اس کو چیلنج کرنے کے پوزیشن میں کوئی بھی نہیں ہے ایسی صورت میں یہ بات دانشمندی کے بالکل خلاف ہوگی کہ کسی جماعت کو پابند رکھ کر انتخابات کے متعلق لوگوں میں خواہ مخواہ ایک غلط تاثر پھیلنے اور پھیلانے کا موقع فراہم کیا جائے۔ ہر شخص جو ملک کے حالات پر نظر رکھتا ہے اندازہ کر سکتا ہے کہ موجودہ حالات میں اگر جماعت اسلامی میدان انتخابات میں آ بھی جائے تو اس

سے صورت حال میں کسی قابل ذکر تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ علاوہ ازیں ہائیکورٹ کے فل بنچ کے فیصلے کے بعد حکومت کی پوزیشن تہمت اور شبہ سے بھی بری ہو چکی ہے اس وجہ سے اگر حکومت جماعت کے معاملہ میں فیاضانہ رویہ اختیار کرے گی تو اس کا ملک کے ہر طبقہ پر نہایت اچھا اثر پڑے گا اور ہونے والے انتخابات سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، نہایت خوشگوار توقعات قائم ہونگی۔

ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے محض حکومت کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت عرض کیا ہے۔ ورنہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہمیں جماعت کے نظریات، اس کے طریقہ کار اور اس کے لب ولہجہ ہر چیز سے اختلاف ہے اس اختلاف کے باوجود جہاں تک ہمارا علم ہے اس کی بنا پر ہماری رائے یہی ہے کہ یہ لوگ ملک وملت کے خیر خواہ ہیں اور اپنے فہم وبصیرت کے حد تک ملک وقوم ہی کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ حکومت کی فیاضی کا ان لوگوں کے ذہنوں پر بھی اچھا اثر پڑے گا اور یہ حالات کا حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے از سر نو جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔

(۴)

میثاق کی پچھلی اشاعت میں ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کے خاندانی منصوبہ بندی والے مضمون پر ہم نے جو تنقید لکھنے کا وعدہ کیا تھا افسوس ہے کہ اس اشاعت میں اس وعدے کو ہم پورا نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض مجبوریوں کے سبب سے ادھر مجھے اپنے مستقر سے پورا سوا مہینہ غیر حاضر رہنا پڑا۔ اس کے بعد آیا تو گردے کے بعض عوارض اُبھر آئے جن کے سبب سے وہ نشاط خاطر بہم نہ ہو سکا جو لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے ضروری ہے۔ اگرچہ یہ ممکن تھا کہ تنقید کی ایک قسط اس اشاعت میں دے دی جاتی باقی آئندہ پر اُٹھا رکھی جاتی لیکن اس خیال سے کہ صحت نسبتہً زیادہ بہتر ہونے کی صورت میں مضمون زیادہ دلجمعی کے ساتھ لکھا جا سکے گا میں نے اس کو آئندہ اشاعت کے لئے اٹھا رکھا ہے خدا نے چاہا تو آنے والے شمارے میں یہ مضمون شائع ہو سکیگا

(۵)

حلقۂ تدبر قرآن کا کام بفضل اللہ پوری سرگرمی سے جاری ہے۔ اُدھر رفقا کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور مزید اضافے کی توقع ہے۔ نئے آنے والوں کا میں ابھی (باقی صفحہ ۳۵ پر ملاحظہ

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

۳۹

تفسیر سورۂ بقرۃ

آگے کا سلسلۂ کلام آیات ۲۴۳-۲۵۳

یہاں ذرا پیچھے مڑ کر سلسلہ کلام کو ذہن میں پھر تازہ کر لیجئے۔ فصل ۴۷ میں ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ اصل بیان تو بیت اللہ کے تعلق سے جہاد و انفاق کا ہو رہا تھا لیکن انفاق کی بحث نے یتیموں کی صلاح و فلاح اور ان کی ماؤں کے ساتھ نکاح کا سوال سامنے کر دیا اور اس طرح نکاح طلاق سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لئے ایک تقریب پیدا ہو گئی۔ قرآن کا طریقہ یہی ہے کہ جب کسی مسئلہ کے بیان کے لئے تقریب پیدا ہو جاتی ہے تو اصل سلسلہ بیان کو روک کر اس مسئلہ سے متعلق اتنی باتیں بیان کر دیتا ہے جتنی باتوں کے لئے وقت کے حالات تقاضا کر رہے ہوتے ہیں اور پھر اصل سلسلہ بیان شروع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ نکاح و طلاق سے متعلق مناسب وقت مسائل کر چکنے کے بعد اصل بیان جہاد و انفاق کا پھر شروع ہو گیا۔

آگے کے مطالب کی ترتیب یوں ہے کہ پہلے بنی اسرائیل کے ایک واقعہ کا حوالہ دیا ہے کہ وہ ایک بڑی تعداد میں ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں کے ڈر سے اپنا وطن چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے اور اس طرح انہوں نے اپنے لئے اخلاقی اور سیاسی موت خود اختیار کر لی۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ انہوں نے مکہ سے مدینہ کو جو ہجرت کی ہے تو یہ موت اور دشمن سے فرار نہیں ہے بلکہ کفر اور فتنہ سے فرار ہے اور اصل مقصد اس سے جانیں بچانا نہیں

بلکہ اللہ کے دین کی نصرت اور اس کی راہ میں جہاد کے لئے منظم ہونا ہے۔

اس تمہید کے بعد مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے اور ساتھ ہی بنی اسرائیل کی اس جنگ کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے جس کی تحریک ان کے ہاں بھی بعینہٖ اسی مقصد کے لئے ہوگی مسلمانوں کو یہاں جہاد پر ابھارا جا رہا ہے۔ یعنی بنی اسرائیل نے بھی یہ جنگ اپنے قبلہ کی آزادی کے لئے لڑی تھی۔ اور مسلمان بھی اپنے قبلہ ہی کی آزادی کے لئے اٹھ رہے تھے۔

بنی اسرائیل اپنی اس جنگ کے مختلف مراحل میں جن آزمائشوں سے گزرے اور جن فتنوں میں مبتلا ہوئے وہ بڑے ہی سبق آموز تھے اس وجہ سے مسلمانوں کو جو بعینہٖ انہی مراحل سے گزرنے کے لئے کمربستہ ہو رہے تھے ان کی سرگزشت کا یہ حصہ سنا دینا ضروری تھا تاکہ وہ اس سے سبق حاصل کریں اور ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکیں جو آگے کے مراحل میں پیش آسکتے ہیں۔

اس کے بعد چند آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہ فرمایا ہے کہ اس سرگزشت کے ذکر سے مقصود داستان سرائی نہیں ہے بلکہ یہی کچھ تمہارے سامنے بھی آنے والا ہے اور اس سے تمہاری نبوت کی تصدیق ہوگی لیکن بنی اسرائیل خود اپنے آئینہ میں بھی تمہاری تصویر دیکھ لینے کے باوجود اسی طرح اپنی ضد اور مخالفت پر اڑے رہیں گے، سو ان کی مخالفت کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے خدا تمہاری نصرت فرمائے گا۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۲۴۳-۲۵۲

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ
لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝
مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ۚ وَاللّٰهُ
يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۠ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
وقف لازم مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ
قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا
نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآىِٕنَا ۭ فَلَمَّا كُتِبَ

عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٢٤٦﴾ وَقَالَ لَهُمْ
نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ
عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ
اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ
مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن
يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ
وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾ ع ۳۲
فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُم بِنَهَرٍ فَمَن شَرِبَ مِنْهُ
فَلَيْسَ مِنِّي وَمَن لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا
مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا
الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن
فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿٢٤٩﴾ وَلَمَّا
بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَ
انصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَقَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ
وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم
بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٥١﴾ تِلْكَ آيَاتُ
اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا الجزء ۳
بَعْضَهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۘ مِّنْهُم مَّن كَلَّمَ اللَّهُ ۖ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ ۚ وَآتَيْنَا وقف
عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ۗ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِينَ مِن بَعْدِهِم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَٰكِنِ اخْتَلَفُوا فَمِنْهُم
مَّنْ آمَنَ وَمِنْهُم مَّن كَفَرَ ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ
مَا يُرِيدُ ﴿٢٥٣﴾ ع ۳۳

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں ہونے کے باوجود موت کے

ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ نکلے ہوئے تو اللہ نے ان کو کہا کہ جاؤ مر جاؤ، پھر اللہ نے ان کو زندہ کیا، اللہ لوگوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر گزار نہیں ہوتے - ۲۴۳

اور اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور یہ خوب سمجھ رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے اور کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس کو اس کے لئے کئی گنا بڑھائے اللہ ہی ہے جو تنگ دستی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی دیتا ہے اور اسی کی طرف تم کو لوٹنا بھی ہے - ۲۴۴ - ۲۴۵ -

کیا تم نے بنی اسرائیل کے سرداروں کو نہیں دیکھا جب کہ موسیٰ کے بعد انہوں نے اپنے ایک نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لئے ایک امیر مقرر کر دیجئے کہ ہم خدا کی راہ میں جہاد کریں - اس نے کہا، ایسا نہ ہو کہ تم پر جہاد فرض کر دیا جائے تو تم جہاد نہ کرو - وہ بولے کہ بھلا ہم اللہ کی راہ میں جہاد کیوں نہ کریں گے جب کہ ہم اپنے گھروں اور اپنے بچوں سے نکالے گئے ہیں - پھر جب ان پر جہاد فرض کر دیا گیا تو ان کی ایک قلیل تعداد کے سوا سب منہ موڑ گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے - اور ان کے نبی نے ان کو بتایا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالوت کو امیر مقرر کر دیا ہے - وہ بولے کہ بھلا اس کی امارت ہمارے اُوپر کیسے ہو سکتی ہے جبکہ اس سے زیادہ حقدار ہم اس امارت کے ہیں اور اسے تو مال کی وسعت بھی حاصل نہیں ہے - نبی نے کہا اللہ نے تمہاری سرداری کے لئے اسی کو چنا اور اس کو علم اور جسم دونوں میں کشادگی عطا فرمائی ہے - اللہ اپنی طرف سے جسے چاہے اقتدار بخشے، اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے - اور ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اس کی امارت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے سامان تسکین اور آل موسیٰ و آل ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں، صندوق کو فرشتے اُٹھائے ہوئے ہوں گے - اس میں تمہارے لئے بڑی نشانی ہے، اگر تم ایمان رکھنے والے ہو - ۲۴۶ - ۲۴۷ - ۲۴۸ -

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو انہوں نے بتایا کہ اللہ ایک ندی کے ذریعہ سے تمہاری جانچ کرنے والا ہے تو جو اس میں سے پی لے گا وہ میرا ساتھی نہیں اور جو اس کو نہیں چکھے گا تو بے شک وہ میرا ساتھی ہے، مگر یہ کہ کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چلو بھر لے۔ تو انہوں نے اس میں سے خوب پیا، صرف ان میں سے تھوڑے لوگ اس سے بچے۔ پھر جب طالوت اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان پر ثابت قدم رہے دریا پار کر گئے تو یہ لوگ بولے کہ اب ہم میں تو جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی طاقت نہیں، جو لوگ یہ گمان رکھتے تھے کہ بالآخر انہیں اللہ سے ملنا ہے انہوں نے للکارا کہ کتنی چھوٹی جماعتیں رہی ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئی ہیں، اللہ تو ثابت قدموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا سامنا ہوا تو انہوں نے دعا کی، اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر انڈیل دے ہمارے قدم جمائے رکھ، اور کافر قوم پر ہمیں غلبہ عطا فرما۔ تو اللہ کے حکم سے انہوں نے ان کو شکست دی - اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے اس کو بادشاہی اور حکمت بخشی اور اس علم میں سے اس کو سکھایا جس میں سے وہ چاہتا ہے۔ اور اگر اللہ ایک کو دوسرے کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو زمین فساد سے بھر جاتی لیکن اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ ۲۴۹-۲۵۰-۲۵۱-

یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں سناتے ہیں مقصد کے ساتھ اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو۔ یہ رسول جو ہیں ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی، ان میں سے بعض سے اللہ نے کلام کیا، اور بعض کے درجے بلند کئے اور ہم نے عیسٰی بن مریم کو کھلی کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس سے اس کی تائید کی - اگر اللہ چاہتا تو ان کے بعد والے واضح دلائل کے بعد نہ لڑتے لیکن انہوں نے اختلاف کیا، سو ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو وہ اختلاف نہ کر پاتے لیکن اللہ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ ۲۵۲-۲۵۳-

○

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ ۲۴۳

"الم تر" کا خطاب ضروری نہیں کہ واحد کے لئے ہو بلکہ یہ عموماً، جیسا کہ استاذ امامؒ نے سورہ فیل کی تفسیر میں واضح کیا ہے، جمع کے لئے آتا ہے اور خطاب اس میں گویا مخاطب گروہ کے ہر شخص سے فرداً فرداً ہوتا ہے۔ اس کے بعد جس واقعہ کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ یا تو مخاطب گروہ کا عینی مشاہدہ ہوتا ہے یا واقعہ کی شہرت اس درجے کی ہوتی ہے کہ اس کی نسبت یہ باور کیا جاتا ہے کہ اس سے مخاطب باخبر ہیں یا انہیں باخبر ہونا چاہیئے۔ یا متکلم کو یہ اعتماد ہوتا ہے کہ واقعہ کی صداقت ایسی مسلم ہے کہ اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔

موت کے لفظ پر اسی سورہ کی آیت ۵۶ کے تحت ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں یہ لفظ جس طرح زندگی کے فنا ہونے کے لئے استعمال ہوا ہے اسی طرح نیند، بیہوشی اور اخلاقی و ایمانی موت کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ وہاں ہم نے لسان العرب کا حوالہ دیا ہے۔ یہاں قرآن کے بعض نظایر ملاحظہ ہوں۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتہا ۴۲۔ زمر (اللہ جانوں کو وفات دیتا ہے ان کی نیند کے وقت) ثم بعثناکم من بعد موتکم لعلکم تشکرون ۵۶۔ بقرہ (پھر ہم نے تمہاری بیہوشی کے بعد تم کو اُٹھایا تاکہ تم شکر کرو) انک لاتسمع الموتی ولاتسمع الصم الدعاء ۸۰۔ نمل (تم اپنی دعوت مردہ دلوں اور بہروں کو نہیں سنا سکتے) او من کان میتا فاحییناہ وجعلنا لہ نورا یمشی بہ فی الناس ۱۲۲۔ انعام (کیا وہ جو مردہ دل تھا تو ہم نے اس کو حیات ایمانی بخشی اور اس کو نور ہدایت عطا کیا جس کو لے کر لوگوں کے درمیان چلتا ہے)

اسی طرح حیات کا لفظ بھی مادی زندگی سے لے کر نیند سے بیداری اور ایمانی و اخلاقی زندگی تک سب کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی ایک واضح نظیر تو انعام کی مقدم الذکر آیت میں موجود ہے۔ دوسری واضح نظیر انفال سے ملاحظہ ہو۔ استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم ۲۴ انفال

(اللہ اور رسول کی دعوت پر لبیک کہو جب کہ وہ تمہیں بلاتا ہے اس چیز کی طرف جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے)

اس آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کا تعلق بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دور سے ہے جس کا ذکر صحیفہ سموئیل میں ہے۔ سموئیل نبی کے ظہور کے ابتدائی دور میں بنی اسرائیل سخت انتشار میں مبتلا تھے، اگرچہ تعداد کے لحاظ سے یہ اس وقت تین لاکھ سے زیادہ تھے جیسا کہ سموئیل میں تصریح ہے[1] لیکن بدعات اور شرک کے غلبہ کی وجہ سے ان کی مذہبی و اخلاقی حالت بھی بڑی خراب تھی اور اجتماعی تنظیم مفقود ہونے کی وجہ سے سیاسی حالت بھی بڑی ابتر تھی۔ ہر طرف سے دشمنوں کی یورش تھی اور یہ ان سے اس قدر مرعوب اور دہشت زدہ تھے کہ کسی سے مقابلہ کی ہمت اپنے اندر نہیں پا رہے تھے۔ خاص طور پر فلسطیوں نے ان کو بری طرح مرعوب کر لیا تھا۔ انہوں نے ان پر چڑھائی کر کے ان کا قتل عام بھی کیا اور ان سے خدا کا وہ صندوق بھی چھین لے گئے جس کی حیثیت ان کے ہاں بالکل قبلہ کی تھی، جس کو وہ اپنی تمام عبادات اور تمام مہمات میں آگے آگے رکھتے تھے۔ ان کے ڈر سے بنی اسرائیل نے اپنے عقرون سے لے کر جات تک کے سارے شہر بھی خالی کر دیئے تھے[2]۔ خوف و بزدلی کی یہ موت ان پر بیس برس طاری رہی[3]۔ اس کے بعد سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کا کام شروع کیا، ان کو شرک و بدعت سے توبہ کرنے اور اپنے انتشار کو دور کر کے از سر نو منظم و متحد ہونے کی دعوت دی۔ ان کی اس دعوت کو اللہ تعالیٰ نے کامیابی بخشی اور اس طرح بنی اسرائیل میں بیس سال کی مردنی کے بعد از سر نو ایمانی و سیاسی زندگی کی حرکت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ہوئے کہ فلسطیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور اپنے ان شہروں کو ان سے واپس لے سکیں جن کو خود خالی کر کے بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

سموئیل میں یہ داستان بہت پھیلی ہوئی ہے۔ ہم اس کے کچھ ضروری حصے یہاں نقل کرتے ہیں جن سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر پیش کیا ہے۔

فلسطیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت، اُن کے ہاتھوں اِن کے قتل عام اور خدا کے صندوق کے چھن جانے کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

---

[1] سموئیل باب ۱۱ ۔ [2] سموئیل باب ۱۴ ۔ [3] سموئیل باب ۲ ۔

" اور فلستی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خونریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار اسرائیلی پیادے وہاں کھیت آئے اور خدا کا صندوق چھن گیا " سموئیل باب ۴ ۱۰-۱۱

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر پڑا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

" اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس بھی مر گئے اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کر پھاٹک کے کنارے گرا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی..................

........اور کہنے لگی کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی اس لئے کہ خدا کا صندوق چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے ،، سموئیل باب ۴ ۱۷-۲۲

اس حادثہ کے بعد بنی اسرائیل پر پورے بیس سال تک خوف و بزدلی اور نوحہ و ماتم کی جو مردنی طاری رہی اور پھر سموئیل نبی نے ان کے اندر اصلاح و تجدید کی جو دعوت بلند کی اس کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

" اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا اور سموئیل نے اسرائیل کے سارے گھرانے سے کہا کہ اگر تم اپنے سارے دل سے خداوند کی طرف رجوع لاتے ہو تو اجنبی دیوتاؤں اور عستارات کو اپنے بیچ سے دور کرو اور خداوند کے لئے اپنے دلوں کو مستعد کر کے فقط اسی کی عبادت کرو اور وہ فلستیوں کے ہاتھ سے تمہیں رہائی دے گا۔ تب بنی اسرائیل نے بعلیم اور عستارات کو دور کیا اور فقط خداوند کی عبادت کرنے لگے۔ پھر سموئیل نے کہا کہ سب اسرائیل کو مصفاہ میں جمع کرو اور میں تمہارے لئے خداوند سے دعا کروں گا ،، سموئیل باب ۲-۶۔

اس اجتماعی توبہ و استغفار اور تنظیم و اتحاد کے بعد بنی اسرائیل اس قابل ہوئے کہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہو سکیں اور ان کو شکست دے کر ان سے اپنے چھنے ہوئے شہر اور ساتھ

ہی اپنی چھنی ہوئی حشمت واپس لے سکیں۔ بنی اسرائیل کی اس نئی زندگی کا ذکر اس طرح آتا ہے۔

"اور سموئیل بنی اسرائیل کے لئے خداوند کے حضور فریاد کرتا رہا اور خداوند نے اس کی سنی اور جس وقت سموئیل اس سوختنی قربانی کو گزران رہا تھا اس وقت فلستی اسرائیلیوں سے جنگ کرنے کو نزدیک آئے لیکن خداوند فلستیوں کے اوپر اسی دن بڑی کڑک کے ساتھ گرجا اور ان کو گھبرا دیا اور انہوں نے اسرائیلیوں کے آگے شکست کھائی اور اسرائیل کے لوگوں نے مصفاہ سے نکل کر فلستیوں کو رگیدا اور بیت کر کے نیچے تک انہیں مارتے چلے گئے .... سو فلستی مغلوب ہوئے اور اسرائیل کی سرحد میں پھر نہ آئے اور سموئیل کی زندگی بھر خداوند کا ہاتھ فلستیوں کے خلاف رہا اور عقرون سے جات تک کے شہر جن کو فلستیوں نے اسرائیلیوں سے لے لیا تھا وہ پھر اسرائیلیوں کے قبضہ میں آئے اور اسرائیلیوں نے ان کی نواحی بھی فلستیوں کے ہاتھ سے چھڑا لی" سموئیل باب ۱-۱۴

ہمارے نزدیک تاریخ بنی اسرائیل کا یہی جزو ہے جس کی طرف آیت زیر بحث میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ جب انہوں نے خوف اور بزدلی کی زندگی اختیار کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس ایمانی و اخلاقی موت کے حوالہ کر دیا جس کی تعبیر "موتوا" سے فرمائی ہے۔ یہ معاملہ ٹھیک ٹھیک اس سنت اللہ کے مطابق ہوا جس کی طرف فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبہم میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی جب انہوں نے گمراہی پسند کی تو اللہ نے ان کو گمراہی میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ پھر جب ان کے اندر تجدید و احیائے ملت کی دعوت اٹھی اور انہوں نے از سر نو ایمان و اسلام کی حیات تازہ اختیار کر لینے کا عزم کر لیا تو اللہ نے ان کو از سر نو زندہ و متحرک کر دیا اسی چیز کو یہاں "ثم احیاہم" کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اسی اصول پر ہے۔ اگر کوئی قوم اپنے لئے ذلت و نامرادی کو پسند کرتی ہے تو خدا اس کو ذلت و نامرادی کے حوالہ کر دیتا ہے اور اگر کوئی قوم عروج و سربلندی کی طالب ہوتی ہے اور اس طلب کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کرنے کی ہمت دکھاتی ہے تو اللہ اس کو عزت و سربلندی بخشتا ہے اور یہ مرتبہ دے کر اس کا امتحان کرتا ہے۔

اس واقعہ کے ذکر سے مقصود مسلمانوں خصوصاً کمزور مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد و انفاق پر ابھارنا ہے۔ گویا یہ اس مضمون کی تمہید ہے جو آگے کی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ہم تمہید والی فصل میں اشارہ کر آئے ہیں کہ بنی اسرائیل کا یہ واقعہ بھی ان کے قبلہ کی جنگ سے متعلق ہے اور مسلمانوں کو

بھی یہاں جس جنگ اور جس انفاق کے لئے ابھارا جا رہا ہے اس کا تعلق اصلاً قبلہ ہی کی آزادی سے ہے دونوں میں نہایت واضح قدرِ مشترک موجود ہے۔ گویا مسلمانوں کے سامنے بھی اس وقت زندگی اور موت دونوں کی راہیں کھلی ہوئی ہیں۔ اگر وہ موت سے ڈر گئے تو یاد رکھیں کہ ان کو موت سے کوئی چیز بھی بچا نہ سکے گی، ان کے اوپر ذلت و خواری اور نفاق کی موت طاری ہو کر رہے گی اور اگر وہ موت سے بے پرواہو کر زندگی کی راہ پر بڑھنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو اللہ ان کو دنیا میں ایمان و اسلام کی باعظمت زندگی اور آخرت میں فوز و فلاح کی حیاتِ جاودان سے سرفراز فرمائے گا۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ اوپر کی تاریخی تمہید کے بعد یہ مسلمانوں کو جنگ پر ابھارا ہے۔ اور اس ابھارنے کے لئے دو محرک یہاں نمایاں فرمائے ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ جنگ اللہ کی راہ میں ہے نفس یا شیطان کی راہ میں نہیں ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر بندے کو اللہ کی معیت حاصل ہے۔ دوسرا یہ کہ اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے، تمہاری جانبازیاں اور قربانیاں، تمہاری دعائیں اور فریادیں، تمہارے دشمنوں کی چالیں اور تدبیریں سب اس کے علم میں ہیں اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ

مرگئے　　ہم انہیں خبر نہ ہوئی

ظاہر ہے کہ ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود یہاں ان کا لازم ہے یعنی جب اللہ سنتا اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری پکار پر تمہاری مدد و نصرت فرمائے گا اور تمہاری جانبازیوں کا تمہیں بھرپور صلہ دے گا۔

انفاق کے لئے ترغیب کا اسلوب

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝ جانی قربانی کی دعوت کے بعد یہ مالی قربانی کی دعوت ہے اور اس کے لئے جو اسلوب اختیار فرمایا ہے وہ غایت درجہ مؤثر ہے۔ اول تو سوال کا یہ انداز ہی کہ "کون ہے جو خدا کو قرض دینے کے لئے آگے بڑھتا ہے!" غایت درجہ شوق انگیز ہے، پھر یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو "قرض دینے" سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرض، قرضدار کے ذمہ واجب ہوتا ہے۔ اب یہ رب کریم کا کتنا بڑا احسان ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو عنایت فرمایا ہے وہی مال وہ جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کرنے کے لئے کہتا ہے تو اس کو اپنے

ذمہ قرض ٹھہراتا ہے یعنی اس کی واپسی از خود اپنے ذمہ واجب قرار دیتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ روح و دل کو بے خود کر دینے والی بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ رب کریم یہ قرض اس لئے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیئے ہوئے خزف ریزوں کو خوب بڑھائے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانہ کی شکل میں ان کو واپس کرے۔ یعنی اس قرض کی ضرورت اس لئے نہیں پیش آئی ہے کہ خدا کے خزانے میں کوئی کمی واقع ہوگئی ہے، اس کا خزانہ بھرپور اور وہ بالکل بے نیاز و بے پرواہ ہے، البتہ اس کی کریمی نے اپنے بندوں کے لئے نفع کمانے کی یہ راہ کھولی ہے کہ وہ اگر چاہیں تو ایک خرچ کر کے دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک اس کا اجر حاصل کر لیں۔

قرض حسن کا مفہوم

اس قرض کے متعلق شرط صرف ایک لگائی ہے۔ وہ یہ کہ یہ قرض "قرض حسن" ہو۔ قرض حسن کا مفہوم قرآن کے دوسرے مواقع سے جو نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دل کی تنگی کے ساتھ محض چھدا اتارنے کے لئے نہ دیا جائے بلکہ پوری فراخدلی اور حوصلے کے ساتھ دیا جائے، ریا اور نمائش کے لئے نہ دیا جائے بلکہ صرف خدا کی خوشنودی کے لئے دیا جائے، کسی دنیوی طمع کے حصول کی غرض سامنے رکھ کر نہ دیا جائے بلکہ صرف آخرت کے اجر کی خاطر دیا جائے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ حقیر، کم وقعت اور ناجائز ذرائع سے حاصل ہوئے مال میں سے نہ دیا جائے بلکہ محبوب، عزیز اور پاکیزہ کمائی میں سے دیا جائے۔ اسی سورہ میں آگے بھی ان باتوں کی وضاحت ہوگی اور احادیث میں بھی ان کی تفصیل موجود ہے۔

آخر میں اصل نکتے کی بات فرمادی کہ تنگی اور کشادگی کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں ہے بلکہ یہ چیز خدا کے اختیار میں ہے اس وجہ سے اگر وہ اپنا مال خدا سے بچاتا اور چھپاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اسی سے چھپاتا ہے جس کے اختیار میں بخشنے کے بعد چھین لینا بھی ہے۔

"وَاِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ" میں یہ پہلو بھی ہے کہ آج خدا سے منہ چھپانے والے اس بات کو نہ بھولیں کہ کل ان کو خدا کو منہ دکھانا بھی ہے۔ اور یہ پہلو بھی ہے کہ جس دنیا کی زندگی کے لئے یہ خدا سے بخالت کر رہے ہیں یہ زندگی تو چند روزہ ہے، اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جس کے لئے اصلی فکر ہونی چاہیئے۔

اَلَمۡ تَرَ اِلَی الۡمَلَاِ مِنۡۢ بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مُوۡسٰی ۘ اِذۡ قَالُوۡا لِنَبِیٍّ لَّہُمُ ابۡعَثۡ لَنَا مَلِکًا نُّقَاتِلۡ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ قَالَ ہَلۡ عَسَیۡتُمۡ اِنۡ کُتِبَ عَلَیۡکُمُ

الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۲۴۶

الفاظ کی تحقیق

"ملأ" کا اصل لغوی مفہوم بھرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کرکے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف و اعیان اور اکابر و سادات کے لئے استعمال ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ قوم کے اعیان و اشراف ہی ہوتے ہیں جو اس کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں، کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔

ملک کا مفہوم

"ملک" کے معنی صاحب اختیار و اقتدار کے ہیں۔ یہ اختیار و اقتدار مطلق قسم کا بھی ہوسکتا ہے جس طرح کا اختیار و اقتدار کسی جبار و مطلق العنان بادشاہ کو حاصل ہوتا ہے اور محدود و مقید قسم کا بھی ہوسکتا ہے جیسا کہ ایک پابند آئین و قانون یا پابند شریعت بادشاہ کو یا کسی امیر لشکر یا سپہ سالار کو حاصل ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ یہ دوسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس لئے کہ اس کے تقرر کے لئے بنی اسرائیل کے اعیان نے درخواست اس زمانے کے نبی (سموئیل) سے کی اور انہی کے تقرر سے اس کا تقرر ہوا اور تورات کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہی کی ہدایات کے تحت[۵] اور انہی کی دعاؤں کے زیر اثر وہ اپنے سارے فرائض انجام دیتا تھا۔ قرآن نے یہ لفظ مدح و ذم دونوں کے محل میں استعمال کیا ہے۔ ایک بادشاہ وہ بھی تھا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے حجت کی اور جس نے زندگی اور موت دونوں پر اختیار کا دعویٰ کیا۔ قرآن نے اس کی مذمت کی۔ اس کے برعکس ذوالقرنین، حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ بھی بادشاہ ہیں لیکن قرآن نے ان کی تعریف فرمائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی روح کی ہے۔ اگر اس کی روح خدا اور اس کے رسول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابل ستائش ہے، اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اگر روح خدا اور رسول کی باغی ہے تو وہ قابل مذمت ہے عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت۔

جس طرح اُوپر کی آیات میں بنی اسرائیل کی ایمانی و اخلاقی موت و حیات کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرکے مسلمانوں کو زندگی کی راہ اختیار کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ زندگی خدا کی راہ

[۵] سموئیل باب ۲۵

میں جان اور مال کی قربانی سے حاصل ہوتی ہے، اسی طرح اس آیت میں اور آگے کی چند آیات میں تاریخ بنی اسرائیل کے اسی سلسلے کے بعض واقعات کی طرف اشارہ کر کے مسلمانوں کو اجتماعی سیاسی زندگی سے متعلق بعض نہایت اہم سبق دیئے گئے ہیں۔

زیر بحث آیت میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی تفصیل تورات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ سموئیل نبی[۵۱] نے بنی اسرائیل کے اندر تجدید و اصلاح اور ان کی تنظیم کا جو کام شروع کیا اس سے بنی اسرائیل کے اندر کچھ زندگی تو پیدا ہوئی اور وہ فلستیوں کے مقابل میں کھڑے ہونے اور ان سے اپنے بعض چھنے ہوئے شہر واپس لینے میں کامیاب ہوئے لیکن بنی اسرائیل ہر طرف سے دشمنوں سے گھرے ہوئے تھے، ان کے بہت سے شہر اب بھی مخالفوں کے قبضے میں تھے، فلستیوں کے علاوہ موآب، بنی عمون، ادوم اور ضوباہ کے بادشاہوں سے بھی ہر وقت ان کو خطرہ تھا، پھر سموئیل نبی بوڑھے ہو چکے تھے اور انہوں نے بنی اسرائیل کی قیادت و تنظیم کی جو ذمہ داریاں اپنے بیٹوں کے سپرد کی تھیں وہ ان کو بنی اسرائیل کی توقع کے مطابق نہیں نباہ رہے تھے اس وجہ سے انہوں نے سموئیل سے یہ درخواست کی کہ وہ ان کی قیادت کے لئے کسی امیر کو مامور کریں تاکہ وہ اس کی سربراہی میں جہاد کر سکیں اور اپنے دشمنوں سے انتقام لے سکیں[۵۲]۔

سموئیل اپنے تجربات کی بنا پر جانتے تھے کہ بنی اسرائیل کی اصلی کمزوری یہ نہیں ہے کہ میدان جنگ میں رہنمائی کرنے والا ان کے پاس کوئی لیڈر نہیں ہے بلکہ ان کی اصلی کمزوری یہ ہے کہ جنگ کے خطرات کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کے اندر عزم و ایمان نہیں ہے اس وجہ سے انہوں نے، جیسا کہ تورات سے واضح ہوتا ہے، ان کے اس مطالبہ کی مخالفت کی اور ان کی اصلی کمزوری کی طرف توجہ دلائی کہ ایسا نہیں ہوگا کہ جہاد بھی فرض ہو جائے اور امیر بھی مقرر ہو جائے لیکن پھر تم جہاد سے انکار کر دو۔ اس پر انہوں نے بڑے جوش و جذبے کا اظہار کیا کہ ہم اپنے گھروں اور اپنے بیوی بچوں سے نکالے گئے ہیں، اگر اب بھی ہم جنگ نہ کریں گے تو پھر کب کریں گے؟ لیکن سموئیل کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انہوں نے تو اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق ان کی قیادت کے لئے امیر بھی مقرر کر دیا اور جہاد کا حکم بھی دے دیا لیکن بنی اسرائیل

[۵۱] ان کا زمانہ ۱۰۸۹ قبل مسیح کا زمانہ ہے۔

[۵۲] ملاحظہ ہو سموئیل باب ۸

نے حسب عادت عین وقت پر کندھا ڈال دیا۔ آگے کی تفصیلات سے معلوم ہوگا کہ اول تو انہیں منتخب سردار کی سرداری ہی پر اعتراض ہوا، پھر جب بادلِ ناخواستہ اس کی فوج میں بھرتی ہوئے بھی تو پہلے ہی امتحان میں پھسڈی ثابت ہوئے۔

"وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ" (اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے) سے مراد اس کا لازمی نتیجہ ہے یعنی جب خدا خوب جانتا ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔

قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ، قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ، قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ، وَاللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ، وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۲۴۷

لفظ بعث کا مفہوم

"بعث" کے معنی اٹھانے، ابھارنے، بھیجنے کے ہیں پھر اسی مفہوم سے اس کے اندر مامور کرنے کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ چونکہ اس سالار کا انتخاب سموئیل نے خدا کی ہدایت کے مطابق کیا تھا جیسا کہ تورات سے بھی ثابت ہے اور قرآن کے الفاظ "اَصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ" سے بھی واضح ہے اس وجہ سے اس کے لئے "بعث" کا لفظ استعمال ہوا۔

طالوت اور ساؤل

"طالوت" یہ اس مامور سالار کا نام ہے۔ تورات میں ان کا نام ساؤل آیا ہے۔ اور ان کے غیر معمولی طور پر قدآور ہونے کا ذکر خاص طور پر ہوا ہے۔ "اور جب وہ لوگوں کے درمیان کھڑا ہوا تو ایسا قدآور تھا کہ لوگ اس کے کندھے تک آتے تھے[۱]"، کچھ بعید نہیں کہ اپنے اس غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے وہ لوگوں میں اس لقب سے بھی مشہور رہے ہوں۔ طالوت کے معنی "لمبے تڑنگے" کے ہیں۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب قریب ہیں اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے مشترک ہیں گمان ہوتا ہے کہ تورات نے ان کا ذکر نام سے کیا ہے اور قرآن نے لقب سے۔ ورنہ پھر یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے نام کے بارے میں تورات کا بیان غلط ہے، اصل نام طالوت ہی ہے۔ قرآن نے یہاں بعض دوسرے واقعات کے بارے میں بھی تورات کے بیانات کی تردید کی ہے۔ آگے ہم ان کی طرف اشارہ کریں گے اور یہ بھی واضح کریں گے کہ اس طرح کے اختلافات کی صورت میں قرآن کا بیان کیوں قابل ترجیح ہے۔

---

[۱] سموئیل باب ۲۴۔

طالوت کا انتخاب اور اس پر بنی اسرائیل کا اعتراض

بنی اسرائیل کے اپنے مطالبے پر جب سموئیل نے ایک سالار کا انتخاب کیا اور اس کو ان کے سامنے پیش کیا تو بجائے اس کے کہ خوشی سے اس کو قبول کرتے انہوں نے حسب عادت اس انتخاب پر اعتراض کر دیا کہ بھلا یہ ہمارا سردار کیسے ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ حق دار تو ہم اس منصب کے ہیں؟ اعتراض کی بنیاد یہ تھی کہ طالوت کوئی مالدار آدمی نہیں ہیں۔ علاوہ ازیں طالوت بنیامین کے قبیلہ سے تھے بنیامین کا قبیلہ اول تو بنی اسرائیل کے تمام قبیلوں میں سب سے چھوٹا قبیلہ تھا۔ پھر طالوت اس قبیلہ کے تمام گھرانوں میں سب سے چھوٹے گھرانے سے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت کو اپنے قبیلے کی کمزوری کا خود بھی احساس تھا۔ چنانچہ جب سموئیل نے ان کے انتخاب کا ان سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑی خاکساری کے ساتھ یہ الفاظ کہے۔

> ساؤل نے جواب دیا کیا میں بنیمینی یعنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلہ کا نہیں؟ اور کیا میرا گھرانا بنیمین کے قبیلہ کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں؟ [۱]

ظاہر ہے کہ مالی اور عددی دونوں ہی اعتبار سے ایک کمزور آدمی کو بنی اسرائیل کے وہ قبیلے کس طرح خاطر میں لا سکتے تھے جن کو اپنی مضبوط عصبیت اور اپنی مالی برتری کا گھمنڈ تھا چنانچہ انہوں نے اس انتخاب پر اعتراض کیا۔ تورات میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

> "پر شریروں میں سے بعض کہنے لگے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا، سو انہوں نے اس کی تحقیر کی اور اس کے لئے نذرانے نہ لائے پر وہ ان سنی کر گیا [۲]"
>
> "اور لوگ سموئیل سے کہنے لگے کس نے یہ کہا تھا کہ کیا ساؤل ہم پر حکومت کرے گا؟" [۳]

اعتراض کا جواب

اس اعتراض کا جواب سموئیل نبی نے یہ دیا کہ یہ انتخاب خدا کا انتخاب ہے۔ اسی نے اس کو تمہاری سرداری کے لئے چنا ہے۔ تم سرداری کو تعداد اور مال کے پیمانوں سے تولتے اور ناپتے ہو لیکن خدا علم اور عمل کے پیمانے سے ناپتا ہے۔ طالوت کے پاس اگرچہ خاندان کی شوکت اور مال کی فراوانی نہیں ہے لیکن علم کی وسعت اور عمل کی قوتوں سے وہ بھرپور ہے اور خدا کے انتخاب میں

[۱] سموئیل باب ۹ ۲۱ [۲] سموئیل باب ۱۰، ۲۷ [۳] سموئیل باب ۱۱، ۱۲

اصلی اہمیت انہی چیزوں کو حاصل ہے نہ کہ خاندان اور مال کو۔

اس کے بعد فرمایا کہ اقتدار و اختیار خدا کی دین ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جس کو بخشتا ہے اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت بخشتا ہے۔ اس کا اقتدار تمام اقتداروں کو محیط اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے پاس نہ بخشنے کے لئے کمی ہے، نہ بخش کر واپس لینے میں کوئی مانع ہے، نہ کسی معاملے کے ظاہر و باطن یا اس کے ماضی و مستقبل کا کوئی گوشہ اس سے مخفی ہے۔

" وَاسِعٌ عَلِيمٌ " میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ تم ہر معاملے کو اپنی تنگ اور محدود نگاہوں سے دیکھتے ہو لیکن خدا اپنے فیصلے اپنی قدرت اور اپنے علم کی روشنی میں صادر فرماتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۲۴۸

تابوت کی حقیقت

" تابوت " کے معنی صندوق کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد بنی اسرائیل کا وہ صندوق ہے جس کو تورات میں " خدا کا صندوق " یا " خدا کے عہد کا صندوق " سے تعبیر کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل کے مصر سے خروج کے زمانے سے لے کر بیت المقدس کی تعمیر تک اسی صندوق کو بنی اسرائیل کے قبلہ کی حیثیت حاصل رہی۔ وہ اس کو اپنے خیمہ عبادت میں ایک مخصوص مقام پر نہایت مخصوص اہتمام کے ساتھ پردوں کے بیچ میں رکھتے اور تمام دعا و عبادت میں اسی کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان کے ربی اور کاہن قلبی رہنمائی کے لئے بھی اسی کو مرجع بناتے۔ مشکل حالات، قومی مصائب اور جنگ کے میدانوں میں بھی بنی اسرائیل کا حوصلہ قائم رکھنے میں اس صندوق کو سب سے بڑے عامل کی حیثیت حاصل رہی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانے تک تو اس میں تورات اور صحرا کی زندگی کے دور کی بعض یادگاریں محفوظ کی گئیں لیکن پھر اس میں حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ اور ان کے خاندان کے بعض اور تبرکات بھی محفوظ کر دیئے گئے۔

سکینت کا مفہوم

" سَكِينَة " کے معنی اطمینان، قرار اور حوصلہ کے ہیں، بالخصوص وہ اطمینان و حوصلہ جو پرخطر حالات اور جنگ کے مصائب میں آدمی کے عزم کو قائم رکھے۔ مثلاً هُوَ الَّذِي أَنزَلَ السَّكِينَةَ فِي قُلُوبِ الْمُؤْمِنِينَ لِيَزْدَادُوا إِيمَانًا ۴ - الفتح (وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں عزم و اطمینان اتارا تاکہ وہ اپنے ایمان میں اضافہ کریں) فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ۱۸ - فتح (تو اس

کے دلوں میں جو کمزوری تھی اللہ نے اس کو جان لیا پس ان پر عزم و اطمینان اتارا اور ایک فوری فتح سے ان کو نوازا۔) اس تابوت کے ساتھ بنی اسرائیل کو جو والہانہ عقیدت تھی اس کا ایک خاص پہلو، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ بھی تھا کہ مصائب و مشکلات اور میدان جنگ میں ان کے حوصلے (morale) کو قائم رکھنے میں اس کو سب سے زیادہ دخل تھا۔ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ سے اس کے اسی خاص پہلو کی طرف اشارہ ہے۔

اوپر فلسطیوں کے ہاتھوں اس تابوت کے چھینے جانے کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور یہ بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس کے چھن جانے کو بنی اسرائیل کے بزرگوں نے اسرائیل سے ساری حشمت کے چھن جانے سے تعبیر کیا اور ساری قوم نے اس عظیم حادثے پر ماتم کیا۔ چنانچہ اس دور میں بنی اسرائیل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس تابوت کو اپنے دشمنوں سے واپس لینے کا تھا۔ اسی بنا پر سموئیل نے طالوت کے انتخاب کے خدائی انتخاب ہونے کی یہ نشانی ٹھہرائی کہ اس کے بعد تابوت تمہارے پاس فرشتوں کی مدد سے آپ سے آپ آجائے گا۔ چنانچہ ان کی یہ پیشینگوئی پوری ہوئی اور فلسطیوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر اس کو بنی اسرائیل کے علاقے کی طرف ہانک دیا۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

> اب تم ایک نئی گاڑی بناؤ اور دو دودھ والی گائیں جن کے جوا نہ لگا ہو لو۔ اور ان گایوں کو گاڑی میں جوتو اور ان کے بچوں کو گھر لوٹا لاؤ اور خداوند کا صندوق لے کر اس گاڑی پر رکھو اور سونے کی چیزوں کو جن کو تم جرم کی قربانی کے طور پر ساتھ کر دو گے ایک صندوقچہ میں کر کے اس کے پہلو میں رکھ دو اور اسے روانہ کر دو کہ چلا جائے اور دیکھتے رہنا.....
> .... سو ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور دو دودھ والی گائیں لے کر ان کو گاڑی میں جوتا اور ان کے بچوں کو گھر میں بند کر دیا اور خداوند کے صندوق ....
> اور صندوقچہ کو گاڑی پر رکھ دیا۔ ان گایوں نے بیت شمس کا سیدھا راستہ لیا۔ وہ سڑک ہی سڑک ڈکارتی گئیں اور دہنے یا بائیں ہاتھ نہ مڑیں اور فلسطی سردار بیت شمس کی سرحد تک ان کے ساتھ گئے اور بیت شمس کے لوگ وادی میں گیہوں کی فصل کاٹ رہے تھے انہوں نے جو آنکھیں اٹھائیں تو صندوق کو دیکھا اور دیکھتے ہی خوش ہو گئے۔

سموئیل باب ۶: ۷–۱۳

تابوت کی گاڑی کا بغیر کسی گاڑیبان اور بغیر کسی محافظ کے اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے سے جن کے دودھ پیتے بچھڑوں پر روک لئے گئے تھے اس طرح بغیر دہنے بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو کروبیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے اسی چیز کو "تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ" کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیان کا اختلاف

تابوت کی واپسی سے متعلق تورات اور قرآن کے بیان میں بڑا فرق ہے۔ قرآن کی زیرِ بحث آیت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی واپسی کا واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جب طالوت کا خدا کے مقرر کردہ بادشاہ کی حیثیت سے اعلان ہوا ہے اور یہ واقعہ گویا ایک نشان تھا اس بات کا کہ طالوت کا انتخاب من جانب اللہ ہے، سموئیل نے خدا کے حکم سے ان کو مسح کر کے برکت دی ہے اور ان کا تقرر بنی اسرائیل میں ایک نئے دور خیر و برکت اور ایک جدید تاریخ کامیابی و فتحمندی کا آغاز ہے۔

اس کے بالکل برعکس تورات کا بیان یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے ہی تابوت کو ایک گاڑی پر رکھ کر، جیسا کہ اُوپر کے حوالے میں تصریح ہے، فلسطیوں نے گاڑی بنی اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دی تھی اور تابوت پوری حفاظت کے ساتھ ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ اس طرح واپس کرنے کی وجہ تورات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ فلسطینی تابوت چھین لے جانے کو تو چھین لے گئے لیکن وہ ان کے لئے مصیبت بن گیا، انہوں نے اس کو جہاں جہاں رکھا وہاں مختلف قسم کی وبائیں پھوٹ پڑیں جس سے ان کے ہزاروں آدمی مر گئے بالآخر اس سے تنگ آکر انہوں نے سات ماہ کے بعد اپنے نجومیوں کے مشورے سے اس سے نجات حاصل کرنے کی وہ تدبیر اختیار کی جس کی طرف اوپر اشارہ ہوا۔

قرآن کے بیان کے صحیح ہونے کے دلائل

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں بیانوں میں سے کون سا بیان روایت اور درایت کی کسوٹی پر پورا اُترتا ہے؟ ہمارے نزدیک مندرجہ ذیل وجوہ کی بنا پر قرآن کا بیان صحیح اور تورات کا بیان غلط ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ان واقعات کے بیان کے خاتمہ پر قرآن نے یہ کہا ہے کہ تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۲۵۲ بقرہ۔ (یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور بے شک تم اللہ کے رسولوں میں سے ہو) اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ امر یہاں قرآن کے پیشِ نظر ہے کہ یہ واقعہ جس شکل میں وہ پیش کر رہا ہے وہ تورات کے بیان سے مختلف ہے لیکن

واقعہ کی صحیح شکل وہی ہے جس شکل میں اس کو قرآن پیش کر رہا ہے نہ کہ جس شکل میں اس کو تورات پیش کر رہی ہے اور پھر اس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک دلیل قرار دیا ہے کہ قدیم آسمانی صحیفوں کی جن سرگزشتوں کے جاننے کا تمہارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ان کو اس صحت کے ساتھ پیش کرنا کہ یہ سرگزشتیں محض بے مقصد داستان سرائی کے بجائے اپنے منطقی ربط و تسلسل اور اپنے حکیمانہ ثمرات و نتائج کے ساتھ لوگوں کے سامنے آئیں بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تم کو اپنا رسول بنایا اور ان باتوں سے تمہیں اپنی وحی کے ذریعہ سے آگاہ فرمایا۔

ایک ہٹ دھرم یہ کہہ سکتا ہے کہ ان واقعات کے پیش کرنے میں قرآن کا بیان تورات کے بیان سے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تورات کا براہ راست کوئی علم نہیں تھا، وہ نعوذ باللہ سنی سنائی باتیں پیش کرتے تھے اس وجہ سے ان کا بیان تورات سے مختلف ہوتا تھا۔ لیکن یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ اول تو جو سنی سنائی بات کہتا ہے اس کی بات عام اور مشہور روایت کے مطابق ہوتی ہے، نہ کہ اس سے بالکل مختلف، دوسرے یہ کہ جو شخص سنی سنائی بات نقل کرتا ہے وہ کبھی پورے جزم و یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ فلاں بات جو تم کہہ رہے ہو یوں نہیں بلکہ یوں ہے۔ یہ انداز تو وہی اختیار کرتا ہے اور وہی اختیار کر سکتا ہے جو پورے علم و بصیرت کے ساتھ ایک بات کو جانتا ہو اور چیلنج دے کر اس پر تنقید یا اس کی تصحیح کرنا چاہتا ہو۔ یہاں صاف نظر آتا ہے کہ صورت معاملہ یہی ہے۔ قرآن نے ساؤل کے نام کی بھی تصحیح کی، تابوت کی واپسی کے واقعہ کو بھی اس کے اصلی رنگ میں پیش کیا اور آگے آپ دیکھیں گے کہ نہر والے امتحان کے صحیح موقع و محل کو بھی معین کیا اور پھر کہا کہ حق یہ ہے جو قرآن میں بیان ہو رہا ہے نہ کہ وہ جو تورات میں بیان ہوا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عقل اور منطق کی رو سے بھی وہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے۔ تورات سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تابوت کی واپسی تمام تر نتیجہ تھی ان کرامات کا جو خود تابوت سے ظاہر ہوئیں۔ فلسطینی اس کے لے جانے کے بعد سے برابر آفات و مصائب کے ہدف بن گئے انہوں نے ان آفات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بہتری اسی میں دیکھی کہ یہ جن کی چیز ہے ان کے حوالہ کریں چنانچہ انہوں نے اپنی جان چھڑانے کی وہ شکل اختیار کی جو اوپر بیان ہوئی۔ بنی اسرائیل جیسی ضعیف الاعتقاد اور کرامات پرست قوم کے ذہن سے یہ بات چونکہ بہت قریب تھی اس وجہ سے انہوں نے

اس کو گھڑ بھی لیا اور پھر اس عوام پسند روایت کو تورات میں داخل بھی کر دیا لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا اتنے بڑے بڑے واقعات کسی قوم کی زندگی میں محض بچوں کے کھیل کی طرح ہو جایا کرتے ہیں؟ تابوت کی حیثیت بنی اسرائیل کے قبلہ کی تھی، نہ اس کا چھن جانا کوئی اتفاقی حادثہ ہو سکتا نہ اس کا واپس ہونا کوئی معمولی واقعہ ہو سکتا۔ اس طرح کا حادثہ پیش آیا تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بنی اسرائیل اس وقت ایسی عملی و اعتقادی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے ہوں جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ اس سزا کے مستحق قرار پائے ہوں۔ اور اگر وہ اس کے واپس لینے میں کامیاب ہوئے تو اس کی راہ بھی اس طرح کھلی ہوگی کہ انہوں نے اپنے حالات و معاملات کی ایسی اصلاح کی ہو کہ خدا کی رحمت ان کی طرف متوجہ ہوئی ہو اور ان کے دشمن ان سے مرعوب ہوئے ہوں۔

تورات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانے میں قبلہ کے چھن جانے کا واقعہ پیش آیا ہے اس زمانے میں بنی اسرائیل اعتقادی و عملی اعتبار سے بھی بالکل تباہ حال تھے اور سیاسی اعتبار سے بھی سخت پراگندگی اور انتشار میں مبتلا تھے۔ ہم اوپر اس کے ثبوت میں بعض حوالے نقل کر آئے ہیں۔ سموئیل نے ان حالات کی اصلاح کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا انتشار اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ بڑھاپے میں ان کے لئے تنہا اس پر قابو پانا سخت مشکل تھا۔ لیکن طالوت کے تقرر کے بعد سے حالات میں نمایاں تبدیلی ہوئی۔ سموئیل اور طالوت دونوں نے مل کر بنی اسرائیل کے اندر ایک تازہ امنگ پیدا کر دی۔ طالوت کے تقرر کے موقع پر سموئیل نے جو تقریر بنی اسرائیل کی پوری قوم کے سامنے کی ہم اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ طالوت کے تقرر سے پہلے کے حالات کیا تھے اور بعد میں کن حالات کے پیدا ہونے کی امید بندھی۔

"پھر سموئیل لوگوں سے کہنے لگا وہ خداوند ہی ہے جس نے موسیٰ و ہارون کو مقرر کیا اور تمہارے باپ دادا کو ملک مصر سے نکال لایا سو اب ٹھہرے رہو تاکہ میں خداوند کے حضور ان سب نیکیوں کے بارے میں جو خداوند نے تم سے اور تمہارے باپ دادا سے کیں گفتگو کروں جب یعقوب مصر میں گیا اور تمہارے باپ دادا نے خداوند سے فریاد کی تو خداوند نے موسیٰ اور ہارون کو بھیجا جنہوں نے تمہارے باپ دادا کو نکال کر اس جگہ بسایا پر وہ خداوند خدا کو بھول گئے سو اس نے حصور کی فوج کے سپہ سالار سیسرا کے ہاتھ اور فلستیوں کے ہاتھ اور شاہ موآب

کے ہاتھ بیچ ڈالا اور وہ ان سے لڑے۔ پھر انہوں نے خداوند سے فریاد کی اور کہا کہ ہم نے گناہ کیا اس لئے کہ ہم نے خداوند کو چھوڑا اور بعلیم اور عستارات کی پرستش کی پر اب تو ہم کو ہمارے دشمنوں کے ہاتھ سے چھڑا تو ہم تیری پرستش کریں گے سو خداوند نے یربعل اور بدان اور افتاح اور سموئیل کو بھیجا اور تم کو تمہارے دشمنوں کے ہاتھ سے جو تمہاری چاروں طرف تھے رہائی دی اور تم چین سے رہنے لگے اور جب تم نے دیکھا کہ بنی عمون کا بادشاہ ناحس تم پر چڑھ آیا تو تم نے مجھ سے کہا کہ ہم پر کوئی بادشاہ سلطنت کرے حالانکہ خداوند تمہارا بادشاہ تھا۔ سو اب اس بادشاہ کو دیکھو جسے تم نے چن لیا اور جس کے لئے تم نے درخواست کی تھی دیکھو خداوند نے تم پر بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ اگر تم خداوند سے ڈرتے اس کی پرستش کرتے اور اس کی بات مانتے رہو اور خداوند کے حکم سے سرکشی نہ کرو اور تم اور وہ بادشاہ بھی جو تم پر سلطنت کرتا ہے خداوند اپنے خدا کے پیرو بنے رہو تو خیر۔ پر تم اگر تم خداوند کی بات نہ مانو بلکہ خداوند کے حکم سے سرکشی کرو تو خداوند کا ہاتھ تمہارے خلاف ہوگا جیسے وہ تمہارے باپ دادا کے خلاف ہوتا تھا۔ سو اب ٹھہرے رہو اس بڑے کام کو دیکھو جسے خداوند تمہاری آنکھوں کے سامنے کرے گا"

سموئیل باب ۱۲ ۶-۱۶

ایک طرف سموئیل نبی کی یہ اصلاحی سرگرمیاں تھیں، دوسری طرف طالوت نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ قوم کی تنظیم اور ان کے اندر روح جہاد پیدا کرنے کا کام پورے جوش و خروش کے ساتھ شروع کر دیا۔ چنانچہ انہوں نے عمونیوں کے مقابلے کے لئے بنی اسرائیل کے مردوں کی مردم شماری کرائی تو معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل تین لاکھ اور یہوداہ کے مرد تیس ہزار ہیں۔ پھر عمونیوں پر اس زور کا حملہ کیا کہ وہ بالکل تتر بتر ہو گئے۔ اور دوستوں دشمنوں دونوں پر ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ حالات بلا شبہ ان کے مخالفوں کے لئے مرعوب کن ثابت ہوئے ہوں گے اور اس مرعوبیت کی وجہ سے فلسطیوں نے یہ مناسب سمجھا ہوگا کہ تابوت کو واپس کر کے ایک خوفناک جنگ کے خطرے سے اپنے کو بچا لے جائیں۔ بلا شبہ یہ واقعہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا واقعہ تھا جو طالوت کی اقبال مندی اور ان کے مؤید من اللہ بادشاہ ہونے کا نشان ہو سکتا تھا چنانچہ

قرآن نے یہی کہا ہے اور یہ بات ہر اعتبار سے قرین عقل و قیاس معلوم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ تورات کے اس بیان کی خود تورات ہی کے بیانات سے تردید ہوتی ہے اگر واقعہ یہی ہے کہ فلسطیوں نے سات مہینے کے بعد ہی تابوت کو اس کی کرامات اور اس کے خوارق سے ڈر کر واپس کر دیا تھا تو تورات کے اس بیان کا کیا مطلب ہے۔

"اور جس دن سے صندوق قریت یعریم میں رہا تب سے ایک مدت ہو گئی یعنی بیس برس گزرے اور اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کرتا رہا۔"

سموئیل باب ۱

سوال یہ ہے کہ قریت یعریم اگر بنی اسرائیل ہی کے علاقہ میں شامل تھا اور تابوت انہی کی حفاظت میں تھا تو بیس برس تک اسرائیل کا سارا گھرانا خداوند کے پیچھے نوحہ کیوں کرتا رہا؟ اور اس "خداوند کے پیچھے" کے الفاظ کا کیا مطلب ہے؟

اصل یہ ہے کہ سموئیل میں یہود نے متضاد روایات کا اتنا انبار لگا دیا ہے کہ اس کے اندر حق و باطل کا امتیاز ناممکن ہے۔ یہ قرآن کا احسان ہے کہ اس نے بعض واقعات کے صحیح پہلو نمایاں کیئے۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ، فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ، وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝۲۴۹

"فصل فصولاً" کے معنی کہیں سے چلنے، نکلنے اور روانہ ہونے کے ہیں۔ یعنی طالوت اپنی فوجیں لے کر مہم پر روانہ ہوئے۔ تورات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلسطینیوں کے مقابلہ کے لئے تھی جن کا سردار جاتی جولیت تھا، جس کا ذکر قرآن نے جالوت کے نام سے کیا ہے۔ اس جنگ میں طالوت اور جالوت کی فوجوں کے ایک دوسرے کے بالمقابل فوج آرائی کی جو شکل بیان ہوئی ہے وہ بالکل اس شکل سے ملتی ہے جو ہمارے ہاں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے مابین پیش آئی

سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

"پھر فلستیوں نے جنگ کے لئے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہوداہ کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے اور شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افسدمیم میں خیمہ زن ہوئے اور ساول اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلہ کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لئے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور ان دونوں کے درمیان وادی تھی"

سموئیل باب ۱ - ۳

اس نقشہ پر غور کیجیے اور پھر ایک نظر اس نقشہ پر ڈالئے جو سورۂ انفال میں بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے آمنے سامنے ہونے کا بیان ہوا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ بالکل جنگ بدر کی تصویر ہے۔ تحویل قبلہ کے بعد پہلی جنگ جو کم و بیش دو مہینوں کے بعد پیش آئی ہے وہ یہی بدر کی جنگ ہے۔ اس طرح گویا جنگ بدر کے پیش آنے سے پہلے اس کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کی جنگ میں مسلمانوں کو دکھا دیا تھا۔ ہم سورہ انفال میں یہ واضح کریں گے کہ یہود بدر کا نقشہ دیکھ کر اس حقیقت کو تاڑ گئے تھے لیکن انہوں نے مشرکین کو برانگیختہ کرنے کے معاملہ میں بالکل شیطان کی روش اختیار کی۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اس جنگ میں طالوت کے ساتھیوں کی تعداد بھی کم و بیش اتنی ہی تھی جتنی بدر میں حضورؐ کے ساتھیوں کی تھی۔

"اِنَّ اللّٰہَ مُبۡتَلِیۡکُمۡ بِنَهَرٍ" دشمن کے آمنے سامنے ہونے سے پہلے طالوت نے اپنی فوج کے ڈسپلن اور ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لئے یہ اعلان کیا کہ سامنے جو فلاں ندی ہماری راہ میں آ رہی ہے اس کے ذریعہ سے اللہ تمہاری جانچ کرے گا، تم میں سے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہ بن سکے گا، جو اس کو بالکل نہ پیئے گا وہ میرا ساتھی ہو گا۔ اگر کسی نے ہاتھ سے ایک آدھ چلو پی لیا تو وہ قابل درگذر ہے۔ اس امتحان میں فوج کی اکثریت فیل ہو گئی۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس امتحان میں پورے اتر سکے۔

بنی اسرائیل نے امیر لشکر کا انتخاب تو بڑے ہمہمہ سے کرایا لیکن یہ لوگ نظم اور ڈسپلن کے معاملے میں بالخصوص جہاں جان و مال کی قربانی کا سوال ہو بڑے کچے تھے۔ اس کا اظہار جیسا

کہ اوپر گزرا، سموئیل نبی نے پہلے ہی دن کر دیا تھا۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ انہی کی ہدایت سے طالوت نے اس امتحان کا اعلان کیا تاکہ ان کے کھرے کھوٹے میں پہلے ہی سے امتیاز ہو جائے اور عین میدان جنگ میں ان کے ہاتھوں دھوکا نہ کھانا پڑے، جو سچے ہیں وہ پہلے ہی سے چھٹ کے الگ ہو جائیں یہ امتحان چونکہ سموئیل نبی کی ہدایت کے تحت ہوا اس وجہ سے طالوت نے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا۔ جس ندی کے ذریعہ سے یہ امتحان ہوا اس کا نام یہاں مذکور نہیں اس لئے کہ مقصود امتحان کا ذکر ہے نہ کہ کسی ندی کا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ دریائے اردن ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس وادی کے درمیان کا کوئی چشمہ یا نالا ہو جو دونوں فوجوں کے درمیان حائل تھی۔

اس امتحان میں سو فیصدی کامیابی کے لئے تو شرط یہ تھی کہ اس کا پانی سرے سے کوئی چکھے ہی نہیں ۔ جیسا کہ ارشاد ہے وَمَنْ لَّمْ یَطْعَمْهُ ۔ لیکن ایک آدھ چلو پی لینے کو قابل درگزر قرار دیا گیا تھا لیکن اس کے ساتھ بھی بِیَدِہٖ ، کی قید لگی ہوئی تھی کہ مبادا یہ اجازت کٹورے، گلاس اور ڈونگے تک نوبت پہنچا دے ۔ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ” سے وہ صداقت شعار اور کامل الایمان لوگ مراد ہیں جو اس امتحان میں پورے اترے ۔ یہاں ” اٰمَنُوْا “ کا فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے ایمان پر ثابت قدم رہے ۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ اس امتحان میں بودے ثابت ہوئے وہ اپنے دعوائے ایمان میں بھی منافق تھے ۔

” قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْیَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ “ ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو خوب پانی پی پی کے وہیں ڈھے گئے ۔ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ندی کو پار کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی بلکہ اسی پار سے کھڑے کھڑے انہوں نے آگے بڑھنے والے ساتھیوں کو سنا دیا کہ اب ہم میں جالوت اور اس کی فوجوں سے لڑنے کی ہمت نہیں ۔ یہاں جالوت کے نام لینے سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ اس کی ہیبت ان لوگوں کے دلوں پر بہت تھی ۔

” قَالَ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ الاٰیۃ “ لفظ ظن کی تحقیق ہم آیت ۴۶ کے تحت بیان کر آئے ہیں ۔ یہ اوپر والے بزدلوں کے جواب میں طالوت اور ان کے باایمان ساتھیوں کا قول ہے ان کی خاص صفت جس کا یہاں ذکر فرمایا وہ یہ ہے کہ وہ اللہ سے ملنے کا گمان رکھتے تھے ۔ اس خاص صفت کے ذکر کی وجہ، جیسا کہ آیت ۱۵۴ کے تحت ہم بیان کر آئے ہیں، یہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت

جو خدا کی راہ میں موت کو زندگی سے بھی زیادہ عزیز و محبوب بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس عقیدے سے پیدا ہوتی ہے کہ خدا کی راہ میں قتل ہونے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے ہمت چھوڑ بیٹھنے والے ساتھیوں کو بتا دیا کہ فلسطینیوں کی کثرت تعداد سے مرعوب ہو کر ہمت نہ ہارو، اصل شے تعداد نہیں بلکہ اللہ کی تائید اور اس کی نصرت ہے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ نہایت قلیل التعداد گروہ محض اللہ کے حکم اور اس کی تائید سے دل بادل فوجوں پر غالب آگیا ہے۔ خدا کی تائید حاصل کرنے کیلئے جو چیز مطلوب ہے وہ صبر و استقامت اور عزم و ہمت ہے نہ کہ تعداد کی کثرت و قلت۔ شاید طالوت کے بیٹے یوناتن نے اسی موقع پر وہ فقرہ کہا ہو جو سموئیل میں نقل ہے۔

"سو یونتن نے اس جوان سے جو اس کا سلاح بردار تھا کہا آ ہم اُدھر ان نامختونوں کی چوکی کو چلیں، ممکن ہے کہ خداوند ہمارا کام بنا دے کیونکہ خداوند کے لئے بہتوں یا تھوڑوں کے ذریعے سے بچانے کی قید نہیں"

سموئیل باب ۱۴ ؍ ۶

تورات میں اس امتحان کا ذکر نہیں ہے لیکن اسی سے ملتے جلتے ایک امتحان کا ذکر ہے۔

"اور اسرائیلی مرد اس دن بڑے پریشان تھے کیونکہ ساؤل نے لوگوں کو قسم دے کر یہ کہا تھا کہ جب تک شام نہ ہو اور میں اپنے دشمنوں سے بدلہ نہ لے لوں اس وقت تک اگر کوئی کچھ کھائے تو وہ ملعون ہو۔ اس سبب سے ان لوگوں میں سے کسی نے کھانا چکھا تک نہیں اور سب لوگ جنگل میں جا پہنچے اور وہاں زمین پر شہد تھا اور جب یہ لوگ جنگل میں پہنچ گئے تو دیکھا کہ شہد ٹپک رہا ہے پر کوئی اپنا ہاتھ اپنے منہ تک نہیں لے گیا اس لئے کہ ان کو قسم کا خوف تھا لیکن یونتن نے اپنے باپ کو ان لوگوں کو قسم دیتے نہیں سنا تھا سو اس نے اپنے ہاتھ کے عصا کے سرے کو شہد کے چھتے میں بھونکا اور اپنا ہاتھ اپنے منہ سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں روشنی آئی۔ تب ان لوگوں میں سے ایک نے اس سے کہا کہ تیرے باپ نے لوگوں کو قسم دے کر سخت تاکید کی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص آج کے دن کچھ کھائے وہ ملعون ہو۔ اور لوگ بے دم سے ہو رہے تھے۔ تب یونتن نے کہا

کہ میرے باپ نے ملک کو دکھ دیا ہے، دیکھو، میری آنکھوں میں ذرا سا شہد چکھنے سے کیسی روشنی آئی! کتنا زیادہ اچھا ہوتا اگر سب لوگ دشمن کی لوٹ میں سے جو ان کو ملی دل کھول کر کھاتے .... سو وہ لوگ لوٹ پر گرے اور بھیڑوں، بکریوں، بیلوں اور بچھڑوں کو لے کر ان کو زمین پر ذبح کیا اور خون سمیت کھانے لگے۔"

سموئیل باب ۱۴ ۲۴-۳۲

اس واقعے سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ طالوت نے فلسطینیوں سے جنگ کے موقع پر اپنی فوج کا امتحان لیا تھا اور اس امتحان میں ان کی پوری فوج ناکام رہی تھی یہاں تک کہ طالوت کے بیٹے یونتن بھی، جن کا کردار تورات کے دوسرے بیانات سے نہایت بلند ثابت ہوتا ہے اس امتحان میں نہ صرف یہ کہ ناکام رہے ہے بلکہ مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ انہی کی غلط رہنمائی سے ان قرآن کا بیان مندرجہ ذیل پہلوؤں سے تورات کے بیان سے مختلف ہے۔

ایک یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان اس وقت لیا ہے جب دشمن سے عملاً مڈبھیڑ ہو چکی ہے۔ اور مقصود اس امتحان سے صرف یہ تھا کہ جب تک دشمن کا اچھی طرح قلع قمع نہ ہو جائے لوگ کھانے پینے میں مصروف نہ ہوں۔ برعکس اس کے قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے یہ امتحان دشمن سے مڈبھیڑ ہونے سے پہلے لیا ہے اور مقصود اس سے اپنی فوج کا جائزہ لینا تھا کہ اس میں کتنے ایسے ہیں جو کٹھن حالات میں ثابت قدم رہ سکیں گے اور کتنے محض دکھاوے کے مجنوں ہیں جن کا دعوائے عشق آزمائش کی پہلی ہی چوٹ سے ہرن ہو جائے گا۔

دوسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت نے کھانے کی مناہی کی تھی۔ اس کے برعکس قرآن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مناہی فوج کے مارچ کے دوران میں ایک خاص ندی یا نالے کے پانی کے لئے تھی۔

تیسرا یہ کہ تورات سے ثابت ہوتا ہے کہ طالوت کی پوری فوج اس امتحان میں ناکام رہی یہاں تک کہ خود ان کے فرزند بھی ناکام رہے بلکہ انہی نے پوری فوج کے لئے اس ناکامی کی راہ کھولی۔ اس کے خلاف قرآن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے اندر سے ایک جماعت اپنے عزم و ایمان پر قائم رہی اور اسی کے عزم و ایمان کی بدولت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو فلسطینیوں پر فتح دی۔

اب یا تو یہ مانا جائے کہ تورات میں جو واقعہ بیان ہوا ہے وہ الگ ہے اور قرآن میں جو بیان ہوا ہے وہ الگ۔ یا یہ مانا جائے کہ واقعہ تو ایک ہی ہے، تورات میں اس کو بے احتیاط راویوں نے بالکل مسخ اور بے مقصد بنا کے رکھ دیا ہے قرآن نے اس کو بالحق یعنی بالکل ٹھیک ٹھیک اور اس کے فوائد و مصالح کے ساتھ سنا دیا۔ ان دونوں میں سے جو بات بھی صحیح ہو یہ بہر حال ہر صاحب ذوق تسلیم کرے گا کہ قرآن کا بیان ہر پہلو سے بامقصد، نتیجہ خیز اور پر حکمت ہے۔ برعکس اس کے تورات کا بیان ایک بالکل بے مقصد داستان سرائی ہے۔

بقیہ مضمون تذکرہ و تبصرہ صفحہ ۸ سے آگے

صحیح صحیح اندازہ تو نہیں کر پایا ہوں لیکن اُمید یہی ہے کہ یہ کارآمد اور مستقل مزاج ثابت ہوں گے۔ اب شدید ضرورت اس بات کی محسوس ہو رہی ہے کہ ایک جید عالم کی خدمات پورے وقت کے لئے اس ادارہ کے واسطے حاصل کی جائیں۔ ادارے کے پڑوس میں ایک اسلامی ہاسٹل کی شکل آپ سے آپ پیدا ہو رہی ہے، اب لازماً کام کے دائرے کو وسیع کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہی ہے کہ ایک شخص اپنا پورا وقت ان طلبہ کی تعلیم و تربیت پر صرف کرے۔

ہمارے مخلصین میں سے ڈاکٹر غلام رسول چیمہ صاحب لائلپور نے ادارے کی اعانت میں شرکت کر کے ہماری حوصلہ افزائی کی ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

[illegible]
[illegible] صاحب

عصمتِ انبیاء

عصمتِ انبیاء کا مسئلہ ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ یہود و نصاریٰ نے تو انبیاء علیہم السلام پر ایسے ایسے بہتان لگائے ہیں جن کو سن کر ہر سلیم الفطرت آدمی کا دل کانپ جاتا ہے البتہ مسلمانوں کے درمیان عصمتِ انبیاء کے مسئلہ میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں۔ تاہم چونکہ مختلف لوگوں نے اس سلسلہ میں الگ الگ تعبیریں پیش کی ہیں اس لئے بظاہر یہ مسئلہ مسلمانوں کے ہاں بھی نزاعی اور الجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ذیل کے صفحات میں ہم اس کو واضح کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر خدا کی توفیق شاملِ حال رہی تو اس وضاحت کی روشنی میں ہمارے باہمی اختلافات دور ہو سکتے ہیں۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو صلحاء و ابرار کی نسبت سے گناہ قرار پاتے ہیں، دوسرے عام لوگوں کے گناہ۔ انبیاء کی طرف جب کبھی گناہ یا خطا کی نسبت کی جاتی ہے تو اس سے مراد پہلی ہی قسم کے گناہ ہوتے ہیں۔

علماء کی اس بات کو اگر مزید کھولا جائے تو یہ بہت قوی معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ بندے کا مؤاخذہ اس چیز میں ہوتا ہے جو اس پر واجب کی گئی ہو۔ حیوانات کو دیکھئے، ہمارے احکام ان پر نافذ نہیں ہوتے اسی طرح مختلف امتوں کا مؤاخذہ انہی امور میں ہوا جو ان پر فرض کئے گئے تھے۔ مؤاخذہ کے اس قانون کا اطلاق جس طرح ہماری عام زندگی میں ہے اسی طرح اس کے تحت انبیاء سے بھی باز پرس ہوتی ہے۔

اوپر ہم بیان کر چکے ہیں اور عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے بھی یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے ہمیشہ فرضِ رسالت کی ادائیگی کے لئے انہی لوگوں کو چنا ہے جو اس کی مخلوق میں اخلاق و تقویٰ کے لحاظ سے نقطہ کمال پر رہے ہیں۔ چنانچہ فرمایا

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بوجھ کس پر ڈالے۔

حضرت سرورِ کائنات کی نسبت فرمایا

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (قلم-۴) بیشک تم ایک خلقِ عظیم پر ہو۔

اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا گیا اور بقیہ تمام مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، جب آپ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہوئے تب آپ کا انتخاب فرضِ رسالت کی ذمہ داریوں کے لئے عمل میں آیا۔

اس برگزیدگی کے بعد اللہ تعالیٰ انبیاء کی تربیت فرماتا ہے، ان کو اپنے امر و نہی سے مطلع فرماتا ہے اور جن چیزوں سے وہ ناواقف ہوتے ہیں ان کو ان کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اس کے اشاروں پر چلتے اور اس کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا (بیشک تو ہماری نگاہوں میں ہے) دوسرے مقام پر فرمایا ہے۔

فَاِنَّہٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْہِ وَمِنْ خَلْفِہٖ رَصَدًا ۝ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّہِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْہِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۝ (جن ۲۷-۲۸)

پس وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور ان کے سارے معاملات اس کے احاطہ میں ہیں اور اس نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

یعنی عالمِ غیب کی ایک مخصوص نگاہ انبیاء کرام کی نگرانی کرتی رہتی ہے اور ان کو لغزشوں سے بچاتی ہے قبل اس کے کہ وہ کسی غلط راہ پر قدم رکھیں خدا کا ہاتھ ان کی رہنمائی کے لئے نمودار ہو جاتا ہے۔ اگر کبھی وہ کسی پرخطر راہ میں نکل جاتے ہیں تو صرف اتنی دیر تک کے لئے ان کو وہاں چھوڑا جاتا ہے جتنی دیر میں وہ اپنے فرضِ نبوت اور منصبِ دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو ادا کر لیں، اس سے زیادہ ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔

پس جب کبھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے رسول کے قدم کسی ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں لغزش کا اندیشہ ہے تو وہ فوراً اس کو تنبیہہ کر دیتا ہے ۔ اور اگر وہ جوش و انہماک میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو بعض اوقات نہایت کھلے لفظوں میں بلکہ باندازِ عتاب اس کو روکا جاتا ہے ۔ تاکہ جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے اس کی اصلی اہمیت اس کے سامنے واضح ہو جائے ۔ پیغمبر اس وقت چونک جاتا ہے اور سامنے کے خطرہ کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے کہ اگر خدا کے غیر مرئی ہاتھ نے رہنمائی نہ کر دی ہوتی تو وہ تو بالکل خطرہ کے قریب پہنچ چکا تھا ۔ یہ چیز اس کے شکر و انابت کے جذبہ میں ایک جوش پیدا کرتی ہے اور وہ خضوع و خشوع کی تمام نیازمندیوں کے ساتھ اپنے پروردگار کے سامنے گر پڑتا ہے اور اس سے اور زیادہ قریب ہو جاتا ہے ، بالکل اسیطرح جیطرح بچہ ماں کے ڈرا دینے کے بعد اس کے سینے سے اور زیادہ چمٹ جاتا ہے ۔

الغرض پیغمبر کا رجحان ہر حالت میں بھلائی اور نیکی ہی کی طرف ہوتا ہے ۔ اس کا دل ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہوتا ہے ۔ اس کا ہر قدم مرضیات الٰہی کی راہ میں اٹھتا ہے لیکن اسی راہ میں کبھی کبھی وہ افراط کی حالت اختیار کر لیتا ہے ۔ جادۂ حق پر ثابت قدمی ، اولوالعزمی اور بیدار مغزی میں یہ افراط و تفریط اور اپنے مشن کی تکمیل کی راہ میں خدشات ، اندیشوں اور غم کا لاحق ہونا وہ امور ہیں جو انبیاء و رسل کے لئے " گناہ " قرار پاتے ہیں ۔ لیکن جب کبھی نبی اس حالت سے دوچار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حق و اعتدال کی بیچ راہ پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کے لئے نمونہ اور اُمت کا قبلہ و مرکز ہوتا ہے ۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات پیروی و اقتداء کے لئے ہوتی ہے پس اس کے کسی فعل میں اگر افراط کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو اس سے تمام اُمت کی راہ کج ہو سکتی ہے ۔

پیغمبروں کے مواقعِ عتاب

چونکہ باطن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور نبی انسانوں کے باطن سے بے خبر ہوتا ہے ، اس لئے پیغمبر کبھی کسی شخص کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوتا ۔ کوئی شخص انکار و سرکشی کی کتنی ہی شدید حالت اختیار کر لے لیکن وہ ایک غمگسار دوست اور ایک ہمدرد طبیب کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر نہ کر دیا جائے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے ، ایمان

نہ لائے گا، نبی اس کے ایمان و ہدایت سے مایوس نہیں ہوتا۔ البتہ جب اللہ تعالیٰ خود اعلان کر دیتا ہے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، اب اس پر ایمان و ہدایت کی راہ باز نہ ہوگی، اس سے علیحدگی اختیار کر لو تو نبی اس سے برأت کا اعلان کر دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے لئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے رافت و محبت کی وجہ سے بخشش کی دعا کی تو ان کو اس پر ٹوکا گیا لیکن جب حقیقت حال ان پر واضح کر دی گئی تو انہوں نے ان سے برأت کا اظہار کر دیا۔ اس معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ۔ (توبہ ۱۱۴)

پس جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ (آزر) اللہ کا دشمن ہے تو وہ اس سے علیحدہ ہو گیا۔ بیشک ابراہیم بہت ہی دردمند اور بردبار تھا۔

اسی طرح جب حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ نے فرعون کی تباہی کی دعا کی تو ان کو تنبیہ کی گئی کہ اس کے بعد آل فرعون کے لئے رافت و رحمت کا اظہار نہ کریں اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلے جب کبھی قوم فرعون پر عذاب آیا تو حضرت موسیٰ فرعون کی درخواست پر خدا سے یہ دعا کرتے کہ وہ اسے عذاب سے نجات دے دے۔ مگر ہر بار فرعون پھر وعدہ خلافی کرتا اور ایمان نہ لاتا۔ فرمایا

قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰۗنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (یونس ۸۹)

کہا تمہاری دعا قبول کر لی گئی، پس تم اس پر ثابت قدم رہنا اور ان لوگوں کے راستے پر نہ چلنا جو نہیں جانتے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رافت و رحمت کے اس تعلق کی بنا پر جو آپ کو اپنی ازواج کے ساتھ تھا شہد کا کھانا موقوف کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے معاملے کی حقیقت سے آپ کو آگاہ کیا کہ اس کے نتیجے میں لوگ ایک حلال چیز سے دستکش ہو جائیں گے اور رہبانیت کی طرف مائل ہوں گے۔ کبھی کبھی اس کے برعکس حالت بھی پیش آتی ہے یعنی پیغمبر کسی جماعت کی سرکشی اور تمرد کو دیکھ کر اس کے ایمان و ہدایت کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے حالانکہ وہ جماعت ابھی اس حد کو نہیں پہنچی ہوتی ہے کہ اس سے مایوس ہو جایا جائے۔ اس کے جینے اور پنپنے کی ایک علمی سی

اس کا اصل عمل ہے۔ ان حالات میں پیغمبر کی ایذا کہاں سے باعث از طلب حکم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر تبلیغ و دعوت کا جہاد جاری رکھے اور جب تک حکم خداوندی نہ ہو وہ حق کو کتنی ہی بیہودگی کے ساتھ ٹھکرائیں، وہ ان کو نہ چھوڑے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے۔

غرض کبھی نبی کے کمال رحمت و شفقت پر عتاب ہوتا ہے اور کبھی کمال غیرت حق پر۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہیں۔

نبی معصیت کا مرتکب نہیں ہو سکتا

ہم بیان کر چکے ہیں کہ نبی کی زندگی تمام تر خدا کی نگرانی میں بسر ہوتی ہے اور جب کبھی اس کے پائے ثبات میں لغزش آنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تھام لیتا ہے۔ اسی لئے نبی معصیت کا مرتکب کبھی نہیں ہوتا۔ قرآن میں نبی کی خطا کے لئے معصیت کا لفظ صرف ایک موقع پر استعمال ہوا ہے اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کے قصہ میں ہے۔ لیکن وہاں بھی جو حقیقت حال قرآن نے بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ آدمؑ نے شجر ممنوعہ کو عمداً کھا کر خدا کی نافرمانی نہیں کی بلکہ وہ اپنے عزم کی کمزوری کے باعث خدا کے ساتھ اپنے عہد کو بھول گئے تھے۔ چنانچہ جب شیطان نے ان کا خیر خواہ ہونے کی قسم کھائی تو وہ اس کے بہکانے میں آ گئے اور بھولے سے ممنوعہ پھل کھا لیا۔ قرآن میں آتا ہے۔

وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ۝ (طٰہٰ ۱۲۱، ۱۲۲)

اور آدم نے اپنے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی اور بہک گیا۔ پھر پروردگار نے اسی کو منتخب کر لیا تو اس کی توبہ قبول کر لی اور ہدایت بخشی۔

دوسرے موقع پر فرمایا

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝ (طٰہٰ ۱۱۵)

اور ہم نے پہلے آدم سے عہد لیا تھا مگر وہ اسے بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔

مزید برآں قرآن سے یہ بھی ثابت ہے کہ آدمؑ سے یہ خطا اس وقت سرزد ہوئی تھی جب تک انہیں نبوت سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا۔ فرمایا

ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى

پھر اس کے رب نے اسے منتخب کر لیا تو اس کی

(ظلہ ۱۲۲) توبہ قبول کی اور ہدایت بخشی۔

در قرآن کے نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ اجتبٰی کا لفظ نبوت ہی کی تعبیر کے لئے آتا ہے۔
یوں بھی دیکھا جائے تو آدمؑ کے قیام جنت کے زمانہ میں ان کی نبوت کا کوئی موقع نہ تھا۔
اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ بھول چوک (نسیان) پر کوئی مواخذہ نہیں ہوا کرتا، پھر آدمؑ پر اس معاملہ میں کیوں گرفت ہوئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ ابرار کے لئے وہ نسیان بھی گناہ کے دائرہ میں آتا ہے جو کسی ایسے معاملہ میں ہو جس میں رب نے ان کو تلقین کر دی ہو۔

نبی کے سوا کوئی معصوم نہیں ہوتا

نبی کے سوا کوئی انسان معصوم نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ غیر نبی لازماً گناہ کرتا ہے بلکہ ہماری مراد صرف یہ ہے کہ غیر نبی کی معصومیت کا ہمیں اعتماد اور یقین حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اگر اسے بھی معصوم سمجھ کر ہم ہر معاملہ میں اس کی پیروی شروع کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اس کو وہ درجہ دے دیا جو فی الحقیقت ایک نبی کا درجہ ہے۔

قرآن نے ہمیں بتایا ہے کہ نبی دنیا سے اسی وقت رخصت ہوتا ہے جب وہ لوگوں کے لئے صراط مستقیم کو واضح کر چکتا ہے۔ اگر لوگ اپنی خواہشات کے پیچھے چل کر یا سرکش حکمرانوں کی پیروی میں حق کی راہ کو اختیار نہ کریں تو اس کا گناہ انہی پر ہوگا۔ خدا نے جب ایک مرتبہ حجت تمام کر دی اور مشعل ہدایت روشن کر دی تو اب اس کی ذمہ داری یہ نہیں کہ وہ ہر زمانے میں ایسے معصوم اشخاص بھیجتا رہے جو رسولوں کی طرح خدا کی خصوصی عنایت سے تربیت پائے ہوئے ہوں بحقیقت میں نبی کے بعد یہ اُمت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ یہ احساس رکھے کہ اس کا مواخذہ اسی تعلیم کے مطابق ہوگا جو خدا نے نبی پر اُتاری۔ ذمہ داری کے اسی احساس کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلافت کے بعد اپنے پہلے ہی خطبہ میں یہ واضح کیا کہ میں اسی راستہ کی پیروی کروں گا جس کی تکمیل اللہ تعالٰی نے کر دی ہے۔ اور اب کسی ایسے کام کی گنجائش نہیں جو بدعت ہو یا حکم شریعت کے خلاف ہو۔
اسی طرح حضرت عمرؓ نے اُمت کی اس ذمہ داری کا اقرار کرتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ اُمت میں ایسے لوگ موجود ہیں جو عدل و انصاف کے علمبردار ہیں اور ہر کجی کو سیدھا کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نبی کے بعد کسی قائد یا امیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ لوگوں سے اپنی غیر مشروط پیروی کرائے ۔ اس کا اختیار بس اسی قدر ہے کہ وہ لوگوں کو معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے ۔ قرآن نے اس مسئلہ کی یوں وضاحت فرمائی ہے ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا ۔ (نساء ۵۹)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی بھی جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ۔ اور اگر کسی بات میں تمہارے درمیان اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو ۔ یہ بات تمہارے لئے بہتر اور انجام کے لحاظ سے اچھی ہے ۔

اس آیت سے قرآن نے ہمیں دو حقیقتوں کی تعلیم دی ہے ۔ ایک یہ کہ خدا اور رسول کے حکم کی اطاعت واجب ہے؛ اس میں کسی نزاع کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا ۔ البتہ اگر اولوالامر کی جانب سے کوئی ایسی بات سامنے آئے جس میں نزاع پیدا ہوتا ہو تو اس صورتِ حال کا علاج لازماً ہونا چاہیئے ۔ دوسری یہ کہ اس شکل میں بھی قضیہ خدا اور رسول ہی کی طرف فیصلے کے لئے لوٹانا چاہیئے ۔ گویا اس آیت میں یہ محکم اصول بیان کر دیا کہ اللہ اور رسول کے علاوہ کسی کی مطلق اطاعت باطل ہے ۔

اس آیت میں "اطیعوا" کے تکرار سے یہ تعلیم دینی مقصود ہے کہ رسول کی اطاعت ہمارے اوپر مستقلاً واجب ہے کیونکہ وہ ہر وقت اللہ کی نگرانی اور حفاظت میں ہوتا ہے ۔ رسول کے سوا یہ حق کسی کو حاصل نہیں ۔ اس سے واضح ہوا کہ نہ تو کسی غیر نبی کو معصومیت کا دعویٰ کرنے کا اختیار حاصل ہے اور نہ ہمیں اس کی اجازت ہے کہ ہم اس کا یہ مقام تسلیم کریں ۔

مقالات

امین احسن اصلاحی

مولانا محمد علی مدرسۃ الاصلاح میں

فاضل محترم مولانا رئیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کر دوں۔ میں اس فرمائش کی تعمیل کے لئے آمادہ تو ہو گیا ہوں لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے تحریک خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۲۱ء یا ۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر ضلع اعظم گڑھ، یو۔ پی بھارت) کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالب علم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرسہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے اکابر و مشاہیر بھی تشریف لائے، میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کسی جلسہ میں کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔ بڑا عظیم اجتماع تھا، میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا، جلسہ کھلے میدان میں تھا۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سنی نہ جا سکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا لیکن جب مولانا تقریر کے لئے کھڑے ہوئے تو اُن کے رُعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر دیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا وہیں پیکرِ تصویر بن کر رہ گیا ــــــــ

مولانا کی بلند اور پرشکوہ آواز ہوا کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچ رہی تھی اور تقریر کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ یہ مجمع بالکل دیہاتیوں کا تھا، اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے، ان دیہاتیوں کے لئے مولانا محمد علیؒ جیسے شخص کی کسی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا لیکن ان کی تقریر میں ایمان و یقین کی ایسی گرمی اور سوز و درد کی ایسی گھلاوٹ تھی کہ اس سے متاثر ہونے کیلئے شائد اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جو قابلِ ذکر ہے۔ مولاناؒ کی تقریر جب ختم ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک کنارے سے ایک بوڑھا دیہاتی اُٹھا اور وہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا اسٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا پکا نکلا کہ اس نے مولاناؒ کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی اُن کی ڈاڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجہ میں بولا کہ:

"محمد علی! جو تو نے کیا وہ کسی سے نہ ہو سکا" یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولاناؒ نے فرمایا۔ کہ:

"اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی"

اس موقع پر مولاناؒ کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہیؒ کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے، مولانا محمد علیؒ اعظم گڑھ شہر کے لئے روانہ ہو گئے جہاں شب میں اُن کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنی تھی، وہ گئے تو ان کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کا سارا جلسہ بھی چلا گیا، یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے ان کی تقریر میں شرکت کے لئے اُن کے ساتھ چلے گئے۔ انہوں نے چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں اُن کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڑھ میں ہونے والی مولانا محمد علیؒ کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لئے نہایت حیرت انگیز تھا، میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہیؒ مولانا محمد علیؒ اور مولانا آزاد سے محبت کرتے ہیں لیکن ان میں سے کسی کی تقریر سے مولانا کا اس درجہ متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں میرے تصور سے مافوق تھا۔ مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے، نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے

وہ جیسا کہ میں نے اُوپر عرض کیا، عام تقریر کے جلسوں میں خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی، کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے لیکن مولانا محمد علیؒ کی تقریر میں شریک ہونے کے لئے نہ صرف یہ کہ سفر کے لئے آمادہ ہو گئے بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لئے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علیؒ کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسے بلند پایہ آدمی ہیں کہ مولانا فراہی جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مولانا محمد علیؒ کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے — دوسری صبح کو جب مولانا فراہیؒ مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی کے ساتھ اُن کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

"جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں۔ اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی"۔

مولانا نے یہ بات اس اعتماد اور یقین کے ساتھ فرمائی کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا کو مدرسہ کے جلسہ کے درہم برہم ہو جانے کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں ہے۔ ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علی نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ سُن لی تھیں۔ اس کے بعد جلسہ کا جاری رہنا ان کے نزدیک گویا اضاعتِ وقت کے حکم میں تھا۔ مولانا نے اس کے بعد متعدد بار مولانا محمد علی کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

"محمد علی کی تقریر میں ایمان ہوتا ہے"۔

ایک مرتبہ بطور لطیفہ کے یہ بھی فرمایا کہ:

"چونکہ محمد علی بہت ذہین آدمی ہیں اس وجہ سے لوگوں کو قرآن کے نظم کی طرح ان کی تقریروں اور تحریروں کے نظم کو سمجھنے میں بھی بسا اوقات زحمت پیش آتی ہے"۔

پھر فرمایا کہ:

"کچھ اسی قسم کا حال مولانا محمد قاسمؒ کی تقریروں اور تحریروں کا بھی ہے۔"

اگرچہ بڑوں کے اس ذکر کے درمیان اپنا بیان کچھ مناسب نہیں لیکن جن کا کل سرمایۂ زندگی صرف وہ چند چھوٹی بڑی نسبتیں ہی ہوں جو بڑوں سے اُن کو حاصل ہوئیں وہ اگر ان کو بیان نہ کریں تو آخر اپنے طرۂ افتخار کی آرائش کے لئے سامان کہاں سے لائیں گے۔ اس وجہ سے مجھے یہ واقعہ ذکر کرنے کی اجازت دیجئے کہ یہی جلسہ جس کا اوپر ذکر ہوا' اوّل اوّل مجھے پبلک میں روشناس کرانے کا ذریعہ بنا۔ وہ اس طرح کہ مجھے مدرسہ کی تعلیم و تربیت کا نمونہ دکھانے کے لئے مدرسہ کے ذمہ داروں کی طرف سے اس جلسہ میں ایک تقریر کرنے کی ہدایت کی گئی۔ چنانچہ میں نے اس میں ایک تقریر کی۔ یہ تقریر میری اپنی ہی تیار کردہ تھی اور اگرچہ کسی پبلک جلسہ میں یہ میری بالکل پہلی تقریر تھی لیکن میری عمر اور علم کے اعتبار سے نہایت کامیاب رہی ــــ مولانا محمد علیؒ اور اسٹیج پر بیٹھے ہوئے دوسرے اکابر نے اس کی بڑی تحسین فرمائی۔ یہاں تک کہ مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے بصلۂ حسن تقریر اپنے تفسیری رسائل کا ایک سیٹ اپنے دستخط سے مزین فرما کر مجھے بطور انعام عنایت فرمایا۔ اس کے بعد مجھے دور دور سے جلسوں کی شرکت کے لئے دعوت نامے ملنے لگے اور میں کبھی کبھی جلسوں میں شریک بھی ہونے لگا۔ لیکن میں نے یہ لَے زیادہ بڑھنے نہیں دی' اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے استاذ مولانا فراہیؒ زیادہ تقریریں کرنے کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ تو اُنہوں نے مجھ سے یہاں تک فرمایا کہ زیادہ تقریریں کرنے سے آدمی کا دل سیاہ ہو جایا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس چیز کو وہ اس درجہ ناپسند فرماتے ہوں اس کی طرف زیادہ راغب ہونا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔

تقریظ و تنقید

قرآنی حقائق تصوف کے آئینہ میں

تالیف : صاحبزادہ محمد عمر سجادہ نشین بیربل

صفحات : ۲۱۰ قیمت درج نہیں

ناشر : ادارہ تصوف - نظام بلڈنگ موہنی روڈ لاہور

اس کتاب کے مصنف تصوف کی اس قسم کے علمبردار ہیں جس کو علمائے دین نے ہمیشہ ضلالت سمجھا ہے - ان کے نزدیک علم شریعت ایک جسد اور طریقت اس کی روح ہے، اس لئے حقیقت شناسی کے جس مقام پر ایک ولی فائز ہوتا ہے، ایک صاحب شریعت نبی کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی - مزید برآں نبی کی تعلیم فرشتے کے واسطے سے ہوتی ہے جب کہ ایک ولی تجلیاتِ ربانی سے براہ راست فیضیاب ہوتا ہے - فاضل مصنف جہاد اور طلب رزق کے کاموں کو بھی کچھ غیر ضروری قرار دیتے ہیں اور بدر و اُحد کے سپہ سالار اور حنین و تبوک کے فاتح نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حقیقی مشن کو بھی انہوں نے ترکِ دنیا ہی سمجھا ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر نبی کے لئے انہوں نے جگہ جگہ جس بے ادبی کا مظاہرہ کیا ہے وہ بڑا ہی افسوسناک ہے۔

ہمارے نزدیک فاضل مصنف کے یہ تمام خیالات قرآن و سنت کی تعلیمات کے خلاف اور خود تصوف کے لئے رسواکن ہیں - ہمیں تو ان لوگوں کی سلیم الفطرتی پر شبہ ہوتا ہے جو اپنے اوہام و تصورات اور ظن و تخمین کو اس علم و ہدایت پر ترجیح دیتے ہیں جس کو خدا نے "العلم" (علم حقیقی) اور "الہدیٰ" (ہدایت حقیقی) کے ناموں سے موسوم فرمایا ہے - جہاں تک سورۂ کہف کے مضامین سے ان کے استدلال کا تعلق ہے اس کے بارے میں ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ کاش وہ "قرآنی حقائق کو تصوف کے آئینہ میں" دیکھنے کے بجائے تصوف کے حقائق کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش

فرماتے۔

کتاب مجلد ہے اور سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ اس میں جس طرح معنوی اغلاط کی کمی نہیں اسی طرح عبارت کی غلطیاں بھی اس میں کافی نظر آتی ہیں۔

(خ - م)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

DELHI.

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد نمبر ۱۰ شمارہ (۸)

ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ

فہرست مضامین

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ:-

مینجر ماہنامہ میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

تذکرہ وتبصرہ

خدا کا شکر ہے کہ بعض دوستوں کی توجہ اور قدر دانی سے تفسیر تدبر قرآن کی پہلی جلد کی طباعت کی کچھ شکل پیدا ہو رہی ہے۔ میں تو مایوس تھا کہ بھلا اس گرانی کے زمانے میں سات آٹھ سو صفحات کی ایک ضخیم کتاب چھاپنے یا چھپوانے کی ہمت کون کریگا لیکن ایک عزیز دوست آئے اور انھوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ وہ ایک اور ساتھی کے تعاون سے کتاب کی طباعت و اشاعت کا منصوبہ بنا رہے ہیں اور خدا نے چاہا تو اس منصوبہ کے بروئے کار آنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ مزید اطمینان انھوں نے یہ دلایا کہ وہ کتاب کو اعلیٰ معیار کتابت و طباعت پر چھاپیں گے جس کو اہل ذوق پسند کریں گے۔ اگرچہ ابھی یہ بات عالم خیال میں ہے۔ اس خیال کے عمل میں آنے میں کچھ وقت لگیگا، لیکن اس سے مجھے بے اندازہ خوشی ہوئی ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ کاش یہ کتاب میری زندگی میں چھپ جائے اور میں مرنے سے پہلے اس کو دیکھ لوں۔ میں اس آرزو کو بہت بعید چیز سمجھتا تھا اور میرے وسائل و امکانات کے لحاظ سے یہ چیز بعید تھی بھی لیکن اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز بھی بعید نہیں ہے۔ اس نے بالکل ٹھیک وقت پر اس آرزو کی تکمیل کی شکل پیدا کر دی اور ایسی شکل پیدا کر دی جو مختلف پہلوؤں سے میرے لئے قابل اعتماد ہے۔

اب میں نے آگے کے کام کے ساتھ ساتھ کتاب کی نظر ثانی کا کام بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کام میں کتاب کے قدر دانوں کا تھوڑا سا تعاون مطلوب ہے۔ امید ہے کہ جو اصحاب علم میثاق میں اس تفسیر کی قسطیں پڑھتے رہے ہیں وہ مندرجہ ذیل امور سے متعلق اپنی رایوں سے مجھے ضرور آگا

مانگے تاکہ نظرِ ثانی اور کتابت و طباعت میں ان کا لحاظ رکھا جا سکے۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ اگر کسی صاحب نے کہیں کوئی غلطی یا کسی بحث میں کوئی خلا محسوس کیا ہو تو وہ از راہِ علم دوستی اس سے مجھے ضرور مطلع فرمائیں۔ میں انشاء اللہ پوری سنجیدگی اور بے تعصبی کے ساتھ اس نوعیت کے تمام مشوروں پر غور کرونگا اور مفید مشوروں کو قبول کرکے ان کی روشنی میں مسودے میں اصلاح یا ترمیم یا اضافہ کردونگا اور ایسے تمام اصحاب کا دیباچۂ کتاب میں سچے دل سے شکریہ ادا کرونگا۔ میری یہ گزارش ان حضرات سے خاص طور پر ہے جو اہلِ علم کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہوں نے میثاق میں تفسیر کے صفحات غور سے پڑھے ہیں۔ بعض اصحابِ علم نے وقتاً فوقتاً جن چیزوں کی طرف توجہ دلائی ہے وہ میرے پیشِ نظر ہیں۔ میں ان سے فائدہ اُٹھاؤں گا۔ بلکہ بعض مشورے تو میں نے عملاً قبول بھی کر لئے ہیں۔ مثلاً پہلے آیات ناتمام درج کی جاتی تھیں، اب ہر آیت پوری درج کی جاتی ہے تاکہ ان کے تحت تحقیق الفاظ اور تاویل آیات کے سلسلے میں جو کچھ لکھا جاتا ہے آیت کے ساتھ اس کی مطابقت سمجھنے میں قارئین کو کوئی زحمت نہ پیش آئے۔ اگرچہ اس تبدیلی کے سبب سے کتاب کے حجم میں کچھ اضافہ ہو جائیگا لیکن بعض لوگوں نے اس کی طرف توجہ بھی دلائی اور مجھے اس پہلو سے بھی یہ بات پسند آئی کہ یہ طریقہ ہمارے پچھلے مفسرین کے طریقہ کے موافق ہے۔

تفسیر کی کتاب میں مرکزی یا ذیلی عنوانات قائم کرنے کا مسئلہ بڑا مشکل ہوتا ہے۔ میں اس امر پر برابر غور کرتا رہا لیکن کوئی قابلِ اطمینان شکل سمجھ میں نہیں آئی۔ عنوانات اور فہرستِ مطالب کے بغیر اس زمانے میں کسی چھوٹی سے چھوٹی کتاب کی اشاعت بھی خلافِ مذاق ہے چہ جائیکہ سات آٹھ سو صفحے کی ضخیم کتاب۔ چنانچہ میں نے ذیلی عنوانات قائم کرنے شروع کر دیئے ہیں جس کا نمونہ میثاق کی پچھلی اشاعت میں ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ یہی صورت پوری کتاب میں اختیار کی جائیگی اور پھر اسی کی مدد سے انڈکس تیار کر لیا جائیگا۔ اگر کسی صاحب کے ذہن میں اس سے بہتر کوئی تجویز ہو جو کتاب کے مطالب تک اس سے زیادہ سہل طریقے سے رہنمائی کر سکے تو اس سے آگاہ فرمائیں۔ ہم اس سلسلے کی ہر مفید تجویز کا خیر مقدم کرینگے۔

کتاب کی کتابت، طباعت، تصحیح، تقطیع اور کاغذ سے متعلق بھی اگر واقف کار حضرات کوئی مشورہ دیں گے تو ان شاء اللہ وہ بھی ضائع نہیں جائیگا۔ اس گرانی کے زمانے میں کسی بہت اونچے اہتمام کی توقع تو نہیں کرنی چاہیئے یہی غنیمت ہے کہ کتاب کسی طرح چھپ جائے لیکن بہرحال کوشش یہی ہوگی کہ کتاب چھپنے کے بعد ظاہری اعتبار سے بھی باوقعت نظر آئے اس وجہ سے وہ تمام مشورے قابلِ قبول ہونگے جو سادگی و پرکاری کی

نوعیت کے ہوں گے ۔ یعنی جن سے کتاب کے حسن میں تو اضافہ ہو لیکن چھاپنے والوں کی ہمت پر کوئی برا اثر نہ پڑے ۔

اب تک اس تفسیر سے متعلق اصحاب علم کی جو رائیں مجھے وقتاً فوقتاً معلوم ہوتی رہی ہیں میں نے ان صفحات میں ان کا کوئی ذکر نہیں کیا کہ اس میں خودستائی کا ایک شائبہ تھا لیکن میں ان رایوں کی روشنی میں اس نتیجہ تک ضرور پہنچا ہوں کہ اس کے قدردانوں کا حلقہ اگرچہ زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن جو ہے وہ بہت گہرے طور پر اس طرز فکر سے متاثر ہوا ہے جو اس کتاب میں اختیار کیا گیا ہے ۔ ان متاثر ہونے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جو پہلے سے قرآن سے دلچسپی رکھتے رہے ہیں یا اس کی مشکلات کا ان کو کچھ تجربہ تھا ۔ کچھ عرصہ ہوا ایک عالی مرتبہ عالم دین نے مجھے لکھا کہ اگر میثاق کے قارئین تم سے یہ مطالبہ کریں کہ اس میں تفسیر کے سوا کچھ نہ ہو تو میں اس مطالبے میں اُن کو حق بجانب سمجھوں گا ۔ اسی طرح ایک دن دو پروفیسر صاحبان میرے پاس آئے ، ان کے ذہن میں قرآن کے بعض مقامات سے متعلق سوالات تھے انہوں نے مجھے بتایا کہ ان سوالات کے لئے ہم فلاں صاحب (ایک مشہور عالم دین کا نام لیا جو قرآن کا درس بھی دیتے ہیں) کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے ۔ انہوں نے ہمیں تم سے ملنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ قرآن کی مشکلات سے متعلق جو کچھ پوچھنا ہو اسی سے پوچھا کرو ۔ مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوا اس لئے کہ انہوں نے جن لائق احترام عالم دین کا نام لیا تھا ان سے نہ صرف یہ کہ میری ملاقات نہیں ہے بلکہ اغلب ہے کہ میرے اور انکے نظریات میں اختلاف بھی ہو گا لیکن معلوم ہوا کہ وہ بڑی بے تعصبی سے نہ صرف میثاق میں تفسیر کے صفحات خود پڑھتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کے مطالعہ کی تاکید فرماتے ہیں ۔ اصحاب علم میں سے دو صاحبوں نے اس کے انگریزی ترجمہ کی اور ایک صاحب نے اس کے عربی ترجمہ کی مجھے پیشکش کی بلکہ انگریزی ترجمہ تو ایک قدردان نے غالباً شروع بھی کر دیا ہے ۔ پاکستان اور بھارت میں متعدد اصحاب علم نے اسی نہج پر درس قرآن شروع کر رکھا ہے اور انہیں ہر ماہ میثاق کے تفسیری صفحات کا نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار رہتا ہے ۔ متعدد حضرات نے اس بات کی مجھ سے خواہش کی کہ اگر میں ان کو اجازت دے دوں تو وہ اپنی ملازمتیں چھوڑ کر درس قرآن کے لئے میرے پاس آجائیں گے لیکن میں نے ان کو اس خیال سے اجازت نہ دی کہ ملازمت کے سوا ان بیچاروں کا کوئی اور ذریعہ معاش نہ تھا ۔ پچھلے دنوں ایک مخلص نے (جن سے میرا تعارف کچھ سرسری ہی سا ہے اور جنہوں نے شاید زندگی میں خط بھی مجھے صرف یہ ایک ہی لکھا ہے) مجھے لکھا کہ میں دُعا کرتا

یں کہ اللہ تعالیٰ میری باقی عمر تمہیں دیدے کہ تم تفسیر مکمل کر سکو۔ ایک دن اس ملک کی سیاسی اور صحافتی ندگی کے ایک مشہور رکن بالکل بے سان گمان تشریف لائے اور بڑی دیر تک میری ناچیز تصنیفات ر تفسیر سے متعلق دریافت حال فرماتے رہے۔ پھر فرمایا کہ جی چاہتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر تمہارے حلقہ ہ قرآن میں شامل ہو جاؤں۔ اسی طرح ایک صبح کو ایک صاحب تشریف لائے، میری صحت اور علمی رگرمیوں سے متعلق انہوں نے کچھ سوالات کئے، پھر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ آپ تو مجھے کیا جانتے و نگے، میں بھی یہ پہلی ہی بار آپ سے ملا ہوں، میں ایک خاص مقصد سے آیا تھا اور الحمدللہ پر اطمینان ہو کر جا رہا ہوں۔ جب میں نے مقصد کی وضاحت چاہی تو بولے کہ یہ دیکھنے آیا تھا کہ تم عمر کے کس مرحلے یں ہو اور صحت کا کیا حال ہے، جو تفسیر لکھ رہے ہو وہ مکمل کر سکو گے یا نہیں؟ الحمدللہ مجھے اطمینان ہو گیا کہ ابھی بہت کام کر سکو گے، تفسیر بڑے اطمینان سے مکمل ہو جائے گی۔

میں خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی اور اپنے کسی کام کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ جب موت کا سوال سامنے آتا ہے تو مجھے اس پہلو سے کبھی اس سے ڈر نہیں ہوا کہ میری ذات سے کوئی بڑا کام وابستہ ہے جو ناتمام رہ جائے گا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ میں کیا اور میرا علم کیا۔ میں علم اور عمل دونوں چیزوں سے ایک بالکل تہی دامن انسان ہوں البتہ گناہوں سے لدا ہوا ہوں اس وجہ سے موت سے ڈرتا ہوں اور ہر صبح کو اپنے رب غفار و ستار سے دعا کرتا ہوں کہ اے رب موت دینے سے پہلے کوئی کام مجھ سے ایسا لے جو تجھے پسند ہو لیکن کبھی کبھی دبی زبان سے یہ بھی کہہ گزرتا ہوں کہ اس کے بغیر میں مرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، یوں تو ہر حال میں تیری ہی مرضی بالا رہیگی۔ بس تفسیر کے کام کی اگر کوئی اہمیت ہے تو اسی پہلو سے ہے کہ شاید یہ حقیر خدمت مالک کی خوشنودی کا ذریعہ بن سکے۔ اور یہ حسن ظن بھی جو ذرا پیدا ہوا ہے تو محض اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ کچھ اچھوں کو اس کی طرف متوجہ پا رہا ہوں۔ گمان ہوتا ہے کہ شاید اس سے فہم قرآن کی راہ کھل رہی ہے۔ اگر فی الواقع اس سے فہم قرآن کی راہ کھل رہی ہے تو میں اس کو اپنی خوش بختی سمجھتا ہوں اور اس تفسیر کے قدردانوں کی طرح میرے دل میں بھی یہ آرزو پیدا ہوتی ہے کہ رب کریم مجھے اتنی مہلت عطا فرمائے کہ میرے سینے میں استاذ مرحوم کی جو امانت محفوظ ہے اور کم و بیش ۳۵ سال کی اپنی جگر کاویوں سے میں نے اس پر جو اضافہ کیا ہے وہ سب آنے والی نسل کی طرف منتقل کر سکوں اس لئے کہ درحقیقت یہ چیز

انہی کی ہے۔ اسی احساس کے تحت کبھی کبھی غالب کا یہ شعر میری زبان پر جاری ہو جاتا ہے ؎

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

(۲)

گزشتہ شمارے میں میثاق کے مستقبل سے متعلق ہم نے جو اندیشہ ظاہر کر دیا تھا اس کے قدر دانوں کے حلقے میں اس سے بڑی تشویش پیدا ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں جو خطوط موصول ہوئے ہیں اس سے اندازہ ہوا کہ لوگ اس کے بند ہونے پر کسی طرح راضی نہیں ہیں۔ راضی تو سچ پوچھیے تو اس کے بند ہونے پر ہم بھی نہیں ہیں لیکن سوال اس خسارے کا ہے جو ماہ بماہ بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ خسارہ ہماری برداشت سے باہر ہے اور اس کی تلافی وقتی عطیات کے ذریعہ سے جس پر اس وقت سارا اعتماد ہے، ناقابل عمل بھی ہے اور شخصاً میرے ضمیر پر بہت گراں بھی۔ اب اگر اس کے خاص قدر دانوں کا حلقہ اس کے جاری رکھنے پر مصر ہی ہے تو اس کی ممکن صورت یہی ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے حلقۂ احباب میں خاص سرگرمی کے ساتھ اس کی توسیع اشاعت کی کوشش کرے۔ توسیع اشاعت کے باب میں یہ امر ملحوظ رہے کہ آجکل عام طور پر یا تو لوگ تفریحی رسائل و مضامین پڑھتے ہیں یا ایسے اخبارات و رسائل سے دلچسپی لیتے ہیں جو ان کے مخصوص گروہی تعصبات و خیالات سے ہم آہنگ ہوں۔ ایسے لوگوں کے سامنے اس پرچے کو پیش کرنا بالکل غلط ہے۔ ایسے لوگ اگر شخصی تعلقات کے زیر اثر خریدار بن بھی جاتے ہیں تو یہ تعلق پائیدار ثابت نہیں ہوتا بلکہ بڑی جلدی وہ سالے سے مایوس ہو جاتے ہیں۔ مسئلہ کا صحیح حل صرف یہ ہے کہ ایسے خریدار پیدا کئے جائیں جو کچھ علمی ذوق رکھتے ہوں، قرآن کے علم کی جن کے اندر طلب ہو اور جو گروہی و سیاسی تعصبات سے بھی آزاد ہوں۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے خریداروں کی تلاش آسان کام نہیں ہے لیکن بہت مشکل بھی نہیں ہے۔ اگر میثاق کے خاص قدر دانوں میں سے ہر شخص پانچ پانچ خریدار بھی مہیا کر دے تو یہ پرچہ جاری رہ سکتا ہے۔ چونکہ مختلف قدر دانوں نے اُمید دلائی ہے کہ انہوں نے اس کے لئے کوشش شروع کر دی ہے اس وجہ سے ہم ان کی کوششوں کے نتائج کا انتظار کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے

کہ دوسرے احباب و مخلصین بھی اس چیز کی طرف توجہ فرمائیں گے۔ یہ بات میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں کہ میری دلچسپی اس رسالہ سے محض علمی و مذہبی خدمت کی نوعیت کی ہے۔ میں نے اس سے کوئی مالی فائدہ اب تک اُٹھایا ہے نہ آئندہ اُٹھانے کا ارادہ ہے۔ اگر جاری رہا تو ایک دینی خدمت سمجھ کر میں اس کے صفحات کے لئے غذا فراہم کرتا رہوں گا اور جہاں تک مقدور چلے گا اس کے نقصانات بھرنے میں بھی اپنا حصہ ادا کروں گا۔ اگر بند ہو گیا تو سمجھوں گا کہ مرضی مولیٰ یہی تھی۔ مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ اب میری تمام سرگرمیاں سمٹ سمٹا کر تفسیر اور حلقہ تدبر قرآن پر مرکوز ہو گئی ہیں۔ اگر کچھ نوجوان دین کے حامل پیدا ہو گئے اور تفسیر پوری نہ سہی آدھی ہی لکھی گئی تو سمجھوں گا کہ زندگی اپنی بھی ٹھکانے لگ گئی۔ سارے حوصلے کس کے پورے ہوتے ہیں جو ہم اپنے ہر حوصلے کے پورے ہونے کی توقع کریں۔

(۳)

حلقہ تدبر قرآن کا کام بفضل خدا پوری سرگرمی سے جاری ہے۔ مرکز حلقہ کے پڑوس کے ایک مکان میں ایک اسلامی ہاسٹل بھی قائم ہو گیا ہے۔ ہم اس چیز کے خواہشمند تھے لیکن اس کی مشکلات کے سبب سے اس کے قائم کرنے کی ہمت نہیں کر رہے تھے۔ جس چیز کی ہمت ہم نہ کر سکے اللہ تعالیٰ نے اس کی ہمت خود علم دین کے طالبوں کے اندر پیدا کر دی۔ اس ہاسٹل کے قیام سے اصل مقصود یہ ہے کہ اس کے مقیمین حلقہ تدبر قرآن سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ چنانچہ یہ لوگ میرے درس قرآن میں بھی شریک ہو رہے ہیں اور عربی زبان بھی سیکھ رہے ہیں۔ اب حلقے کے شرکاء کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو گیا ہے اور یہ اضافہ برابر جاری ہے۔ چار ساڑھے چار بجے سے مرکز حلقہ میں طلبہ کی آمد شروع ہو جاتی ہے اور مغرب و عشاء کے درمیان تک بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ چونکہ اکثریت اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے لوگوں پر مشتمل ہے اس وجہ سے اُمید یہی ہے کہ یہ سالوں کی منزل مہینوں میں طے کر لیں گے۔ دینی رجحان ان لوگوں کے اندر پہلے سے موجود ہے، اب تعلیم و تربیت سے اس کے مزید جلا پانے کی توقع ہے۔

ہمارے پہلے گروپ کے رفقا اپنے نئے ساتھیوں کی تعلیم و تربیت میں بھی حصہ لے رہے

ہیں اور اپنا کام بھی پورا کر رہے ہیں - ان کی جو کتابیں باقی ہیں کوشش ہے کہ اس سال کے اندر وہ پوری ہو جائیں - ہمارے ایک رفیق ـــــ خالد مسعود صاحب ـــ اب ریسرچ کے سلسلہ میں کچھ مدت کے لئے انگلستان جا رہے ہیں - ان کے جانے کے سبب سے یہاں میثاق کی ترتیب کے کاموں میں ایک بڑا خلل واقع ہوگا لیکن اُمید ہے کہ دوسرے رفقاء ان کی کمی پوری کرنے کی کوشش کریں گے - خالد مسعود صاحب نے ماشاءاللہ علم دین میں اتنی ترقی کر لی ہے کہ ان کا ذاتی مطالعہ ان کی رہنمائی کے لئے کافی ہے - اب ہماری رہنمائی کے وہ محتاج نہیں ہیں - ان کی سلیم طبیعت سے ہمیں یہ توقع بھی ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں گے دین اور علم دین کی خدمت کرتے رہیں گے - اس گروپ کے دو ذی صلاحیت نوجوانوں کا معاملہ البتہ ہمارے لئے باعث قلق ہے کہ تبادلہ ہو جانے اور فرائض ملازمت کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے ان کی تعلیم میں رکاوٹ پیدا ہو گئی حالانکہ ان کی ترقی ہم سب کے لئے باعث فخر تھی - اللہ تعالیٰ ان کے حالات کو سازگار بنا دے -

ہمارے ایک مخلص محمد بشیر صاحب لائلپور نے حلقہ کی اعانت میں شرکت فرمائی ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں - اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے -

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

(۴۰)

تفسیر سورۂ بقرہ

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ
أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ وَ
قَتَلَ دَاوُودُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ
وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ
اللَّهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ۲۵۱

جالوت، فلسطینیوں کا سپہ سالار تھا۔ تورات میں اس کا نام جاتی جرلیت آیا ہے۔ یہ بڑا گرانڈیل، دیوہیکل اور ماہر جنگ سپہ سالار مانا جاتا تھا۔ دشمنوں پر اس کا بڑا رعب تھا۔ خاص طور پر بنی اسرائیل اس سے بہت مرعوب تھے۔

داؤد، یہ وہی حضرت داؤدؑ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت سے سرفراز فرمایا جن کی صلب سے حضرت سلیمان علیہ السلام پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدا غریبانہ لیکن انتہا نہایت شاندار ہوئی۔ انہوں نے اپنے بارے میں خود فرمایا ہے کہ خداوند نے مجھے بھیڑ بالے سے نکالا اور اسرائیل کے تخت پر لا بٹھایا۔ یہ جالوت کی اس فوج میں شامل تھے جس کا ذکر چلا آ رہا ہے۔ اس شمولیت کے متعلق تورات میں دو مختلف روایتیں ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح بردار کی حیثیت سے ان کے لشکر میں داخل ہو چکے تھے اور دوسری وہ

یہ سموئیل کے ممسوح اور مستقبل کے بادشاہ بھی تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے بھائیوں کو، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے باپ کے حکم سے کچھ کھانے کی چیزیں دینے آئے۔ یہاں انہوں نے دیکھا کہ جالوت مقابلہ کے لئے چیلنج دے رہا ہے لیکن کوئی اس کے مقابلہ کے لئے آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر ان کی غیرت کو جوش آیا۔ انہوں نے طالوت سے اس کے مقابلہ کی اجازت مانگی۔ یہ اس وقت ایک نوخیز، سُرخ رو اور خوش قامت نوجوان تھے۔ طالوت کو ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بناء پر اجازت دینے میں تردّد ہوا۔ لیکن جب انہوں نے کہا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں اور ریچھوں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں، بھلا اس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے کہ یہ زندہ خداوند کی فوجوں کو رسوا کرے تو طالوت نے ان کے اس عزم و ہمت کو دیکھ کر ان کو اجازت دے دی اور خود اپنا جنگی لباس پہنا کر اپنے مخصوص اسلحہ سے ان کو لیس کیا۔ اس وقت تک ان کا زمانہ بھیڑوں بکریوں کی چرواہی میں گزرا تھا، اس جنگی لباس اور ان جنگی اسلحہ کا ان کو کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ ان کو پہن کر کچھ بندھا بندھا سا محسوس کرنے لگے۔ آخر طالوت کی اجازت سے اس قید سے رہائی حاصل کی اور چرواہوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے اور وقت کے سب سے بڑے دیو کے مقابل میں جاکے ڈٹ گئے۔ پہلے تو اس نے ان کا مذاق اڑایا لیکن جب ان کی طرف سے اس کو ترکی بہ ترکی جواب ملا تو اس نے کہا کہ "اچھا آج تیرا گوشت چیلوں اور کوّوں کو کھلاتا ہوں"۔ اتنے میں حضرت داؤدؑ نے فلاخن میں پتھر رکھ کر جو اس کو مارا تو پتھر اس کے سر سے چپک کے رہ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک الھڑ چرواہے کی فلاخن سے اس طرح مارا جانا ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا، چنانچہ فلسطینی فوج میں بھگدڑ مچ گئی اور ادھر بنی اسرائیل کی عورتوں کی زبان پر یہ گیت جاری ہو گیا کہ ؎

"ساؤل نے تو ہزاروں کو مارا پر داؤد نے لاکھوں کو مارا"۔

بس اسی واقعہ سے حضرت داؤد کی زندگی کا آغاز ہوا اور پھر وہ بنی اسرائیل کی تاریخ میں اس مقام پر پہنچے جو ان کے لئے مقدر تھا۔

فَهَزَمُوهُم بِإِذْنِ اللَّهِ ، میں اس حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے کہ فتح ہو یا شکست،

کچھ بھی پیش آتا ہے اس کا اصل تعلق قلت وکثرت اور وسائل وتدابیر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اس وجہ سے اصل اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہیئے نہ کہ اسباب ووسائل پر۔ اس سے مقصود اسباب ووسائل کے اختیار کرنے کی نفی نہیں بلکہ تنہا انہی کو وسیلۂ ظفر سمجھ لینے کی نفی ہے۔ حضرت داؤد جنہوں نے ایک دیوہیکل سورما کو ایک پتھر سے ڈھیر کر دیا، اگرچہ اس زمانے تک نبی نہیں تھے، لیکن اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے جالوت کو مخاطب کرکے یہ کہا تھا کہ

"اور یہ ساری جماعت جان لے کہ خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعہ سے نہیں بچاتا اس لئے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا" سموئیل باب ۱۷

یہی بات قرآن مجید کی آیت "وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ" سے ثابت ہوتی ہے

"وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ" یہ ان انعامات کا بیان ہے جو اس واقعہ کے بعد حضرت داؤد پر ہوئے۔ اس کے بعد وہ طالوت کے داماد بھی ہو گئے اور پھر بنی اسرائیل کے بادشاہ بھی، علاوہ ازیں ان کو حکمت کا وہ خزانہ بھی عطا ہوا جس کا مظہر زبور ہے۔ درحقیقت یہی حکمت ہے جس کا جوڑ جب بادشاہی کے ساتھ ملتا ہے تو وہ بادشاہی زمین میں خدا کی خلافت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہ نہ ہو تو بادشاہی چنگیزی ہے۔ بادشاہی اور درویشی کا یہی امتزاج ہے جو اللہ کی نظروں میں پسندیدہ ہے اور حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سب درویش بادشاہ تھے اس لئے کہ ان کی بادشاہی کا تخت وتاج سونے چاندی سے نہیں بلکہ حکمت کے لعل وگہر سے آراستہ ہوا تھا۔

یہاں ایک چھوٹا سا سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ علمہ مما یشاء فرمایا علمہ ما شاء نہیں فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسلوب اس لئے اختیار فرمایا کہ یہ بات حضرت داؤدؑ کے ساتھ خاص ہو کے نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ ایک سنت اللہ کے بیان کا اسلوب اختیار کرلے کہ اللہ نے اس کو وہ کچھ سکھایا اور بتایا جو وہ اپنے ایسے بندوں کے لئے چاہتا ہے کہ وہ ان کو بتائے اور سکھائے۔

"وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ الآیۃ" یہ جہاد کی ضرورت اور اس کا فلسفہ بیان ہوا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ جہاد کا حکم نہ دیتا اور اس کے صالح بندے زمین کو فتنہ وفساد سے پاک کرنے کے لئے تلوار نہ اٹھاتے تو اشرار ومفسدین دنیا کو شر وفساد سے بھر دیتے اور اللہ کی زمین نیکی اور تقویٰ کے تمام

سے خالی ہو جاتی۔ قرآن میں جہاد کی اس ضرورت و حکمت کی طرف مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ اشارے کئے گئے ہیں۔ مثلاً سورۂ حج میں فرمایا۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيرًا ۔ ۴۰ - حج

(اور اگر اللہ ایک کو دوسرے سے نہ دفع کرتا رہتا تو صومعے اور گرجے اور عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے خدا کا ذکر ہوتا ہے سب ڈھائے جا چکے ہوتے۔) اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ مذہب کے راہبانہ اور جوگیانہ تصور کے اثر سے عام طور پر جنگ اور جہاد کو تقوی اور دین داری کے منافی تصور کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جنگ بدر سے پہلے تک تو قریش مسلمانوں کی کمزوری کو ان کے خلاف ایک دلیل ٹھہراتے رہے اور جنگ بدر کے بعد ان کے جوش جہاد کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ اس کی تفصیلات اپنے مقام میں آئیں گی۔ یہاں قرآن نے پہلے سے اس طرح کے تمام اعتراضات کا جواب دے دیا کہ انبیاء اور صالحین جو جہاد کرتے ہیں اس سے مقصود حق اور عدل کا قیام اور شر و فساد کا استیصال ہوتا ہے ورنہ خدا کی زمین نیکی اور بھلائی کے لئے بالکل بنجر ہو کے رہ جائے۔ اس وجہ سے صالحین کا جہاد اہل زمین کے لئے خدا کی ایک بہت بڑی عنایت ہے۔

(تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ - ۲۵۲)

یہ آیت اور اس کے بعد والی آیت، یہ دونوں آیتیں سلسلۂ کلام کے بیچ میں بطور التفات وارد ہیں یعنی اصل سلسلہ کلام کو روک کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا اور ارشاد ہوا کہ بنی اسرائیل نے اپنی تاریخ کی ایک نہایت اہم سرگزشت کو بالکل بے مقصد اور بے معنی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اب ہم نے اس کو بالکل ٹھیک ٹھیک اس کے نتائج و فوائد اور اس کے حکم و مصالح کے ساتھ تمہیں سنایا ہے تاکہ اس آئینہ میں تم اور تمہارے ساتھی اپنے مستقبل کے نقشۂ کار کو دیکھ سکو۔ اور یہ اس بات کی نہایت روشن دلیل ہے کہ تم انبیاء و رسل کے مبارک سلسلہ کی کڑی ہو ورنہ جس چیز کے تمہارے پاس جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اس کو تم کس طرح جان سکتے اور وہ بھی ایسی صحت و صداقت کے ساتھ کہ اصل واقعہ تمام غیر منطقی اور غیر فطری ملاوٹوں سے بالکل پاک ہو کر لوگوں کے سامنے آگیا۔ اگر اہل کتاب معاملہ کے صرف اسی ایک پہلو پر غور کرتے تو تمہاری رسالت کے ثبوت کے لئے یہی دلیل

* مضمون کی طرف التفات اور اسی پہلو سے اس کا اشارہ *

کافی تھی. لیکن ان کا اندھا بہرا۔ تعصب اس امر میں مانع ہے کہ وہ اپنے نبی کے سوا کسی اور رسول کی رسالت اور اس کے لئے کوئی فضیلت تسلیم کر سکیں حالانکہ اللہ کے نبیوں اور رسولوں میں سے کسی کے لئے بھی مطلق برتری کا دعویٰ صحیح نہیں ہے. اللہ نے اپنے تمام رسولوں کو کسی نہ کسی فضیلت سے مختص کیا ہے اور سب کے لئے مراتب و درجات ہیں لیکن اہل کتاب گروہی تعصبات میں مبتلا ہو کر اپنے سوا سب کی تکذیب اور سب کی مخالفت کے لئے کمربستہ ہیں. سو اس حالت پر صبر کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑو. اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں شر کو بھی مہلت دے رکھی ہے. بلاشبہ اگر وہ چاہتا تو یہ کچھ وہ نہ کر پاتے لیکن اس نے یہی چاہا ہے اور جو کچھ اس نے چاہا ہے اسی میں حکمت اور مصلحت ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ۭ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۣ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۔ ۲۵۳

رسولوں کے بارے میں صحیح روش

تِلْكَ کا اشارہ ان رسولوں کی طرف ہے جن کا حوالہ اوپر وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ کے الفاظ سے دیا گیا ہے۔

اس آیت میں اس صحیح رویّے کی وضاحت ہے جو اللہ کے رسولوں کے بارے میں ان کی امتوں کو اختیار کرنا تھا. لیکن انہوں نے اس کو اختیار نہیں کیا بلکہ اس کی جگہ ایک بالکل غلط رویہ اختیار کر لیا جس کے سبب سے ان کے درمیان تعصبات کی دیواریں کھڑی ہو گئیں اور وہ ایک دوسرے کی دشمن اور مخالف ہو کر باہم جنگ و جدل میں مبتلا ہو گئیں. مقصود اس بیان سے یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ واضح کرنا ہے کہ آج تمہاری مخالفت میں بھی یہ اہل کتاب جو ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اس کی بڑی وجہ ان کی یہی غلط روش ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں میں سے ہر رسول کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس فضیلت کے اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے. مثلاً موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا یہ ان کی فضیلت کا ایک خاص پہلو ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو......

کھلے کھلے معجزات دیئے اور روح القدس کی خاص تائید سے ان کو نوازا، یہ ان کے مخصوصات میں سے ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے رسولوں کو درجات و مراتب عطا ہوئے ہیں جو ان کے لئے خاص ہیں انبیاء ورسل کے فضائل کے باب میں یہی نقطۂ نظر حقیقت کے مطابق ہے۔ لیکن ان انبیاء کی امتوں نے جو روش اختیار کی وہ یہ ہے کہ ان میں سے جس نے جس نبی و رسول کو مانا سارے فضائل و خصوصیات کا جامع تنہا اسی کو بنا کر رکھ دیا اور دوسرے کسی نبی و رسول کے لئے کسی فضیلت کا تسلیم کرنا ان کے نزدیک ایمان کے منافی قرار پاگیا۔ اس تعصب و تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچھلی امتوں میں سے ہر امت اپنے اپنے خول میں بند ہو کر رہ گئی اور ان کے لئے دوسرے نبیوں اور رسولوں کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی راہ مسدود ہو گئی۔ اگر وہ صحیح روش اختیار کرتیں تو ہر رسول ان کا رسول اور ہر ہدایت ان کی ہدایت ہوتی اور وہ اس ہدایت میں سے بھی حصہ پاتیں جو اب قرآن مجید کی صورت میں آخری ہدایت کی حیثیت سے دنیا کے سامنے ظاہر ہوئی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورہ بنی اسرائیل میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّينَ عَلَىٰ بَعْضٍ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ۔ ۵۵

(اور ہم نے انبیاء میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم نے داؤد کو زبور عنایت کی)

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنت الٰہی

آیت کے دوسرے حصے میں اللہ تعالیٰ نے اس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اس نے پسند فرمائی ہے اور جس کا قرآن میں جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں جبر کا طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس میں شبہ نہیں کہ کسی کے لئے بھی ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ بندوں کو آزادی دی کہ وہ اپنی سوجھ سمجھ اور اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ چاہیں کفر کی راہ اختیار کریں، چاہیں ایمان کی راہ اختیار کریں۔ اگر وہ ایمان کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا صلہ پائیں گے اور اگر کفر کی راہ اختیار کریں گے تو اس کا انجام دیکھیں گے۔ آخر میں فرمایا کہ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ۔ اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ اس نے یہی چاہا کہ وہ اس معاملے میں بندوں پر جبر نہ کرے۔ اور جب اس نے یہی چاہا تو اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ اسی کے اندر حکمت و مصلحت ہے، کیونکہ خدا کا کوئی ارادہ حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہو سکتا۔

یہاں اس قانون کے بیان کرنے سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے معاملے میں آپ کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ آپ لوگوں تک حق واضح الفاظ میں پہنچا دیں۔ اس کو قبول کرنا یا رد کرنا یہ ان کے اوپر چھوڑ دیجئے۔ یہ نہ تو آپ کی ذمہ داری ہے اور نہ آپ اس کے لئے پریشان ہوں۔

آیت میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق وَاَیَّدْنَاهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ کے جو الفاظ آئے ہیں ان کی حقیقت اسی سورہ کی آیت ۸۷ کے تحت ہم واضح کر چکے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ سے جس کلام کا ذکر ہے اس سے مراد وہ براہ راست مخاطبہ الٰہی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مشرف فرمایا۔ اس مخاطبت کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے اور قرآن نے بھی اس کی طرف جا بجا اشارے کئے ہیں۔

۸۲ ۔ آگے کا مضمون آیات ۲۵۴ - ۲۵۷

اوپر سے مضمون جہاد اور انفاق کا چلا آرہا تھا بیچ میں دو آیتیں التفات کی بطور تنبیہ و تذکیر آگئیں جن کی نوعیت جملہ معترضہ کی ہے۔ اس کے بعد انفاق کا مضمون از سر نو آگیا۔ اس مضمون کی وضاحت کے لئے جو استدلال اختیار فرمایا ہے اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی اصل چیز تو خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی ہے لیکن یہ منکرین یہ کرنے کے لئے تو تیار نہیں ہیں البتہ انہوں نے اپنے جی سے خدا کے شریک و شفیع بہت سے گھڑ لیے ہیں اور ان کی شفاعت و حمایت پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں حالانکہ یہ جھوٹے سہارے کچھ کام آنے والے نہیں ہیں۔ جو لوگ اس حماقت میں مبتلا ہیں وہ اپنے اوپر بہت بڑا ظلم ڈھا رہے ہیں۔

اس کے بعد نہایت مختصر لیکن نہایت جامع الفاظ میں توحید کی حقیقت واضح فرمائی اور شرک کی تردید کی تاکہ ایک بالکل غلط سہارے پر جو لوگ جی رہے ہیں وہ چوکنے ہوں اور خدا پرستی کی صحیح راہ اختیار کریں۔

اس کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعہ سے حق و باطل اور ہدایت و ضلالت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ تبلیغ، تعلیم اور انذار و تبشیر کا جو حق تھا وہ ادا ہو چکا ہے۔ اب جس کا جی چاہے وہ غیر اللہ سے کٹ کر اللہ کی مضبوط رسی کو تھام لے اور جس کا

جی چاہے اپنے غلط سہاروں کے اعتماد پر اپنی عاقبت برباد کرے، اللہ کو ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہیں ہے. اللہ یہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنی سمجھ بوجھ سے ایمان لائیں. اگر وہ سب کو نیکی کے راستے پر ہانک دینا چاہتا تو وہ ایسا کر سکتا تھا لیکن ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے اس جبر کو پسند نہیں فرمایا.

اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ہدایت کی توفیق دیتا ہے اور کون لوگ ہیں جو حق کی وضاحت کے بعد بھی گمراہی کی وادیوں ہی میں بھٹکتے رہ جاتے ہیں .

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے . ارشاد ہوتا ہے .

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا
خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ
الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ
مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۖ
وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضَ ۖ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿٢٥٥﴾ لَا إِكْرَاهَ فِي
الدِّينِ ۖ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ
بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾

○

اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ تو خرید و فروخت ہو گی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش نفع پہنچائے گی اور جو لوگ انکار کرنے والے ہیں، اپنے اوپر اصلی ظلم ڈھانے والے وہی ہیں۔

۲۵۴

اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے. وہ زندہ ہے. سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی ہے نہ نیند، جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کی ملکیت ہے. کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے، مگر جو وہ چاہے، اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں اور وہ بلند اور عظیم ہے۔ ۲۵۵

دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں ہے. ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے تو جس نے طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا. اس نے مضبوط رسی پکڑی جو ٹوٹنے والی نہیں اور اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۲۵۶

انفاق کی دعوت اور اس کی اہمیت

۸۳۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۔ ۲۵۴ ۔ اوپر آیت ۲۴۵ میں انفاق کی جو دعوت گزری ہے، یہ اس کی مزید تفصیل ہے۔ مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ میں، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں انفاق کی دلیل بھی ہے اور اس کی تسہیل بھی. اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جو تم سے انفاق کا مطالبہ کر رہا ہے تو یہ تم پر گراں نہ گزرے. وہ تم سے کوئی تمہاری چیز نہیں مانگ رہا ہے بلکہ اپنی ہی بخشی ہوئی چیز مانگ رہا ہے. پھر یہ نہیں ہے کہ جو کچھ اس نے بخشا ہے اس سارے کیلئے اس کا مطالبہ ہے بلکہ وہ اس میں سے صرف ایک حصہ کے انفاق کا مطالبہ کر رہا ہے۔

پھر فرمایا کہ اس دنیا کے مال و متاع کا کوئی ابدی و دائمی نفع ہے تو صرف اسی صورت میں ہے جب آج اس کو خدا کی راہ میں خرچ کر کے اس کو ایک لازوال خزانے کی صورت میں تبدیل کر لو اس لئے کہ آگے جو دن آنے والا ہے اس میں نفع پہنچانے والی چیز اگر کوئی ہے تو صرف وہ نیکی ہے جو اس دنیا میں کمائی گئی ہو. اس کے سوا اس عالم میں کوئی چیز کام آنے والی نہیں. اس دنیا میں خرید و فروخت سے بھی کام چل جاتے ہیں، دوستیاں بھی کام دے جاتی ہیں اور سفارشیں بھی بعض اوقات نفع پہنچاتی

ہیں لیکن اس دنیا میں ان چیزوں کی ساری راہیں بند ہوں گی ، وہ صرف ایمان اور عمل صالح کے نتائج کے ظہور کی دنیا ہو گی ۔

لفظ بیع کا مفہوم ہم نے یہاں خرید و فروخت دونوں لیا ہے اس کی وجہ جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ اشارہ کر چکے ہیں یہ ہے کہ جب صورت چیز سے چیز کے مبادلہ کی ہو تو بیچنا اور خریدنا دونوں اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے۔

"الْكَافِرُوْنَ" سے مراد ہمارے نزدیک یہاں وہ لوگ ہیں جو اس طرح کے کسی دن کے ظہور کے منکر ہیں جس سے یہاں ڈرایا گیا ہے ۔ جو لوگ آخرت کے منکر ہوں ان کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کل کے اُدھار کے لئے آج کے نقد کو قربان کر سکیں ۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اگرچہ یہ لوگ اپنی دانست میں اپنے آپ کو بہت حقیقت پسند سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ وہ اپنے کو نفع پہنچا رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ اپنی جانوں پر سب سے بڑے ظلم ڈھانے والے ہیں ۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــــُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ۲۵۵ ۔

قَیُّوْمٌ : مبالغہ کا وزن ہے ۔ اس کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ اور ذریعہ ہو ۔

سِنَةٌ : کے معنی اونگھ اور نوم کے معنی نیند کے ہیں ۔ ان دونوں کی نفی سے نیند کی ابتدا اور انتہا دونوں کی نفی ہو گئی جس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے تمام اثرات سے کمال درجہ پاک ہے ۔

مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۔ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم لوگوں کے آگے اور پیچھے اور ان کے ماضی اور مستقبل سب پر حاوی ہے ۔ برعکس اس کے دوسروں کی علمی پہنچ صرف اس حد تک ہے جس حد تک خدا نے چاہا کہ وہ اس کے علم میں سے حصہ پائیں ۔ اس سے آگے کسی کی رسائی نہیں وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۔

کرسی کے معنی عربی لغت میں کسی چیز کی تہ جمائی تہ کے ہیں۔ اسی سے کرسی کا لفظ بنا جو بیٹھنے کی جگہ یا چیز مثلاً تخت وغیرہ کے لئے استعمال ہوا۔ بیٹھنے کی جگہ یا چیز جب کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لئے خاص ہو اس کے اقتدار کا مرکز ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کرسی کا لفظ اقتدار کی تعبیر کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ کے معنی ہوئے کہ اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین کے تمام اطراف واکناف پر حاوی ہے۔ کوئی گوشہ اور کونا بھی اس کے دائرہ اقتدار سے الگ نہیں ہے۔

آیۃ الکرسی کی اعجازی خصوصیات

"اٰدَ یَئُوْدُ اَوْدًا" کے معنی ہیں کسی چیز کا ایسا بھاری اور گراں ہونا کہ اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا کے معنی یہ ہوئے کہ آسمان و زمین کی دیکھ بھال ذرا بھی خدا پر گراں نہیں ہے کہ اس کو کسی سہارے یا مددگار کی احتیاج پیش آئے۔

اوپر والی آیت میں یہ فرمایا کہ "اس دن کے آنے سے پہلے پہلے خدا کی راہ میں خرچ کرو جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش کچھ نفع پہنچائے گی" یہ اسی مضمون کی مزید تفصیل ہے گویا رد شفاعت اور رد شرک کے اس مضمون نے توحید خالص کی وضاحت کے لئے ایک تقریب پیدا کر دی اور اس طرح توحید کے بیان میں ایک ایسی آیت نازل ہو گئی جس کی خوبیوں اور بلاغتوں کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

سب سے پہلے فرمایا کہ اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد اس کے لئے ان صفات کا اثبات کیا جو اس کی الوہیت کا لازمی تقاضا ہیں اور جن کے نہ ماننے سے اس کی الوہیت کی نفی ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی ان باتوں سے اس کو بری قرار دیا جن کے ماننے سے بھی اس کی الوہیت کو بٹہ لگتا ہے جن صفات کا اثبات کیا ہے ان میں سب سے پہلے اس کے حَیّ و قَیُّوْم ہونے کا ذکر کیا ہے۔ حیّ کے معنی زندہ کے ہیں اور قیوم کے معنی ہیں وہ ذات جو خود اپنے بل پر قائم اور سب کو قائم رکھنے والی اور سب کو سنبھالنے والی ہو۔ ظاہر ہے کہ جو خود زندہ نہ ہو وہ تمام دنیا جہان کے لئے زندگی بخش کس طرح ہو سکتا ہے اور جو خود اپنی ذات سے قائم نہ ہو وہ آسمان و زمین کو قائم رکھنے والا کس طرح ہو سکتا ہے۔ اور جو ذات ان صفات سے عاری ہو اس کو خدا ماننے کے کیا معنی؟ اور جب خدا ان صفات سے متصف ہے اور لازماً اس کو ان صفات سے متصف ہونا چاہیئے تو پھر کسی کو اس کا شریک و سہیم ماننا ایک بالکل بے جوڑ سی بات ہے۔

اس طرح قرآن نے ان تمام معبودوں کی نفی کر دی جو نہ زندہ ہیں، نہ زندگی کا سرچشمہ اور نہ خود قائم

ہیں اور نہ دوسروں کے قائم رکھنے والے بلکہ خود اپنی زندگی اور اپنے قیام و بقا کے لئے حیّ و قیّوم کے محتاج ہیں۔

اس کے بعد فرمایا کہ نہ اس کو اونگھ لاحق ہوتی نہ نیند۔ یہ نیند کی ابتدا اور اس کی انتہا دونوں سے اس کو بری قرار دیا گیا ہے اور یہ اس کے حیّ و قیوم ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔ نیند موت کے ظلال و آثار اور اس کے مظاہر و مبادیات میں سے ہے اس وجہ سے یہ خدا کی شان کے منافی ہے پھر یہ اس کے قیوم ہونے کے بھی منافی ہے' جو خود نیند سے مغلوب ہو کر اپنے کو قائم نہ رکھ سکے گا وہ دنیا کو کیا قائم رکھے گا اور جب وہ ہر لمحہ خود بیدار ہے اور اپنی دنیا کی نگرانی کر رہا ہے تو پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ وہ اس دنیا کے انتظام و انصرام میں کسی اور کا بھی محتاج ہے!

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت اور اسی کے اختیار میں ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے قرآن کے مخاطبوں میں سے نہ کسی کو انکار تھا اور نہ کسی کے لئے اس سے انکار کی گنجائش تھی، اس لئے کہ اس سے انکار کے معنی خدا کی خدائی کے انکار کے تھے۔ چنانچہ اس مسلّم حقیقت سے شفاعت کے اس عقیدے کے باطل ہونے کی طرف رہنمائی فرمائی جس میں عرب کے مشرکین اور اہل کتاب سب کسی نہ کسی نوعیت سے مبتلا تھے۔ فرمایا کہ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ، یعنی جب سب کے سب خدا ہی کے مملوک و محکوم اور اسی کے تابعدار و محکوم ہیں تو کس کی مجال ہے کہ خدا کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کسی کی سفارش کے لئے زبان کھول سکے۔ اس ارشاد نے شفاعت کے اس تصوّر کا بالکل خاتمہ کر دیا جس کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ بعض شرکاء کو خدا کے ہاں اعتماد اور تدلّل کا یہ درجہ حاصل ہے کہ وہ کسی کے لئے خود بڑھ کر خدا سے سفارش کر سکتے ہیں اور خدا ان کی ناز برداری میں لامحالہ ان کی سفارش قبول بھی فرمائے گا۔ فرمایا کہ نہ خدا کے ہاں کسی کا یہ درجہ ہے اور نہ کوئی اس کے دربار میں اس کی اجازت کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت کر سکے گا۔ اسی حقیقت کو دوسری جگہ اس طرح ظاہر فرمایا ہے۔ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهُ، بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ لَا يَسْبِقُونَهُ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ ۲۷ - الانبیاء (اور مشرکین کہتے ہیں کہ خدا کے اولاد ہے، اللہ ان چیزوں سے پاک اور برتر ہے، فرشتے خدا کی اولاد نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں، وہ اس کے آگے بات کرنے میں

سبقت نہیں کرتے، وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں،

پھر فرمایا کہ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ یعنی خدا کے سامنے کسی کے بارے میں زبان کھولنے کی جسارت تو وہ کرے جو خدا کی معلومات میں کچھ اضافہ کرسکتا ہو اور یہ کہنے کے پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے بارے میں نعوذباللہ اللہ تعالیٰ کو پوری آگاہی نہیں ہے، اسے ہے۔ لیکن یہ حیثیت کس کی ہے؛ اللہ تعالیٰ سب کے آگے اور پیچھے اور اس کے ماضی و مستقبل ہر چیز سے باخبر ہے برعکس اس کے دوسرے کسی کا بھی یہ درجہ و مرتبہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے علم کے کسی حصے کا احاطہ کرسکے۔ دوسروں کے لئے اس کے علم میں سے بس اتنا ہی ہے جتنا وہ ازخود اپنے بندوں میں سے کسی پر کھول دے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی یہ وسعت اور دوسروں کے علم کی یہ محدودیت مشرکین کے تصور شفاعت کا بالکل خاتمہ کردیتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے شفاعت کی تردید کرتے ہوئے اکثر مقامات میں علم الٰہی کی اس وسعت اور دوسروں کے علم کی محدودیت کا حوالہ دیا ہے مثلاً یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ ۲۸۔ انبیاء (اللہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے اور وہ شفاعت نہیں کریں گے مگر ان کے لئے جن کے لئے اللہ پسند فرمائے اور وہ اس کی خشیت سے ڈرتے ہوں گے) یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِہٖ عِلْمًا ۱۰۹۔۱۱۰ طٰہٰ (اور اس دن کسی کو کسی کی شفاعت کچھ نفع نہ پہنچائے گی مگر جس کے لئے خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لئے کوئی بات کہنے کو پسند کرے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے پیچھے اور ان کے آگے ہے اور ان کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا)

شفاعت کا یہ تصور بنیادی طور پر غلط ہے اس لئے کہ یہ بندے کا اعتماد خدا کے بجائے بندے پر جماتی ہے اور اس طرح یہ شرک کی راہ کھولتی ہے۔ اس کے بجائے قرآن نے شفاعت کا یہ تصور دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں میں سے جس کو چاہے گا اور جس کے لئے چاہے گا شفاعت کی اجازت دے گا اور وہ خدا سے ڈرتے ہوئے وہی بات زبان سے نکالے گا جو بالکل حق ہو گی۔

یہ شفاعت چونکہ اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہوگی تو اسی کے لئے ہوگی جس کے لئے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے، اور یہ نہ تو کسی حق کو باطل بنائے گی اور نہ کسی باطل کو حق بلکہ ٹھیک ٹھیک حق کے مطابق ہوگی اس وجہ سے یہ بندے کا اعتماد خدا پر جمانے والی اور توحید کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ چنانچہ اس شفاعت کے لئے اس نے گنجائش رکھی ہے اور اس سے وہ اپنے ان بندوں کو نوازے گا جن کو چاہے گا اس موضوع پر ہم انشاء اللہ سورۂ انعام میں تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے۔ یہاں اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

جس طرح شفاعت میں یہ استثنا ہے اسی طرح علم کے باب میں بھی یہ استثنا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم میں سے جتنا کسی بندے کے لئے چاہتا ہے، دیتا ہے۔ یعنی خدا کے تمام علم کا احاطہ کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کے نبیوں، رسولوں اور اس کے فرشتوں کو جو علم حاصل ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے جتنا وہ کسی کو بخشتا ہے۔

آگے ارشاد ہوا وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا یعنی اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین کے ہر گوشے اور کونے پر حاوی ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ اس کی وسیع مملکت کے بعض دور دراز گوشے ایسے ہوں جہاں اس کو اپنا اقتدار پوری طرح جمانے جملنے کے لئے دوسرے معبودوں کو اپنا شریک اقتدار بنانے پر مجبور ہو۔ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں ہے جو اپنی سلطنت کو سنبھالے رکھنے کے لئے نائبوں، مددگاروں کے محتاج ہوتے ہیں، ان کے بغیر ان کے لئے حکومت کا انتظام دشوار ہو جاتا ہے بلکہ وہ غیر محدود علم، غیر محدود قدرت اور غیر محدود قوت تصرف کا مالک ہے اس لئے جس طرح ہم اپنے مکان کے صحن کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں اس سے ہزاروں لاکھوں درجہ سہولت کے ساتھ وہ اپنی اس آسمان و زمین پر حاوی مملکت کا انتظام فرماتا ہے۔ اور ذرا بھی اس کا بوجھ محسوس نہیں کرتا ہے کہ وہ کسی کی طرف سے ہاتھ بٹانے کا محتاج ہو۔

(حاشیہ: صورتیں ایسا نہ ہو کہ پورا اقتدار دوسروں میں تقسیم کرے)

آخر میں فرمایا کہ اللہ علی اور عظیم ہے۔ یعنی اس کی ہستی بڑی ہی بلند اور بڑی ہی عظیم ہے۔ اس کے علم، اس کی قدرت اور اس کی وسعت کو اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپو، یہیں سے اس کے بارے میں گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں اور شرک کی راہیں کھلتی ہیں۔ اپنی صفات کے

اب میں جو کچھ وہ خود بتاتا ہے اس پر ایمان لاؤ اور ظن وقیاس اور تشبیہ وتمثیل کی خیال آرائیوں سے بچو۔

(لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۲۵۶)

طاغوت کی تحقیق

طاغوت، بروزن ملکوت وجبروت، طغی، کے مادہ سے ہے جس کے معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ جو چیز اپنی حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لئے عربی میں کہیں گے۔ طغی۔ طغی الماء پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لئے طاغیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لئے استعمال ہوا اور جو حدود بندگی سے نکل جائے اس کو طاغوت کہنے لگے۔ پھر وسعت اختیار کرکے یہ لفظ ان چیزوں پر بھی حاوی ہو گیا جو حدود بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ بنیں۔ اہل لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح عام طور پر یوں کرتے ہیں کہ اَلطَّاغُوْتُ عِبَارَةٌ عَنْ كُلِّ مُتَعَدٍّ وَكُلِّ مَعْبُوْدٍ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (طاغوت سے مراد ہر وہ وجود ہے جو بندگی سے نکل جائے اور ہر وہ معبود ہے جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے)

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل کا ذکر کرکے اس کے مختلف مفہوموں پر روشنی ڈال دی ہے۔ مثلاً زیر بحث آیت میں ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ یہاں اللہ کے تقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورۃ نحل میں ہے۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یہاں بھی اللہ کے سوا دوسرے معبودان باطل مراد ہیں۔ سورہ نساء میں ہے۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ. اس کے بعد فرمایا فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ جس سے متعین ہو گیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ اور شیطان کا لفظ شیاطین انس اور شیاطین جن دونوں کو شامل ہے اسی طرح

ایک دوسرے مقام میں اس لفظ کو کتاب الٰہی اور طریقہ رسول کے مخالف طریقہ کے لئے استعمال فرمایا ہے۔ اَلَمۡ تَرَ اِلَی الَّذِیۡنَ یَزۡعُمُوۡنَ اَنَّہُمۡ اٰمَنُوۡا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکَ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ وَ قَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّکۡفُرُوۡا بِہٖ ؕ وَ یُرِیۡدُ الشَّیۡطٰنُ اَنۡ یُّضِلَّہُمۡ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا، وَ اِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ رَاَیۡتَ الۡمُنٰفِقِیۡنَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡکَ صُدُوۡدًا۔ ۶۰ - ۶۱ - اس آیت میں یَتَحَاکَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ کے بالمقابل تَعَالَوۡا اِلٰی مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ وَ اِلَی الرَّسُوۡلِ کہہ کر یہ واضح کر دیا کہ طاغوت سے یہاں مراد وہ چیزیں ہیں جو کتاب الٰہی اور سنت رسول کے خلاف ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جانے یا نکل جانے کا باعث اور ذریعہ ہو۔ وہ سب اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہیں۔

لا اکراہ فی الدین کا مفہوم

اوپر آیت وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا اقۡتَتَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ الآیہ میں نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی تسلی کے لئے جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا تھا یہ اس کی مزید وضاحت فرما دی کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اللہ کے رسول کی اصل ذمہ داری صرف حق کو واضح طور پر پہنچا دینا ہے اور جب یہ کام ہو چکا۔ حق باطل سے بالکل الگ ہو کر سامنے آگیا تو رسول کی جو ذمہ داری ہے وہ پوری ہو چکی۔ اب ذمہ داری ان لوگوں کی ہے جن پر حجت تمام ہو چکی ہے (وہ چاہیں تو ایمان لائیں) اور چاہیں تو کفر کی روش پر اڑے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملے میں جبر فطری کی راہ نہیں اختیار فرمائی ہے بلکہ لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی بخشی ہے اگر وہ چاہتا تو ساری دنیا کو نیکی ہی کی ڈگر پر ہانک دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اس نے لوگوں کو آزادی دی ہے۔ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اس کا صلہ پائیں گے، جو کفر کی راہ اختیار کریں گے۔ وہ اس کی سزا بھگتیں گے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں مختلف مقامات میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوا ہے مثلاً وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اَشۡرَکُوۡا لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ مَا عَبَدۡنَا مِنۡ دُوۡنِہٖ مِنۡ شَیۡءٍ، کَذٰلِکَ فَعَلَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۚ فَہَلۡ عَلَی الرُّسُلِ

وَالْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ، وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَیْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الْمُکَذِّبِیْنَ، اِنْ تَحْرِصْ عَلٰی هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۳۵ – ۳۷ نحل (اور یہ مشرکین کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی کو نہ پوجتے، نہ ہم نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم اس کے حکم کے بغیر کسی چیز کو حرام ٹھہرا سکتے۔ ایسا ہی سوال اٹھایا ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تو کیا رسولوں پر واضح طور پر پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری بھی ہے؟ ہم نے تو ہر امت میں ایک رسول اٹھایا اس دعوت کے ساتھ کہ لوگو، اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو، تو ان میں سے کچھ ایسے ہوئے جن کو اللہ نے ہدایت بخشی اور کچھ ایسے ہوئے جو گمراہی کے سزاوار ٹھہرے۔ تو ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ رسولوں کو جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا! اگر تم ان لوگوں کی ہدایت کے حریص ہو تو یاد رکھو کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت دینے والا نہیں ہے جن کو گمراہی کا سزاوار ٹھہرا چکا اور ان کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے)۔

قرآن مجید میں یہ مضمون مختلف اسلوبوں سے مختلف مقامات میں بیان ہوا ہے۔ ہم نے طوالت سے بچنے کے لئے صرف ایک آیت کے نقل کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَاۤ اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ، کے ٹکڑے میں جس جبر و اکراہ کی نفی کی گئی ہے اس سے مقصود جبر فطری کی نفی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہدایت و ضلالت کے معاملے میں یہ طریقہ نہیں اختیار فرمایا ہے کہ وہ اپنی مشیت و قدرت کے زور سے لوگوں کو ہدایت پر چلا دے یا گمراہی کی طرف ہانک دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا تو نہیں تھا لیکن یہ بات اس کی حکمت اور اس کے عدل کے خلاف ہوتی۔ اس نے اس کے برعکس یہ طریقہ اختیار فرمایا ہے کہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے لوگوں کے سامنے حق اور باطل دونوں کو اچھی طرح واضح کر دیتا ہے، پھر جو لوگ حق کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو راہ حق اختیار کرنے کی توفیق ارزانی کرتا ہے اور جو لوگ باطل کی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں ان کو اس کے لئے ڈھیل دے دیتا ہے۔

مقصود اس حقیقت کے واضح کرنے سے ایک تو ان کفار و مشرکین کو جواب دینا تھا جو اس جبر کی آڑ لے کر اپنے کفر و شرک کو ثواب ٹھہرانا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر ان کا عقیدہ و عمل باطل ہے تو خدا کے اختیار میں تو سب کچھ ہے وہ اپنی قدرت کاملہ سے کام لے کر ان کو ٹھیک کیوں نہیں کر

دینا، دوسرے، جیساکہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر واضح کرنا تھا کہ بحیثیت نبی اور رسول کے ان کی ذمہ داری صرف دینِ حق کو اچھی طرح واضح کر دینا ہے، یہ ذمہ داری نہیں ہو کہ لوگ لازمًا ایمان و ہدایت کی راہ اختیار بھی کر لیں۔

اس زمانے میں بعض کم سواد اس آیت کو اس کے اس مفہوم سے ہٹاکر جبر قانونی کی نفی کے معنی میں لیتے ہیں اور اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ چونکہ اسلام میں اکراہ نہیں ہے اس وجہ سے اسلام کے نام سے فلاں اور فلاں باتوں کو جو مستوجب سزا قرار دیا جاتا ہے یہ محض مولویوں کی من گھڑت باتیں ہیں۔ اسلام سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس گروہ کے اس استدلال کو اگر صحیح مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی شریعت حدود و تعزیرات سے ایک بالکل خالی شریعت ہے جس میں ہر شخص کو سب کچھ کر گزرنے کی چھوٹ حاصل ہے۔ نہ زنا، تہمت اور چوری پر کوئی سزا ہے۔ نہ ڈکیتی، رہزنی، فساد فی الارض اور بغاوت پر کوئی تعزیر۔ حالانکہ ہر شخص جانتا ہے کہ اسلام میں حدود و تعزیرات کا ایک پورا نظام ہے جس کا نفاذ واجبات دین میں سے ہے۔ اگر ایک شخص نماز نہ پڑھے یا روزے نہ رکھے تو اسلامی حکومت اس کو بھی سزا دے سکتی ہے یہ چیز لا اکراہ فی الدین کے منافی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی مسلمان اسلام کے خلاف بغاوت کی روش اختیار کرتا ہے تو اس کے لئے بھی اسلامی قانون میں سزا ہے۔ یہ چیز بھی لا اکراہ فی الدین کے خلاف نہیں ہے۔ فتنہ و فساد کو خدا کی زمین سے مٹانے کے لئے اسلام نے اہل ایمان پر جہاد بھی واجب کیا ہے، یہ چیز بھی لا اکراہ فی الدین کے منافی نہیں ہے۔

اس امر میں شبہ نہیں ہے کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد بھی جو اس کے جی میں آئے کرتا پھرے اور اس پر کوئی گرفت نہ ہو بلکہ وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسلام کے حدود و قیود کی پابندی کرے۔ لادینی نظاموں میں مذہب کو نجی زندگی سے متعلق مانا جاتا ہے۔ اس وجہ سے ان میں حکومت کی نافرمانیوں پر تو سزائیں اور تعزیرات ہیں۔ لیکن خدا سے بغاوت کی آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن اسلام میں مذہب کے پرائیویٹ زندگی سے مخصوص ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلامی حکومت اصلاً خدا ہی

کی حکومت ہوتی ہے اور ریاست کا سیاسی ادارہ صرف خدا کے احکام و قوانین کے اجراء و نفاذ کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس میں خدا کی ہر نافرمانی قابل گرفت ہوتی ہے۔ خواہ وہ نافرمانی مخفی ہو یا ظاہر۔ فرق ہے تو یہ ہے کہ مخفی نافرمانیوں پر خدا کی اخروی عدالت گرفت کرے گی اور ظاہری نافرمانیوں پر اسلام کی دنیوی عدالتیں گرفت کرنے اور ان پر سزا دینے کی مجاز ہیں۔ ارتداد بھی اسی زمرے کا ایک جرم بلکہ بہت بڑا جرم ہے اور اس پر جو سزا ایک اسلامی نظام میں دی جاتی ہے۔ وہ اس بات پر نہیں دی جاتی کہ ایک شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس بات پر دی جاتی ہے کہ اس نے خدا کی حکومت اور اس کے قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے۔

اسی طرح اس امر سے ہمیں انکار نہیں ہے کہ مجرد کسی قوم کے اندر کفر کا وجود اس امر کے لئے کافی وجہ نہیں ہے کہ اسلام کے علمبردار ان کے خلاف جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں اور تلوار کے زور سے ان کو اسلام پر مجبور کر دیں۔ کافر قوموں کے ساتھ مسلمانوں کا تعلق لازماً ہر شکل میں معاندانہ ہی نہیں بلکہ مصالحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ جہاد اصلاً فتنہ اور فساد فی الارض کے مٹانے کے لئے شروع ہوا ہے اگر یہ چیز کہیں پائی جاتی ہے تو اہل ایمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اگر وہ استطاعت رکھتے ہیں تو اس فتنہ اور فساد فی الارض کو مٹانے کے لئے جہاد کریں، خاص طور پر اس فتنہ کو مٹانے کے لئے جو اہل کفر کے ہاتھوں اس لئے برپا کیا جائے کہ اہل ایمان کو ان کے دین سے پھیرا جائے یا اسلامی نظام کو برباد کیا جائے۔ اس فتنہ کے استیصال کے بعد اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس نے اپنے نظام میں اس بات کی پوری گنجائش رکھی ہے کہ اہل کفر اپنے کفر پر قائم رہتے ہوئے اسلامی حکومت کی رعایا رہ سکتے ہیں اور ان کے حقوق کی حفاظت اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ صرف مشرکین بنی اسمٰعیل کا معاملہ اس کلیہ سے ایک استثنا کی نوعیت رکھتا ہے۔ اس کے وجوہ تفصیل کے ساتھ اسی سورۃ کی آیات ۱۹۲ - ۱۹۳ کے تحت بیان کر چکے ہیں اور مزید وضاحت کے ساتھ اس پر ہم انشاء اللہ سورۃ برأت کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

"قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (ہدایت گمراہی سے بالکل الگ ہو چکی ہے) یہ مذکورہ اکراہ کی نفی کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ خدا کی طرف سے اتمام حجت کے لئے یہ کافی ہے کہ اس نے اپنے نبی کے ذریعہ سے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا۔ اس کے بعد اب ذمہ داری لوگوں کی ہے۔ جس کا جی چاہے۔

حق کو اختیار کرے اور جس کا جی چاہے باطل کے ساتھ چمٹا رہے۔ البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جو لوگ اس وضاحت کے بعد بھی باطل سے چمٹے رہیں گے تو ایک دن آئے گا کہ خود یہ باطل ان کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ نہ ٹوٹنے والی رسی صرف ان کے ہاتھ میں ہوگی جو آج غیر اللہ سے منہ موڑ کر اللہ کی طرف یکسو ہو جائیں۔

آخر میں سَمِیْعٌ وَّعَلِیْمٌ کی صفت کا حوالہ اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ جو لوگ غیر اللہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کی رسی کو پکڑتے ہیں وہ ایک ایسے کا دامن پکڑتے ہیں جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے اس وجہ سے وہ ہر قدم پر اور ہر مرحلے میں ان کا ملجا و ماویٰ ہے برعکس اس کے جو غیر اللہ کی پرستش کر رہے ہیں وہ ایسوں کے سہارے پر جی رہے ہیں جنہیں ان کے آغاز و انجام کا تو درکنار خود اپنے آغاز و انجام کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ یہاں تک کہ انہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ کچھ نادان لوگ ان کی پرستش کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی اس بے خبری کا اظہار آخرت میں کریں گے۔ اور اپنے ان پرستاروں پر لعنت بھیجیں گے۔

(۸۴) آگے کا مضمون۔ آیات ۲۵۷۔۲۶۰

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ الآیہ میں ہدایت و ضلالت سے متعلق جس سنت اللہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے آگے کی چند آیات میں اس کی مزید وضاحت فرما دی ہے۔ پھر کلام اصل سلسلہ بیان یعنی انفاق سے جڑ گیا ہے۔ یہ وضاحت تین واقعاتی مثالوں کے ذریعہ سے کی گئی ہے اس لئے کہ حقائق جب تک مثالوں سے نہ واضح کئے جائیں اس وقت تک وہ اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوتے۔ قرآن مجید کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ پہلے ہر مسئلہ سے متعلق عقلی فطری دلائل پیش کرتا ہے۔ پھر تاریخی اور واقعاتی مثالوں سے اس کو مدلل اور دل نشین بناتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ ہدایت و ضلالت سے متعلق اصل قانون الٰہی اصولی شکل میں پیش کرنے کے بعد تین مثالیں پیش کی ہیں جن میں سے ایک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور جن کو گمراہی سے نکل کر ہدایت کی طرف آنا نصیب نہیں ہوتا اور دوسرے سے یہ واضح ہوتا

ہے کہ کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ دستگیری فرماتا ہے اور ان کو ہر قسم کی الجھنوں سے نکال کر ایمان و یقین کی روشنی اور شرح صدر کی طمانیت بخشتا ہے۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۙ یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ۣ۬ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا
اَوْلِیٰٓـُٔھُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ یُخْرِجُوْنَھُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ
ع ۳۴ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۲۵۷ اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّھٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰہُ
نصف الْمُلْکَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ ؕ
قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ
فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ۲۵۸ اَوْ کَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ
وَّھِیَ خَاوِیَۃٌ عَلٰی عُرُوْشِھَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ ھٰذِهِ اللّٰہُ بَعْدَ مَوْتِھَا ۚ فَاَمَاتَهُ
اللّٰہُ مِائَۃَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ کَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ
قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَۃَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِکَ وَشَرَابِکَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ
انْظُرْ اِلٰی حِمَارِکَ وَلِنَجْعَلَکَ اٰیَۃً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ کَیْفَ
نُنْشِزُھَا ثُمَّ نَکْسُوْھَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ ۲۵۹ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ
قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ
ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ؕ وَاعْلَمْ
ع ۳۵ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۲۶۰

ترجمہ :- اللہ ان لوگوں کا کارساز ہوتا ہے جو ایمان لاتے ہیں، وہ انکو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان کے کارساز طاغوت بنتے ہیں، وہ ان کو روشنی سے تاریکیوں کی طرف دھکیلتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخی ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵۷ -

کیا تم نے اس کو نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے اس کے رب کے باب میں

اس وجہ سے حجت کی کہ خدا نے اس کو اقتدار بخشا تھا، جب کہ ابراہیم نے کہا
کہ میرا رب تو وہ ہے جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے، وہ بولا کہ میں بھی
زندہ کرتا اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ یہ بات ہے تو اللہ سورج کو پورب
سے نکالتا ہے تو اسے پچھم سے نکال دے، تو وہ کافر یہ سن کر بھوچکا رہ گیا اور
اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۲۵۸۔

یا جیسے کہ وہ جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر ڈھئی ہوئی پڑی تھی، اس
نے کہا کہ بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟
تو اللہ نے اس کو سو سال کی موت دے دی، پھر اس کو اٹھایا۔ پوچھا کتنی مدت
اس حال میں رہے؟ بولا ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصہ فرمایا بلکہ تم پورے
سو سال اس حال میں رہے۔ اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو
ان میں سے کوئی چیز بسی تک نہیں۔ اور اپنے گدھے کو دیکھو ہم اس کو کس
طرح زندہ کرتے ہیں تاکہ تمہیں اٹھائے جانے پر یقین ہو اور تاکہ ہم تمہیں لوگوں
کے لئے ایک نشانی بنائیں اور ہڈیوں کی طرف دیکھو، کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ
کھڑا کرتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ پس جب اس پر حقیقت اچھی
طرح واضح ہو گئی وہ پکار اٹھا کہ میں مانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۲۵۹۔

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب، مجھے دکھا دے تو مردوں
کو کس طرح زندہ کرے گا؟ فرمایا کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے؟ بولا ایمان
تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا، تو چار
پرندے لو اور ان کو اپنے سے ہلا لو، پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر پہاڑی پر ان کا
ایک ایک حصہ رکھ دو، پھر ان کو بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے
اور جان رکھو کہ اللہ غالب اور حکیم ہے۔ ۲۶۰۔

افادات فراہیؒ

مجید خاور صاحب

اسالیبِ قرآن

۱ - حذف

حذف سے مراد ہے کلام سے غیر ضروری اجزاء کو خارج کر دینا۔ غیر ضروری جزء وہ ہوتا ہے جس کے بغیر بھی بات پوری طرح سے سمجھ میں آجائے اور سننے والا اُس سے اثر قبول کرے۔ کلام کا مقصد سمجھنے اور اثر پذیری کے سوا کچھ نہیں۔ اگر ان دو مقاصد پہ مزید کچھ اضافہ کر دیا جائے تو کلام ثقیل ہو جاتا اور سامع کو اصل مقصد سے دُور کر دیتا ہے چونکہ سننے والے ذہانت اور اثر پذیری کے مختلف مدارج میں ہوتے ہیں اس لئے مختلف زبانوں میں حذف کی مقدار میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جہاں تک اہل عرب کا تعلق ہے ان کی ذہانت اور جلائے ذہنی کی وجہ سے بلیغ کلام ان کے نزدیک وہ ہوتا تھا جو قلّ ودلّ ہو۔ جو کلام غیر ضروری اجزاء سے پاک نہ ہوتا۔ وہ ان کی نگاہوں سے گر جاتا اور طول بیان کے عیب کی بنا پر وہ اس کو سننا گوارا نہ کرتے۔ ان کے نزدیک یا تو اس کا متکلم احمق ہوتا یا وہ یہ سمجھتے کہ وہ سُننے والوں کو احمق بنا رہا ہے۔ اس بنا پر ان کے کلام میں حذف کا پایا جانا ان کی فطری خصوصیات کا ایک حصّہ تھا اور اسی جبلت پر ان کی خلقت ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ چیز ان کے کلام میں مختلف پہلوؤں سے نمایاں ہوئی۔ مثلاً

۱ - دوسری زبانوں کے مقابلے میں ان کا کلام مشکل نہیں ہُوا۔ ان کی یہ خصوصیت اسی وقت تک قائم رہی جب تک ان کا کلام عجمی اثرات سے آزاد رہا۔ اس خصوصیت میں عبرانی بھی عربی ہی کی بہن ہے۔

۲ - انہوں نے ترکیب میں اکثر حروف کی ہیئتوں کو ساقط کر دیا۔ اسی لئے وہ اپنے ابتدائی ترکیبی خط کی وجہ سے تمام قوموں پر سبقت لے گئے۔

۳ - انہوں نے کلام کو روابط کلام مثلاً اضافت، خبر، تمییز، ظرفیت وغیرہ کو ظاہر کرنے والے حروف و الفاظ سے بے نیاز کر دیا اور یہ چیز زبان کی ترقی کی راہ میں ایک اہم قدم ہے۔

۴ - انہوں نے کلام کو ان تمام چیزوں سے پاک کر دیا جن پر قرینہ دلیل ہو۔ مثلاً بعض مواقع میں فعل اور بعض مواقع میں جواب شرط یا جواب قسم کو وہ حذف کر دیتے ہیں۔

۵ - قصوں اور دلائل کے باب میں وہ بعض تفصیلات یا مقدمات کو چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ دوسری قوموں میں ایسا نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ عجمیوں کے لئے ان کی بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

جب یہ حقیقت معلوم ہو گئی کہ عربوں کے ہاں حذف ایک کثیر الاستعمال اور واضح چیز ہے تو ہمارے لئے یہ ضروری قرار پاتا ہے کہ ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ اس کے لئے وہ کیا طریقے اختیار کرتے ہیں تاکہ محذوفات کے کھولنے میں کسی غلطی کا احتمال نہ رہے۔ ورنہ عین ممکن ہے کہ ہم کسی محذوف کی بنا پر بعض حالات میں کلام کے معانی کو بالکل بدل کر رکھ دیں۔

حذف کے مواقع

عربی میں حذف کے مختلف مواقع ہیں۔ مثلاً

ا - ماضی کے صیغے کو اس موقع پر حذف کر دینا جہاں وہ مضارع کے ساتھ مل کر آئے جیسے كَانَ يَفْعَلُ کی جگہ يَفْعَلُ۔ یہ اسلوب عربی میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ قرآنِ مجید کی چند آیات ملاحظہ ہوں:

(۱) فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِّمَّا يَعْبُدُ هٰٓؤُلَآءِ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا كَمَا يَعْبُدُ (یعنی كَمَا كَانَ يَعْبُدُ) اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ (ہود ۱۱: ۱۰۹)

تو یہ لوگ جو پوجا کرتے ہیں تم اس سے خلجان میں نہ پڑنا۔ یہ اسی طرح پوجا کرتے ہیں جس طرح ان کے باپ دادا پہلے سے پوجتے آئے۔

(۲) وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ وَمَا يَاْتِيْهِمْ (یعنی مَا كَانَ يَاْتِيْهِمْ)

مِن نَّبِيٍّ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ (الزخرف ۴۳: ۶-۷)
اور ہم نے اگلوں میں کتنے ہی نبی بھیجے۔ ان کے پاس کوئی نبی نہ آتا تھا مگر وہ اس کا مذاق اڑاتے تھے۔

(۳) وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ (یعنی جعل یصنع الفلک) وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ (ہود ۱۱: ۳۷-۳۸)
اور تو ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق کشتی بنا اور ظالموں کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا، یہ غرق ہونے والے ہیں، وہ کشتی بنانے لگا تو جب قوم کے سرکردہ لوگوں کا اس پر گزر ہوتا تو اس کا مذاق اڑاتے۔

(۴) وَكَذَٰلِكَ نُرِي (یعنی کنا نری) إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (الانعام ۶: ۷۵)
اور ہم اسی طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے کارخانہ کا مشاہدہ کراتے تھے۔

۲۔ کسی فعل کے بعد اس کے مشابہ فعل کا حذف کر دینا۔ جیسے کسی شاعر نے کہا ہے ع

وَزَجَّجْنَ الْحَوَاجِبَ وَالْعُيُونَا
انہوں نے پلکوں کو سنوارا اور آنکھوں میں سرمہ لگایا

یہاں اصل میں "وَكَحَّلْنَ الْعُيُونَا" ہے۔ الحواجب کے فعل کو بیان کرنے کے بعد کحلن کو حذف کر دیا۔

قرآن حکیم میں ہے:
وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ (الحشر ۵۹: ۹)
اور وہ لوگ جو پہلے سے گھروں میں رہے اور ایمان لائے۔
یہاں دراصل اتخذوا الایمان ہے لیکن اس کو محذوف کر دیا ہے۔

دوسری جگہ ہے:
وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ وَأَنْهَارًا (النحل ۱۶: ۱۵)
اور اسی نے زمین پر پہاڑ رکھ دیئے کہ تم کو لے کر وہ جھک نہ جائے اور اس میں دریا جاری کئے۔
یہاں أَجْرَىٰ فِيهَا أَنْهَارًا ہے۔

ایک اور جگہ ہے :

نَدۡعُ اَبۡنَآءَنَا وَاَبۡنَآءَکُمۡ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمۡ وَاَنۡفُسَنَا وَاَنۡفُسَکُمۡ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ

(آل عمران ۳ : ۶۱)

اگر اس آیت کے محذوفات کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی ۔

نَدۡعُ نَحۡنُ اَبۡنَآءَنَا وَاَنۡتُمۡ اَبۡنَآءَکُمۡ وَنَحۡنُ نِسَآءَنَا وَاَنۡتُمۡ نِسَآءَکُمۡ وَنَحۡنُ نُحۡضِرُ اَنۡفُسَنَا وَاَنۡتُمۡ اَنۡفُسَکُمۡ ثُمَّ نَبۡتَہِلۡ نَحۡنُ وَاَنۡتُمۡ ۔

ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ ۔ ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو بلاؤ ۔ ہم اپنے آپ کو حاضر کریں تم اپنے آپ کو حاضر کرو پھر ہم اور تم مباہلہ کریں ۔

۳ ۔ جزا کا حذف کر دینا ۔ یہ اسلوب عربی میں کثرت سے استعمال ہے ۔ سورہ زمر میں اس کی مثالیں موجود ہیں ۔ یہ اسلوب اکثر دلیل کے ذکر کے موقع پر آتا ہے ۔ جیسے :-

وَمَا تَفۡعَلُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِہٖ عَلِیۡمًا (النسآء ۴ : ۱۲۷)

اور تم جو بھلائی کرو گے وہ ضائع نہ ہوگی کیونکہ اللہ اس کا علم رکھنے والا ہے ۔

۴ ۔ شرط اور جزا دونوں کا ایسے موقع پر حذف کر دینا جہاں شرط خود بخود سمجھی جا سکتی ہو مثلاً آیت

اَیَبۡتَغُوۡنَ عِنۡدَھُمُ الۡعِزَّۃَ فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا (النسآء ۴ : ۱۳۹)

کیا یہ ان کے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ ان کو حاصل نہ ہوگی کیونکہ عزت تمام تر اللہ کی ہے کا اصل مفہوم یہ ہے اِنۡ یَبۡتَغُوۡا الۡعِزَّۃَ عِنۡدَھُمۡ لَنۡ یَجِدُوۡھَا فَاِنَّ الۡعِزَّۃَ کُلَّھَا بِیَدِ اللّٰہِ ۔

۵ ۔ عطف کے عام اصول کے مطابق کسی ایسے لفظ کا حذف کر دینا جس کا مشابہ جملے میں ایک مرتبہ ذکر ہو چکا ہو ۔ چنانچہ ہم جَآءَ زَیۡدٌ وَجَآءَ عَمۡرٌو کہنے کے بجائے جَآءَ زَیۡدٌ وَعَمۡرٌو کہتے ہیں ۔ قرآن مجید میں ہے :-

فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ وَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ اَلۡفٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَیۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ ۔ (الانفال ۸ : ۶۶)

اگر تم میں سے ایک سو ثابت قدم شخص ہوں گے تو دو سو پر غالب آئیں گے ۔ اور اگر تم میں سے

ایک ہزار ثابت قدم ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب آئیں گے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

یہاں "الفٌ" کے بعد "صابرٌ" محذوف ہے ۔ اس آیت کا آخری حصہ خود اس محذوف حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

۶۔ قول اور قائل کا ذکر اس کے کلام سے قبل حذف کر دینا۔ مثلاً قرآن حکیم میں ہے:

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ (قِيلَ لَهُمْ) أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (آل عمران ۳ : ۱۰۶)

جس روز بعض چہرے سفید اور بعض سیاہ ہوں گے تو ان میں سے جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کیا تم نے ایمان کے بعد کفر کیا؟ پس اپنے کفر کے سبب سے عذاب کا مزا چکھو۔

قرآن کریم میں اس اسلوب کی بے شمار مثالیں موجود ہیں ۔

۷۔ بات کے ایک حصہ کے بیان سے پہلے اس حصہ کو حذف کرنا جس میں متکلم نے کسی بات کا انکار کیا ہو اور بیان کردہ حصہ کلام جس کی طرف رہنمائی کر رہا ہو۔ مثلاً

قُلْ لَنْ تَتَّبِعُونَا كَذَٰلِكُمْ قَالَ اللَّهُ مِنْ قَبْلُ فَسَيَقُولُونَ بَلْ تَحْسُدُونَنَا (الفتح ۴۸ : ۱۵)

میں اصل کلام یوں ہوگا ۔ فَسَيَقُولُونَ لَمْ يَقُلِ اللَّهُ بَلْ أَنْتُمْ تَحْسُدُونَنَا ۔

(ترجمہ) کہو تم ہرگز ہمارے پیچھے نہ آؤ گے، خدا نے پہلے سے یہ ہدایت کر دی ہے ۔ تو وہ کہیں گے خدا نے ایسا نہیں کہا البتہ تم ہم سے حسد کرتے ہو۔

۸۔ کسی جملہ کا حذف کر دینا جیسے ۔ حَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ (الانبیاء ۲۱ : ۹۵) یعنی حَرَامٌ أَنْ يَرْجِعُوا ۔

(ترجمہ) اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کر دیا محال ہے کہ وہ واپس لوٹیں وہ رجوع نہیں کریں گے۔

۹۔ دو متقابلوں میں سے ایک کا حذف کر دینا جس پر اسکا مقابل دلیل ہو جیسے فرمایا!

فَأَذَاقَهَا اللَّهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ (ترجمہ) اللہ نے انکو بھوک کا مزا چکھایا اور خوف کا لباس (النحل ۱۶ : ۱۱۲)

پہنایا۔ یعنی فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ طَعْمَ الْجُوعِ وَأَلْبَسَهَا لِبَاسَ الْخَوْفِ ۔

دوسری جگہ ہے :-

جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا (یونس ۱۰: ۶۷) یعنی جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ مُظْلِمًا لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا لِتَبْتَغُوا فِيهِ ۔

ترجمہ اس نے تمہارے لئے رات کو تاریک بنایا کہ تم اس میں سکون پاسکو اور دن کو روشن بنایا کہ تم اس میں روزی کما سکو۔

ایک اور مثال ہے ۔

جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا (النبا ۷۸: ۱۰-۱۱) یعنی جَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَّسُكُونًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ ضِيَاءً وَّمَعَاشًا ۔ اسی قبیل سے حارث بن حلزہ کا یہ مصرع ہے ؎

وَالعَيْشُ خَيْرٌ فِي ظِلَالِ النَّوكِ مِمَّنْ عَاشَ كَدًّا

وہ زندگی جو حماقت کے زیر سایہ عیش و آرام میں گزرے اس زندگی سے بہتر ہے جو عقل کے ساتھ تنگدستی میں بسر ہو۔

اس کا مفہوم ہے العیشُ (فِي الرفاهية) مع الحُمق خير من العيش في الكد (مع العقل) شاعر نے پہلے جزء سے " الرفاهية " کو اور دوسرے سے " العقل " کو محذوف کر دیا اور " ظلال " کے ذکر سے " الرفاهية " کی طرف اشارہ کر دیا۔

عمرو بن معدیکرب کا ایک شعر ہے ؎

لَيْسَ الجمالُ بمئزرٍ

فاعلمْ وإنْ رُدِّيتَ بردا

جان لو کہ جمال کسی چادر یا تہمد کا نام نہیں خواہ تم کو چادر اڑھا دی جائے یا تہمد پہنائی جائے۔

حذف کھولنے پر یہ عبارت اس طرح ہو گی ليس الجمال ببرد ومئزر فاعلم وان رديت واتزرت ۔

۱۰ ۔ اس لفظ کا حذف کر دینا جس سے مذکورہ حرف جر متعلق ہو ۔ اس جملے کا حذف کھولنے کیلئے

کوئی ایسا لفظ مقدر ماننا پڑتا ہے جس پر مذکورہ حرفِ جر دلالت کرتا ہو۔ مثلاً حضرت حسان بن ثابتؓ نے فرمایا ؎

همُ جبلُ الاسلامِ والناسُ حولهُ
رضامٌ الیٰ طودٍ یروقُ ویقهرُ

ترجمہ:۔ گویا وہ اسلام کے پہاڑ ہیں اور لوگ اس پہاڑ کے ارد گرد ایک چٹان کی مانند ہیں جس کے چاروں طرف پتھر ہوں اور وہ چٹان ان کو فضیلت بخش رہی ہو اور ان کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہو۔

الیٰ طودٍ اصل میں مُسندۃٌ الیٰ طودٍ ہوگا۔ اسی طرح قَامَ اِلَیہِ کا مفہوم ہوگا قَامَ وَمَشٰی اِلَیہِ۔

۱۱۔ جوابِ قسم سے پہلے لا کا حذف کر دیا جانا۔ حضرت حسانؓ کا شعر ہے ؎

وَاللّٰہِ اسمعُ ماحییتُ بھالکٍ
الا بکیتُ علی النبی محمدٍ ﷺ

ترجمہ اللہ کی قسم جب تک زندہ ہوں، میں کسی مرنے والے کی موت کی خبر نہ سنوں گا مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ضرور روؤنگا۔

یعنی لا اسمع ماحییت

۱۲۔ جوابِ قسم کا حذف کر دینا۔ مثلاً وَالْفَجْرِ وَلَیَالٍ عَشْرٍ (الفجر ۸۹: ۱،۲) کے بعد جواب محذوف ہے۔ اہل نحو اس طرح کے مواقع میں کلام کو عام نحوی ضابطہ کے مطابق بنانے کے لئے غیر ضروری تکلف سے کام لیتے ہیں جس سے بات میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ محذوف ماننے سے یہ الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا اور جب کلامِ عرب میں اس کی واضح مثالیں موجود ہیں تو اس سے گریز کیوں ہو؟

بحث و نظر

امین احسن اصلاحی

"خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب"

مارچ، اپریل کے مشترکہ شمارے میں ہم نے ڈاکٹر فضل الرحمان صاحب کا ایک مضمون مذکورہ بالا عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس مضمون میں موصوف نے ان لوگوں کو جواب دینے کی کوشش کی ہے جو خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کو مذہب کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلا نکتہ جو ارشاد فرمایا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے۔

"اول تو یہی بات تعجب انگیز ہے کہ ..... ہم اپنی قوم کی مادی اور اخلاقی بہبود کی ترقی کے نازک ترین مسئلے سے دوچار ہوں اور اسلام اس کے آڑے آئے۔ اگر اسلام فی الواقع کسی لازمی اور حقیقی اخلاقی مطالبے کے پورا کرنے پر معترض ہوتا ہو تو پھر تو خدانخواستہ یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام غیر اخلاقی ہے"

ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ سے سب سے پہلے تو ہمارے سامنے اسلام کو جانچنے کے لئے وہ کسوٹی آتی ہے جس پر پرکھ کر یہ حضرات فیصلہ فرماتے ہیں کہ اسلام ایک اخلاقی مذہب ہے یا غیر اخلاقی ۔ وہ کسوٹی یہ ہے کہ جس بات کو یہ حضرات طے کر لیں کہ اس کا اختیار کیا جانا ان کی ترقی کے لئے ضروری ہے اسلام پر یہ واجب ہے کہ وہ اس کی تصدیق و تصویب کرے ورنہ خدانخواستہ یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام ایک غیر اخلاقی مذہب ہے جو ان کے ایک لازمی اور حقیقی مطالبے میں آڑے آرہا ہے شاید جسٹس کیانی مرحوم نے ان حضرات کی اسی منطق کا خلاصہ اس طرح پیش کیا تھا کہ "جو کچھ یہ کرتے ہیں وہ ٹھیک ہے اور اسلام ایک ٹھیک سا مذہب ہے اس وجہ سے وہ اس کا مخالف کس طرح ہوسکتا ہے" کیانی مرحوم کے ان الفاظ پر ان ڈاکٹر صاحب کی طرف سے اتنے الفاظ کا اور اضافہ

کر لیجیے کہ "اگر خدانخواستہ اسلام اس کا مخالف ہوا تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایک غلط مذہب ہے"۔
یہ حضرات ایک امر کا لازمی، حقیقی اور اخلاقی ہونا خود طے کرتے ہیں، اس بارے میں وہ اسلام سے کسی رہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں فرماتے، پھر اس کا علاج بھی خود ہی تجویز فرما لیتے ہیں اور اس امر میں بھی انہیں اسلام سے کسی مشورے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ اگر انہیں کوئی توجہ دلادے کہ ذرا یہ تو دیکھ لیجیے کہ اس بارے میں اسلام کیا کہتا ہے تو اس کا پہلا جواب تو وہ یہ دیتے ہیں کہ "اسلام اگر ہماری ایک حقیقی ضرورت میں آڑے آئے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام خدانخواستہ ایک غیر اخلاقی مذہب ہے"۔ اس کے بعد اسلام کو "اخلاقی" ثابت کرنے کے لئے یہ حضرات کمربستہ ہوتے ہیں اور اپنی مستشرقانہ ذہانت سے اس طرح کی دلیلیں گھڑنا شروع کرتے ہیں جس قسم کی دلیلیں اس مضمون میں فراہم کی گئی ہیں۔
اوّل تو یہ دیکھئے کہ اسلام سے رہنمائی حاصل کرنے کا طریقہ کتنا ستم ظریفانہ ہے کہ پہلے ترقی کا ایک معیار از خود طے کر لیا جاتا ہے، (اس کے طے کرنے میں کسی اجتہاد و بصیرت کو دخل نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر مبنی ہے یورپ اور امریکہ کی اندھی بہری تقلید پر) پھر یہ فیصلہ صادر فرما دیا جاتا ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اسلام اس ترقی کے حصول کی کسی تدبیر پر معترض ہو، اگر خدانخواستہ وہ معترض ہوا تو اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اسلام ایک غیر اخلاقی مذہب ہے۔ اس دلیل کو ذرا وسعت دیجیے تو ٹھیک اسی بنیاد پر یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ آج سود، شراب، زنا، جوا، رقص و سرود، بے پردگی، عریانی، مرد و زن کا آزادانہ اختلاط، سنیما، حسن کے مقابلے، قحبہ گری کے اڈے اور اس قبیل کی ساری شریفانہ چیزیں ہماری حقیقی ضروریات میں شامل ہیں اس لئے کہ تہذیب و ترقی کی ساری رونق انہی چیزوں سے ہے۔ پھر ایک قدم آگے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب موصوف کے الفاظ میں یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر اسلام ان باتوں پر معترض ہوتا ہے تو پھر تو یہ ماننا پڑے گا کہ خدانخواستہ اسلام ایک غیر اخلاقی مذہب ہے۔ بتائیے کہ اگر ان ڈاکٹر صاحب کا یہ اصول اجتہاد تسلیم کر لیا جائے تو ان حضرات کے ہاتھوں اسلام کا کیا حشر ہوگا؟
ان حضرات کے نزدیک یورپ اور امریکہ ترقی کے نمونے ہیں لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام بھی ان کو ترقی کے نمونے مانتا ہو، ہو سکتا ہے کہ اس کے نزدیک یہ ترقی کے نہیں بلکہ زوال و فساد کے نمونے ہوں، ترقی اور کمال کے نمونے اس سے بالکل مختلف ہوں۔ اسی طرح یہ کیا ضروری ہے کہ اسلام بھی بڑھتی

ہوئی آبادی کو ایک لعنت سمجھے اور اس کو مٹانے کے درپے ہو، ہمیں تو یہ علم ہے کہ وہ بڑھتی ہوئی آبادی کو ایک رحمت سمجھتا ہے اور اس آبادی کی کفالت اور اس کی اصلاح و تربیت کی اس کا نظام پوری پوری ذمہ داری لیتا ہے۔ اسی طرح یہ کیا ضروری ہے کہ معیار زندگی اونچا کرنے کا وہ جنون جو آج امریکہ میں پایا جاتا ہے (کہ خود ڈاکٹر صاحب کے بقول وہاں ایک شخص اپنے گھر میں ایک ریفریجریٹر کے اضافے کو ایک بچے کی ولادت پر ترجیح دے گا) اسلام میں بھی کوئی محبوب و مطلوب شے ہو، ہو سکتا ہے (بلکہ ہے) کہ اسلام اس چیز کو انسانی فطرت کا انتہائی بگاڑ قرار دیتا ہو اور معیار زندگی کے مسئلے کو وہ بالکل اس سے مختلف نگاہ سے دیکھتا ہو جس نگاہ سے اس کو ڈاکٹر صاحب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن ان باتوں کا صحیح صحیح اندازہ تو جب ہو جب یہ اسلام پر ایمان کی روشنی میں غور کریں۔ ان حضرات کا تو حال یہ ہے کہ تہذیب مغرب نے ان کی آنکھیں خیرہ کر رکھی ہیں اور مستشرقین نے ان پر اپنی عینکیں چڑھا دی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انہیں اسلام میں بھی وہی کچھ نظر آتا ہے جو یورپ اور امریکہ میں دیکھ آئے ہیں اور اگر کوئی صاحب بصیرت انہیں بتائے کہ آپ کی آنکھیں غلطی کر رہی ہیں تو کہتے ہیں کہ پھر تو ماننا پڑیگا کہ خدانخواستہ اسلام بالکل غیر اخلاقی ہے۔

ان حضرات کے سوچنے کا یہ انداز صرف مذہبی نقطۂ نظر ہی سے غلط نہیں ہے بلکہ عقلی اعتبار سے بھی بالکل غلط ہے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ کسی ملک میں بڑھتی ہوئی آبادی کو ایک خطرے کی حیثیت سے دیکھنے کا سوال اگر خدانخواستہ پیدا بھی ہو سکتا ہے تو اس وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اس کے تمام قدرتی وسائل و ذرائع آزمائے جا چکے ہوں۔ وہ ممالک جن کے وسائل و ذرائع میں سے ۲۵ فیصد بھی ابھی شاید آزمائے نہیں گئے اور جن کے ہاں اجتماعی سیرت و کردار کا حال یہ ہے کہ پانچ فی ہزار آدمی بھی ایسے مشکل سے مل سکیں گے جو اپنے سرکاری و اجتماعی فرائض دیانتداری سے انجام دیتے ہوں وہاں ترقی کا پہلا قدم اور اجتماعی زندگی کا سب سے پہلا سوال یہ نہیں ہے کہ آبادی کو بڑھنے سے کس طرح روکا جائے اور زندگی کے معیار کو کس طرح اونچا کیا جائے بلکہ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں ملک و قوم کی خدمت کا سچا جذبہ کس طرح پیدا کیا جائے، انہیں معیار زندگی اونچا کرنے کے مقابلوں سے الگ کر کے اس راہ پر کس طرح لگایا جائے کہ وہ ملک و قوم کے سچے بہی خواہ بنیں، اپنے فرائض ایمانداری سے ادا کریں، رشوت کو حرام جانیں، تھوڑے معاوضے پر اپنے ملک کی زیادہ سے زیادہ خدمت کریں

اور جی جان کی بازی لگا کر اس کے وسائل کو ترقی دیں۔ آج جن ملکوں اور قوموں کی ترقی اور ان کے معیار زندگی کو ہم رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جس دور میں انہوں نے یہ ترقیاں کی ہیں اور اپنے معیار زندگی کے اونچے کرنے کے یہ وسائل فراہم کئے ہیں اس دور میں وہ "خاندانی منصوبہ بندی" کی اصطلاح سے بھی واقف نہ تھے چہ جائیکہ وہ اس کو اپنی ترقی کے لئے ایک لازمی اور حقیقی مطالبہ ٹھہرائیں۔ جرمنی، فرانس، جاپان ان میں سے ہر ملک نے ترقی کی اور اپنے معیار زندگی کو اونچا کیا۔ ان میں سے کس کے متعلق آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ اپنی ترقی کے دور میں اس کو "خاندانی منصوبہ بندی" کے الفاظ بھی معلوم تھے۔ یہ اگر ترقی کے اس نسخہ کیمیا اثر سے واقف ہوئے ہیں تو اپنے اس دور میں واقف ہوئے ہیں جب ان کے سامنے ترقی کا نہیں بلکہ عیاشی کا سوال ہے۔ یورپ کے ملکوں میں شاید فرانس اس نسخے کا سب سے بڑا آزمانے والا قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اس نے جس قدر میں اس کو آزمایا ہے کیا وہ اس دور میں فی الحقیقت اپنی ترقی کے لئے اس کا محتاج تھا؟ یہ محض ایک عیاشی تھی جس کی سزا بھی پچھلی جنگ میں قدرت نے اس کو یہ دی کہ وہ اب زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرنے پر لوگوں کو انعامات اور تمغے بانٹ رہا ہے لیکن وہاں کوئی ان انعامات اور تمغوں کو لینے والا نہیں مل رہا ہے۔

یورپ اور امریکہ سے زیادہ تعجب انگیز معاملہ اشتراکی ممالک کا ہے۔ روس اور چین نے جو ترقی کی ہے اس کے معترف اب ان کے دشمن بھی ہوتے جا رہے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی اپنی تعمیر و ترقی کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں پیش آئی۔ خاندانی منصوبہ بندی تو درکنار وہاں جو عورتیں زیادہ بچے پیدا کریں ان کو امومت (MOTHER HOOD) کے تمغے اور وظیفے دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ بچے پیدا کرنے کے لحاظ سے چین شاید سب سے آگے رہنے والا ملک ہو۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ اشتراکی حکومتیں اپنے اپنے باشندوں کی ضروریات زندگی، ان کی تعلیم اور ان کے علاج کی ذمہ دار ہونے کی مدعی ہیں۔ اس پہلو سے اگر وہ خاندانی منصوبہ بندی کو اپنی تعمیر و ترقی کے لئے ناگزیر قرار دیتیں تو اس کے لئے ایک وجہ جواز بھی موجود تھی لیکن تب بھی انہوں نے اس کو ضروری قرار دیئے بغیر اپنے مسائل حل کر لئے اور اب ان کا مقام یہ ہے کہ دنیا ان سے ڈرتی بھی ہے اور ان سے طمع بھی رکھتی ہے تو آخر ہماری ہی تعمیر و ترقی کا سارا انحصار خاندانی منصوبہ بندی پر آ کر کیوں رہ گیا ہے۔ یہاں تک کہ اب یہی مسئلہ خود اسلام کے حق یا باطل ہونے

کی کسوٹی بن گیا ہے۔ اگر اسلام اس کے حق میں فیصلہ دیتا ہے تب تو وہ اخلاقی ہے اور اگر اس کے خلاف فتویٰ دیتا ہے تو ان ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ثابت ہو جائے گا کہ وہ غیر اخلاقی ہے۔

اسلام کے جانچنے کے لئے یہ کسوٹی مقرر کر چکنے کے بعد ڈاکٹر صاحب خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں شرعی دلائل کی تلاش میں نکلتے ہیں اور سب سے پہلے قرآن حکیم کی روشنی میں فرماتے ہیں:۔

"جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس کی آیات میں کہیں بھی یہ پابندی نہیں لگائی گئی ہے کہ ہم اپنے موجودہ مسائل کے حل کے طور پر ایک محدود عرصے تک تحدید آبادی کی کوئی کوشش نہ کریں بلکہ قرآن مجید نے تحدید آبادی کے مسئلہ سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا"۔

ڈاکٹر صاحب نے یہاں اپنے ان پیشرو مجتہدین کے طریق اجتہاد کی پیروی کی ہے جنہوں نے عائلی کمیشن کی رپورٹ میں یہ اصول اجتہاد بیان فرمایا ہے کہ جس چیز کی صریح الفاظ میں قرآن میں ممانعت وارد نہ ہو وہ اسلام میں مباح ہے۔ چونکہ قرآن میں کہیں بھی یہ بات لکھی ہوئی نہیں ہے کہ تحدید آبادی کوئی ممنوع فعل ہے اس وجہ سے اس کی حرمت یا کراہت کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ان حضرات کو کون سمجھا سکتا ہے کہ قرآن سے مسائل اخذ کرنے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔ از روئے قرآن کسی چیز کے ناجائز قرار پانے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ خاص طور پر اس کا نام لے کر اس کا ناجائز ہونا بیان ہو تب وہ ناجائز قرار پائے بلکہ حرمت وکراہت کے مختلف اسلوب ہو سکتے ہیں۔ فرض کیجیے ایک شے دین میں مطلوب ہے تو جو چیز اس مطلوب میں مزاحم ہوگی وہ دین کے خلاف ٹھہرے گی خواہ اس کا دین کے خلاف ہونا بیان ہوا ہو یا نہ ہوا۔ اسی طرح اگر ایک چیز کے محرکات دین کے عقائد اور اس کے اصول اخلاق پر اثر انداز ہوتے ہوں تو وہ چیز بھی اپنے اثرات کے اعتبار سے ناجائز یا مکروہ ٹھہرے گی خواہ خاص اس چیز کی کراہت یا حرمت بیان ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس ایک شئی اس پہلو سے بھی ناجائز قرار پا سکتی ہے کہ اس کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے ہیں وہ ناجائز ہیں یا اس سے جو نتائج نکلتے ہیں وہ افراد یا معاشرے کے لئے مہلک ہیں۔ اگر کسی چیز کے ناجائز ہونے کے لئے یہ ضروری قرار دیدیا جائے کہ تصریح اور تعیین کے ساتھ قرآن میں اس کا ذکر ہی ہو تو پھر تو بے شمار چیزوں کی حرمت کالعدم ہو جائے گی اگر ایک مرد تحدید آبادی کے نصب العین کی خاطر اپنے کو مخنث بنالے یا ایک عورت اپنے کو بانجھ بنالے

باقی بر صفحہ ۴۵

اقتباسات و تراجم

جناب محمود احمد صاحب

خُدا کی بندگی کے تقاضے

اللہ تعالیٰ کے ذمے بندے کے لئے تین چیزیں ہیں۔ ایک احکام جو وہ بندے کے لئے پسند کرے، دوسری تقدیر جو اس کے لئے روا رکھے۔ اور یہ تقدیر تکالیف اور عیوب دونوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اور تیسری نعمت جس سے وہ اس کو نوازے۔ بندہ کبھی ان تین چیزوں سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس بندے پر خدا کے لئے واجب یہ ہے کہ وہ ان تمام حالتوں میں بندگی کا رویہ اختیار کرے۔ چنانچہ مخلوق میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو ان سب حالتوں میں بندگی کی راہ کو متعین کرے اور اس کا حق ادا کر دے۔ یہی شخص سب سے زیادہ خدا کے قریب بھی ہوتا ہے۔ خدا سے بعید ترین آدمی وہ ہوتا ہے جو ان حالتوں میں عبودیت کی راہ نہ پا سکے اور علم و فعل دونوں کے اعتبار سے بندگی کے فریضہ میں کوتاہی کرے۔

احکام کے معاملے میں بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی بجا آوری کمال اخلاص کے ساتھ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے کی جائے۔ نواہی میں یہ مقام اس وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب خدا کا خوف، اس کی عظمت کا تصور اور دل میں اس کی محبت رکھتے ہوئے ممنوعات سے اپنا دامن بچایا جائے۔

مصائب و تکالیف میں عبودیت یہ ہوتی ہے کہ ان پر صبر کیا جائے اور تقدیر پر راضی رہا جائے۔ رضا کا یہ درجہ صبر کے درجہ سے بلند ہے اور اس سے بلند تر درجہ یہ ہے کہ مصائب و تکالیف پر خدا کا شکر ادا کیا جائے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوتا ہے جب دل میں خدا کی محبت جاگزیں ہو، اس کی پسند کی ہوئی چیز کو آدمی اپنے لئے اچھا سمجھے اور مصیبت میں بھی اس کے لطف و کرم اور احسان کا احساس رکھے، اگرچہ مصیبت اسے کیسی ہی ناگوار ہو۔ عیبوں اور کمزوریوں کی تقدیر کے بارے میں بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی فی الفور توبہ

کرے، گناہ سے دامن چھڑا لے اور معذرت اور انکساری کے مقام پر ڈیرے ڈال دے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہو کہ نہ اس کو اللہ کے سوا کوئی برائی کے گڑھے سے نکال سکتا اور نہ اس کے شر سے بچا سکتا ہے اور یہ کہ اگر وہ برائی قرار پکڑ گئی تو اس کو اللہ کے قرب سے دور ہٹا دے گی اور وہ خدا کے در سے دھتکار دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ اسے ایک ایسا ضرر خیال کرے جس سے خدا کے سوا کوئی نجات نہیں دے سکتا۔ وہ اس ضرر کو جسمانی تکلیفوں سے بھی زیادہ دردناک سمجھے۔ پھر وہ اللہ کے غضب سے اسی کی پناہ چاہے، اس کی سزا سے اسی کے عفو کا سہارا چاہے، اس کی ذات سے اسی کی پناہ مانگے اور اپنی فریادیں اور التجائیں اسی کے آگے پیش کرے۔ اسے اس بات کا خوب احساس ہو کہ اگر وہ برائی اس سے جدا ہو کر اس کے اور خدا کے درمیان معلق ہو بھی جائے تو خدا کے پاس اس جیسی اور اس سے بدتر اور برائیاں بھی ہیں۔ وہ اس حقیقت کو سمجھتا ہو کہ برائیوں سے دامن چھڑانا اور اللہ کی طرف پلٹنا بغیر اس کی توفیق اور مدد کے ممکن نہیں اور یہ کہ بندے کے اختیار میں کچھ نہیں کیونکہ بندہ خدا کے اذن، اس کی مشیت اور اس کی اعانت کے بغیر اس کے منشاء کی موافقت اور اس کی رضا جوئی کی کوشش میں کمزور، ناتواں بلکہ ناکارہ ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ رہ جائے کہ وہ عاجزی، مسکینی اور آہ وزاری کے ساتھ خدا کے سامنے التجا کرے، اپنے نفس کو اس کے سامنے بچھا دے۔ اس کے در پر پڑا رہے اور اس سے شرمسار ہو۔ گویا کہ اس کے نفس سے بڑھ کر خدا کے لئے کوئی شے ذلیل و شکستہ، حاجت مند اور بے کس نہیں، اور اس سے زیادہ کسی کی طرف راغب اور کسی سے محبت کرنے والی نہیں۔ ساتھ ہی اس کا حال یہ ہو کہ اس کے اعضاء و جوارح اللہ ہی کے اشغال میں سرگرم ہوں اور اس کا دل خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ وہ یہ یقین رکھتا ہو کہ بھلا نہ اس کے اندر ہے نہ اس کے ساتھ وابستہ ہے، نہ اس کی خاطر ہے اور نہ اس کے نفس کی جانب سے ہے۔ بلکہ تمام خیر و برکت اللہ ہی کی ہے، اسی کے دستِ تصرف میں ہے، اسی سے وابستہ اور اسی کی جانب سے ہے۔

نعمتوں کے بارے میں بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ نعمت کا قدرشناس اور اس کا معترف ہو پھر اس بات سے پناہ مانگے کہ اس کے دل میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف نعمت کو منسوب کرنے

کا وسوسہ پیدا ہو، کیونکہ اگر کوئی چیز سبب بنی تھی تو اس کا مسبب اور کارساز بھی خدا ہی تھا۔ کیونکہ ہر نعمت ہر پہلو اور ہر لحاظ سے اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس سے بھی اوپر عبودیت کا درجہ یہ ہے کہ نعمت سے سرفرازی پر خدا کی حمد و تعریف کرے، اس کی طرف محبت کے جذبے کے ساتھ بڑھے اور نعمت کو خدا تعالیٰ کی اطاعت میں استعمال کر کے خدا کا شکر بجا لائے۔

بندگی کے نازک اور لطیف پہلوؤں میں سے یہ ہے کہ خدا کی چھوٹی سے چھوٹی نعمت بندے کو بڑی دکھائی دے اور اس کی خواہ کتنی ہی شکر گزاری کرے اسے کم خیال کرے اور یہ جان لے کہ یہ نعمت اس کے مالک کی طرف سے اس کو اس حال میں دی گئی ہے کہ نہ اس نے کوئی پیسہ خرچ کیا نہ کسی وسیلے نے خدا تک اس کی رسائی کی نہ ہی وہ کوئی ذاتی استحقاق رکھتا تھا بلکہ حقیقت میں اس کا مالک اللہ ہے نہ کہ وہ بندہ۔ لہٰذا ہر نعمت اس میں عجز و انکساری، تواضع اور احسان کرنے والے سے محبت میں اضافہ کا باعث بنے۔ جب کبھی نئی نعمت حاصل ہو اس کے اندر عبودیت و محبت کا نیا جذبہ پیدا ہو، جب کبھی اس سے کوئی نعمت واپس لے لی جائے اس کے اندر تسلیم و رضا کی نئی کیفیت پیدا ہو، جب اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے وہ توبہ اور انکساری کے ذریعے سے اپنی غلطی کا مداوا کرے۔ یہی خصوصیات رکھنے والا بندہ حقیقتاً عقلمند ہے اور جو ان صفات سے عاری ہے اس کی دنیا اس بندہ عاقل سے بالکل الگ ہے اور توفیق تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

(الفوائد)

بقیہ مضمون صفحہ ۴۲ (خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب)

تو ان کے بھی ہاتھ نہیں پکڑے جا سکتے اس لئے کہ قرآن میں تعیین کے ساتھ ان باتوں کی کہیں ممانعت تو وارد نہیں ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ یہ افعال شنیعہ کسی پہلو سے بھی اسلام میں جائز ہو سکتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

تقریظ و تنقید

○ سُنت قرآن کے آئینہ میں

تصنیف :- شیخ الحدیث مولٰنا محمد اسمٰعیل سلفی ۔

شائع کردہ :- انجمن اشاعۃ السنۃ ۳۴۸ جناح کالونی لائلپور ۔

۳۲ صفحات کا یہ کتابچہ انجمن اشاعۃ السنہ لائلپور نے شائع کیا ہے ۔ یہ انجمن ایسے نوجوانوں پر مشتمل ہے جن کا مقصد وحید اپنی زندگیوں کو اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق سنوارنا' دوسروں کو راہ ہدایت کی دعوت دینا اور کتاب و سنت کی اشاعت و تبلیغ کرنا ہے ۔

زیر نظر کتابچہ میں فاضل مؤلف نے ان لوگوں کو بے نقاب کیا ہے جو صرف عربی لغت کو قرآن کا شارح تسلیم کرتے ہیں اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح اور تفسیر کے بجائے وہ "مرکز ملت" کو اس کے معانی و مطالب متعین کرنے کا حق دیتے ہیں ۔

اس کتابچے کے مختلف عنوان یہ ہیں :- وحی کے مختلف طریقے ، قرآن مجید میں احادیث کا تذکرہ منکرین سنت کا عجز ، انکار حدیث کا پس منظر ، قرآن و حدیث کا باہمی ربط ۔

یہ کتابچہ اگرچہ موضوع کے اعتبار سے بہت کچھ تشنہ ہے تاہم اس کے مطالعہ سے فائدہ ہوگا ۔

○ مغربی پاکستان اسمبلی کی ناپاک جسارت

شائع کردہ :- انجمن اشاعت السنہ جناح کالونی لائلپور

یہ کتابچہ اس آرڈی ننس کے خلاف لکھا گیا ہے جو پچھلے دنوں مغربی پاکستان اسمبلی کی اکثریتی پارٹی نے ہنگامی قانون (ترمیم) قانون فوجداری مغربی پاکستان مجریہ ۱۹۶۳ء کی توثیق کے لئے پیش کیا ۔ اس قانون میں چند فوجداری جرائم کو قابل مصالحت قرار دیا گیا ہے اور ان جرائم میں زنا بھی شامل ہے ۔

قرآن مجید کی صریح نصوص کی روشنی میں ارباب اختیار کو انتہائی سوز اور خیرخواہی سے اس غلط سلے کو منسوخ کر دینے کی جانب متوجہ کیا گیا ہے۔

مذکورہ دونوں کتابچے ۳۷ پیسے کے ٹکٹ بھیج کر ناظم انجمن مذکور سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔

○ پیارے رسُول کی پیاری دعائیں

مرتبہ :- محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی

صفحات :- ۸۸ قیمت :- ۷۵ پیسے

شائع کردہ :- المکتبۃ السلفیہ شیش محل روڈ لاہور

دُعا بندے اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ بندہ محتاج ہے اور ں کا کام یہ ہے کہ وہ ہر وقت اپنی تمام ضروریات اپنے مالک حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہے۔ شریعت میں دُعا کی اہمیت کو مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ احادیث میں دُعا کو عبادت مغز قرار دیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں نہایت ہی مثالی دعائیں ہیں اور زیرِ نظر کتاب ی مسنون دعاؤں کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔

اس کتاب کو فاضل مصنف نے حوالوں کے ساتھ اس طرح ترتیب دیا ہے کہ ایک مسلمان صبح بیدار ہونے سے لے کر رات کو سونے تک کے تمام مراحل میں انہیں پڑھ سکے۔

شروع میں عنوانات کی فہرست دے دی گئی ہے جس سے مختلف اوقات کی دعائیں آسانی ے تلاش کی جا سکتی ہیں۔

یہ مجموعہ مستند ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مفید ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمان اسے حرزِ جان بنائیں۔

(م-د)

◉ چند اہم مطبوعات مولانا امین احسن اصلاحی

	پیسے	روپے
تدبر قرآن (قرآن فہمی کی رہنما)	۲۵	۳
تدبر قرآن (تفسیر آیہ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ)	۷۵	۰
اسلامی قانون کی تدوین　۳/۰	۰	۲
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ	۲۵	۲

مطبوعات دیگر مصنفین

	پیسے	روپے
حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)	۵۰	۲۲
(آنحضرت ﷺ) سیرت ابن ہشام	۰	۱۰
ابوبکر رضہ صدیق اکبر	۰	۱۰
عمر رضہ فاروق اعظم	۰	۲۰
امام اعظم رح	۰	۴
حیات امام احمد بن حنبل رح	۰	۱۰
آثار امام شافعی رح	۰	۱۲
حیات امام مالک رح	۰	۱۰
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح	۰	۲۱
زادِ سفر (حصہ اوّل)	۷۵	۳
ISLAM AND THE WORLD.　Rs. 4.00	۰	۴

ملنے کا پتہ:- مکتبۂ میثاق (رحمانپورہ) اچھرہ - لاہور ۱۲-

محی الدین پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر "دفتر میثاق" رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا

۱۹۶۵ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ چھ روپے (چندہ ملک)

جلد نمبر

شمارہ نمبر (۹)

جمادی الاول

فہرست مضامین

ماہنامہ میثاق لاہور

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پاکستان میں دینی تعلیم کا حال و مستقبل

اس مرتبہ تذکرہ و تبصرہ کی جگہ ایک تقریر دی جا رہی ہے جو میں نے ستمبر ۱۹۶۳ء کی شام کو "شام ہمدرد" کی تقریب میں پارک لگژری ہوٹل میں کی۔ جناب حکیم محمد سعید صاحب دہلوی صاحب ہمدرد وقتاً فوقتاً "شام ہمدرد" کے نام سے ایک تقریب مناتے ہیں جس میں شہر کے معززین اور اصحاب علم کو چائے پر بلاتے ہیں اور کسی خاص شخص کو کسی اہم موضوع پر مقالہ پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس مرتبہ از راہ ذرہ نوازی موصوف نے اس ناچیز کو یہ عزت بخشی۔ اگرچہ میں نے اپنے آپ کو اس قسم کی تقریبات کے لئے ہمیشہ بالکل ناموزوں آدمی سمجھا ہے لیکن موصوف کے اصرار پر مجھے یہ دعوت قبول کرنی پڑی اور میں نے اس اجتماع میں "پاکستان میں دینی تعلیم کا حال و مستقبل اور ہماری ذمہ داری" کے عنوان سے ایک تحریر پڑھی۔ اگرچہ اس تحریر کا بیشتر حصہ بعض روزناموں میں آ گیا ہے اور ریڈیو والوں نے بھی اس کا جو حصہ مفید مطلب پایا ہے وہ نشر کر دیا ہے اس وجہ سے میں میثاق میں اس کی اشاعت غیر ضروری خیال کرتا تھا لیکن رفقاء کا اصرار ہے کہ اس کی اشاعت میثاق میں بھی ضروری ہے۔ چنانچہ ان کی خواہش پر یہ میثاق میں بھی دی جا رہی ہے۔ صفحات کی کمی کے سبب سے تذکرہ و تبصرہ کے صفحات اس کی نذر کرنے پڑے حالانکہ اس مرتبہ مجھے تذکرہ و تبصرہ میں بعض ضروری باتیں لکھنی تھیں جن کو اب آئندہ شمارے کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔ (ایڈیٹر)

حضرات!

میں جناب حکیم صاحب محترم کا صدق دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس ناچیز کے لئے آپ کے سامنے اظہار خیال کا ایک موقع فراہم کیا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک ایسے مسئلہ کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو میرے لئے ایک درد دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر اس درد کی کوئی کسک میں آپ کے دلوں میں بھی پیدا کر سکا تو سمجھوں گا کہ میرا یہاں آنا فائدے سے خالی نہیں رہا۔ اگرچہ ایک طبیب حاذق کی ترتیب دی ہوئی اس مجلس میں میری طرف سے درد کا تحفہ تقسیم کیا جانا بالکل ناموزوں سی بات ہے۔ اطباء کے پاس لوگ دوا کے لئے آیا کرتے ہیں، نہ کہ درد کے لئے۔ لیکن آپ اطمینان رکھیں

میں جو درد تقسیم کرتا ہوا آیا ہوں وہ سر کا درد نہیں بلکہ دل کا درد ہے۔ دل کے متعلق تو شاید آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ اس کی صحت و زندگی تمام تر اس کی دردمندی ہی میں منحصر ہے۔ اگر دل میں درد نہ ہو تو پھر دل' دل نہیں ہے بلکہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے' جو سینے میں چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں بلکہ زمین پر پھینک دینے کی چیز ہے۔

حضرات! آپ جیسے ہوشمند لوگوں سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہو سکتی کہ ہم مسلمان نسل و نسب، رنگ و خون، ملک و وطن اور لسانی و جغرافی حد بندیوں کی پیدا کی ہوئی کوئی قوم نہیں ہیں۔ ہم اس طرح وجود میں نہیں آگئے ہیں جس طرح کیکر کی جڑ سے دوسرا کیکر اور آم کی گٹھلی سے دوسرا آم پیدا ہو جایا کرتا ہے' بلکہ ہم ایک مخصوص نظریہ حیات' ایک مخصوص نظام عقائد و اعمال اور ایک مخصوص طرز زندگی سے ترکیب پائی ہوئی ایک ملت ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ یہی اسلام ہے جو ہمیں دوسروں سے الگ کرتا اور آپس میں ایک دوسرے سے جوڑتا ہے' یہی خلق اور خالق کے ساتھ ہمارے حقوق و فرائض کی حد بندی کرتا ہے۔ یہی ہماری دنیا اور عقبیٰ دونوں کی کامیابیوں کا ضامن ہے اور ہمارے رب کی طرف سے اسی پر جینے اور اسی پر مرنے کا ہم سے مطالبہ ہے۔

حضرات! قاعدہ ہے کہ جو چیز جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے انہی عناصر پر اس کی صحت و زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ اگر وہ عناصر مناسب مقدار میں موجود رہیں تو وہ چیز صحیح حالت میں رہتی ہے اگر وہ کم ہو جائیں تو وہ چیز کمزور ہو جاتی ہے اور اگر وہ مفقود ہو جائیں تو وہ چیز بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کو آپ خود اپنے جسم کی مثال سے نہایت بہتر طریقے پر سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کا جسم جن اجزا سے مرکب ہے انہی اجزا کی متناسب موجودگی سے وہ توانا اور تندرست رہتا ہے' اگر وہ اجزا تحلیل ہو جائیں اور آپ اس کے لئے متناسب غذا اور احتیاط سے بدل ما یتحلل نہ فراہم کرتے رہیں تو آپ کمزور یا مریض ہو جاتے ہیں اور آپ کو کسی حاذق حکیم کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے جو آپ کا معائنہ کر کے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ آپ نے اپنی بد احتیاطیوں سے اپنے جسم کے کن اجزائے ترکیبی کو نقصان پہنچایا ہے اور پھر اس سے آپ کے نظام جسمانی میں کیا کیا خلل واقع ہو گئے ہیں اور اب ان کی اصلاح یا تلافی کے لئے کیا کیا احتیاطیں اور کیا کیا غذائیں اور دوائیں ضروری ہیں۔ میں کوئی طبیب نہیں ہوں لیکن اتنی بات تو ایک عامی بھی جانتا ہے کہ غذا ہو یا دوا اس سے اصل مقصد انہی عناصر کو مدد پہنچانا ہوتا ہے جن سے ہمارے

جسم کی تعمیر ہوئی ہے۔ مگر کبھی ہم محض اپنے اندر ایک جوش یا نشاط پیدا کرنے کے لئے کوئی ایسی چیز استعمال کر بیٹھتے ہیں جو ہمارے اصل تعمیری اجزا سے موافقت نہیں رکھتی تو اس سے ایک عارضی جوش درمیان تو ضرور پیدا ہو جاتا ہے جسے ہم غلط فہمی سے علامت صحت خیال کر لیتے ہیں لیکن بالآخر اس کا ردِعمل نہایت بُرا ہوتا ہے جس سے بسا اوقات ہم اپنا مزاجی توازن کھو بیٹھتے ہیں۔

ٹھیک اپنے جسم ہی پر آپ اپنے جسد ملّی کو قیاس کیجیے۔ ہمارے جسد ملّی کے ضعف و قوت اور مرض و صحت کا انحصار بھی انہی اجزا کی کمی بیشی اور عدم و وجود پر ہے جن سے اس کی تشکیل ہوئی ہے میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ اس کی تشکیل نسل نسب خون رنگ اور وطن کے روابط یا محض زبان اور تہذیب کے اشتراک سے نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ جس چیز نے اس کو ریڑھ کی ہڈی بخشی ہے وہ قرآن ہے، جس چیز نے اس کو ایک حسین و جمیل پیکر دیا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، جس چیز نے اس کو بنیان مرصوص بنایا ہے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا رابطہ ہے اور جس چیز نے اس کے اندر زندگی، حرارت اور فدا کاری و قربانی کا خون دوڑایا ہے وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور ان کی محبت ہے۔ اگر آپ مانتے ہیں کہ فی الواقع ملت اسلامیہ کی تعمیر و تشکیل انہی چیزوں سے ہوئی ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص اس واضح حقیقت سے انکار کی جرأت کیسے کر سکتا ہے تو مجھے یہ سوال کرنے کی اجازت دیجیے کہ کیا مسلمان ان چیزوں سے بے نیاز ہو کر دنیا میں قائم رہ سکتے ہیں، میرا خیال ہے کہ آپ میں سے ہر شخص اس سوال کا جواب نفی ہی میں دے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ میرا یہ سوال ملت اسلامیہ کے متعلق بحیثیت ملت اسلامیہ ہے یعنی جس حیثیت میں وہ خیر امت قرار دی گئی ہے اور اس کو شہداء اللہ فی الارض کے منصب پر سرفراز کیا گیا ہے۔ اپنی اس مخصوص حیثیت میں قائم رہنے اور اس حیثیت سے اس کے ترقی کرنے کی واحد شکل اگر کوئی ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے کہ جن اجزائے فکری و اعتقادی اور جن عناصر ایمانی و اخلاقی سے وہ وجود پذیر ہوئی ہے ان کا شعور و اعتقاد اس کے تمام افراد میں اگر نہیں تو کم از کم بیشتر میں زندہ اور متحرک رہے۔ اگر یہ زندہ و متحرک نہ رہے تو سمجھئے کہ ملت مردہ ہے۔ اگرچہ اس کے قبضے میں دنیا جہان کے تمام اسباب و وسائل موجود ہوں۔ اگر آپ اس کے اندر زندگی کی حرکت پیدا کرنے کے لئے کوئی ایسا خارجی محرک لائیں گے جو خود اس کے اپنے مزاج سے بیگانہ ہوگا تو اس سے اس کے اندر وقتی طور پر ایک حرکت تو شاید پیدا ہو جائے گی لیکن

یہ حرکت اس کی اپنی فطری حرکت سے بالکل مختلف ہوگی۔ اس کی مثال بالکل ویسی ہی ہوگی جس کا ذکر کچھ عرصہ پہلے اخباروں میں آیا تھا کہ کچھ بوڑھوں پر اعادہ شباب کا تجربہ کرنے کے لئے ان کے اندر بندروں کے غدود منتقل کئے گئے تو اس سے ان کے اندر زندگی کی حرکت تو پیدا ہوئی لیکن وہ حرکت انسانوں کے مقابل میں بندروں کی حرکات سے زیادہ مشابہ تھی۔

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر صرف الٹی سیدھی کوئی حرکت ہی مطلوب ہو تب تو یہ کسی بھی ہنگامی نعرے سے پیدا کی جا سکتی ہے اور آج ہمارے مسلمان ممالک میں لیڈر حضرات اس قسم کے نعروں کا تجربہ بھی کر رہے ہیں لیکن پیش نظر اگر صرف کوئی حرکت نہیں بلکہ صحیح قسم کی حرکت اس نصب العین کی راہ میں مطلوب ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اُمت مسلمہ کی بعثت فرمائی ہے تو مجھے بتائیے کہ اس کی تدبیر اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان افکار و عقائد اور ان اصول و مقاصد کا صحیح شعور و احساس قوم میں پیدا کیا جائے جن کے شعور و احساس ہی نے اس کو وجود بخشا تھا؟

حضرات! یہ شعور و احساس نہ تو کوئی منقولہ یا غیر منقولہ جائداد ہے جو آپ سے آپ باپوں سے بیٹوں کو منتقل ہوتی رہے اور نہ یہ کوئی سادہ سا منتر ہے جو جب آپ چاہیں لوگوں کے کانوں اور دلوں کے اندر پھونک دیں بلکہ اس کے پیدا کرنے کے لئے تعلیم و تربیت کے ایک ایسے سلسلے کی ضرورت ہے جو ہماری پوری زندگی پر حاوی ہو۔ جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ قرآن کیا ہے اور اس نے ہمیں کیا رہنمائی دی ہے؟ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کس مقصد سے ہوئی اور ہمارے تعلق کی نوعیت آپ کے ساتھ کیا ہے؟ ہمارا قانون کیا ہے اور وہ کن پہلوؤں سے دنیا کے تمام قوانین سے بالاتر ہے؟ ہمارا فلسفہ کیا ہے اور کن اعتبارات سے وہ دنیا کے تمام فلسفوں پر ترجیح رکھتا ہے؟ ہماری تاریخ کیا ہے اور کس طرح وہ دنیا کی تمام تاریخوں سے شاندار اور روشن ہے؟ ہمارا نظام زندگی کیا ہے اور کن پہلوؤں سے اس کو دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت حاصل ہے؟ اس وقت تک ہم کیا جان سکتے ہیں کہ ہم خود کیا ہیں، دنیا میں کیوں آئے ہیں، اور ہمیں کس مقصد کے لئے جینا اور کس عشق میں مرنا ہے؟

یہ کام نہایت وسیع و عمیق کام ہے جو اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہمارا نظام تعلیم و تربیت اس کی ذمہ داری اٹھائے لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک مدت سے ہمارے ہاں جو نظام تعلیم و تربیت

ملتی ہیں وہ دوسرے پہلوؤں سے اپنے اندر جو افادیت بھی رکھتے ہوں لیکن مذکورہ بالا مقصد کے لحاظ
سے ان کی افادیت بمنزلہ صفر ہے۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو شائد بیجا نہ ہو کہ اس مقصد کے لئے وہ مفید ہونے
کے بجائے مُضر ہیں۔ میری یہ رائے ملک میں رائج دونوں ہی نظاموں سے متعلق ہے۔ اُس نظام
سے متعلق بھی جو قدیم کہلاتا ہے اور اس نظام سے متعلق بھی جو جدید کے نام سے موسوم ہے اور جس کو ملک
کے اصلی نظام تعلیم و تربیت کی حیثیت حاصل ہے۔ میں مختصراً ان دونوں کی نوعیت آپ کے سامنے واضح
کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ اندازہ کر سکیں کہ ملی و اسلامی نقطہ نظر سے ان کی کیا حیثیت کیا ہے۔ میں پہلے
جدید نظام تعلیم کو لیتا ہوں۔

جدید نظام تعلیم کے متعلق آپ یہ جانتے ہیں کہ اس کا تحفہ ہمیں انگریزوں سے ملا ہے۔ اس کو
جب انہوں نے ہمارے ملک میں رائج کیا ہے تو ان کے پیش نظر نہ تو یہ بات تھی اور نہ ہو سکتی تھی کہ اس
سے ہمارے اندر خود شناسی پیدا ہو۔ یعنی ہم اپنے آپ کو پہچانیں کہ ہم کیا ہیں بلکہ واضح طور پر اس
سے ان کا مقصود ہمارے اندر انگریز شناسی یا انگریزی شناسی پیدا کرنا تھا تاکہ ان کو اپنے دفتروں
کے لئے سستے اور وفادار خادم مل سکیں۔ اس مقصد کے لئے ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی تعلیم کی ان کو
مطلق ضرورت نہ تھی۔ سیاسی اعتبار سے بھی وہ ہماری مذہبی تعلیم کو ایک خطرناک چیز سمجھنے پر مجبور تھے
اس لئے کہ وہ دیکھ چکے تھے کہ مسلمانوں کے اس دورِ زوال میں بھی اس تعلیم سے سید احمد شہیدؒ اور
اسمٰعیل شہیدؒ پیدا ہو سکتے ہیں محض وقتی ضروریات اور مسلمانوں کی ذرا دلداری کے خیال سے انہوں
نے اس کا کوئی حصہ اپنے نظام تعلیم میں سمونے کی کوشش بھی کی تو اول تو اس کی حیثیت اکبر مرحوم کے الفاظ میں
بادہ گلگوں میں زمزم کے چند قطروں سے زیادہ نہ تھی پھر ان قطروں کو بھی انہوں نے تحلیل کیمیاوی کے ذریعہ
سے اچھی طرح صاف کر لیا تھا کہ ان میں کوئی ایمانی جرثومہ باقی نہ رہ جائے۔

اس نظام تعلیم نے ہماری قوم کے کھاتے پیتے گھرانوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور اس کے جو بُرے
اثرات ان پر پڑنے تھے وہ بھی پڑے لیکن پھر بھی یہ خیریت تھی کہ غربا کے لئے اس تعلیم کے دروازے پوری
طرح کشادہ نہ تھے اس وجہ سے وہ اس کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہو سکے۔ ان میں سے جن کو تعلیم کا
شوق ہوا وہ اسی مذہبی تعلیم کی طرف متوجہ ہوا جس کے مرکز مسجدیں، دینی مدرسے اور مختلف علماء کے
حلقہائے درس تھے۔ علاوہ ازیں چونکہ انگریز، انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب و تمدن سے ہمارے

[illegible] کے بھی ایک طبقے میں خطرے کا احساس موجود تھا [illegible]
طبقہ مذہب اور مذہبی روایات سے وابستہ رہا اور اس طرح [illegible] مذہبی تعلیم [illegible] قائم رہا۔

انگریزوں کی غلامی سے رہائی کے بعد ہونا تو یہ تھا کہ سب سے پہلے ہم اس نظام تعلیم میں ایسی تبدیلی پیدا [illegible] یہ ہمارے ملی و اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے والا بن سکتا، ہم مغرب کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ [illegible] خود اپنے کو بھی پہچان سکتے اور جدید کے استفادہ کے ساتھ ساتھ اپنے قدیم سے بھی [illegible] سکتے لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم پوری وفاداری کے ساتھ اسی نظام تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں جو انگریزوں سے ہمیں ورثے میں ملا ہے۔ اس میں اگر کوئی تبدیلی ہوئی بھی ہے تو دینی و اسلامی نقطہ نظر سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اور جہاں تک اس نظام تعلیم کی کشش کا تعلق ہے وہ انگریزوں کے دور کے لحاظ سے اب ہزار گنی بڑھ گئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اس سے ایک طبقہ میں جو بیگانگی تھی وہ نہ صرف دور ہو گئی ہے بلکہ وہ عقیدت و محبت سے بدل گئی ہے۔ انگریزوں کی اسلام دشمنی کے سبب سے دین اور دینی تعلیم کے لئے ہمارے دلوں میں حمیت و حمایت کا جو جذبہ تھا وہ اب سرد پڑ چکا ہے، ہر درجے کی ملازمت اور ہر میدان میں مسابقت کی راہ اس تعلیم نے اب ہر طبقے کے لئے کھول دی ہے اس وجہ سے ہر شخص کا قبلہ و کعبہ اب یہی ہے۔ اب غرباء کے لئے بھی اس کے دروازے [illegible] ہیں اس وجہ سے اب ان کے بچے بھی مسجدوں اور عربی مدرسوں کے بجائے اسکولوں اور کالجوں ہی کے رخ کرتے ہیں۔ بس کوئی ایسا ہی مظلوم و مسکین ہوتا ہے جس کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تو وہ عربی مدرسوں کی طرف نکل پڑتا ہے کہ ع

اُس در پہ نہیں بار تو کعبے ہی کو ہو آئے

دینی تعلیم کے جو ادارے ہمارے ملک میں تھے یا ہیں اس اعتبار سے تو وہ تمام دینی حس رکھنے والے مسلمانوں کے شکریے کے مستحق ہیں کہ آج ہمارے ملک میں جتنا کچھ بھی قال اللہ و قال الرسول کا چرچا ہے بہر حال انہی کا فیض ہے۔ یہ اگر نہ ہوتے تو انگریزی اقتدار کے بعد ہمارے ملک میں جو انقلاب آیا تھا وہ شاید ہمیں اتنا بدل دیتا کہ ہمارے اندر نکاح پڑھنے اور جنازے کی نماز پڑھانے والے بھی مشکل ہی سے ملتے لیکن ان کے اس احسان کے اعتراف کے ساتھ اس امر واقعی کا اظہار بھی ضروری ہے کہ یہ مدارس ایک مدت دراز سے ایسے جمود میں مبتلا ہیں کہ ان سے اس سے زیادہ خدمت کی توقع نہیں کی جا سکتی

تھی جو انہوں نے انجام دی۔ اول تو یہ مدارس جس نصاب تعلیم اور جس طریقہ تعلیم کو اپنائے ہوئے ہیں وہ وقت کی ضروریات اور زمانہ کے حالات سے اتنا بیگانہ ہے کہ اب اس کے اندر نہ تو کوئی افادیت باقی رہی ہے نہ کوئی کشش۔ یہ نصاب جس زمانے میں اختیار کیا گیا تھا اس زمانے کے حالات کے لحاظ سے موزوں اور دین و دنیا دونوں کا جامع تھا۔ ضرورت تھی کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے قرآن، حدیث، فقہ کے سوا نصاب کے دوسرے اجزا بدل جاتے لیکن ہمارے دینی مدارس کے کارفرماؤں نے کم و بیش سو سال پہلے کے نصاب کو بھی تقدیس کا یہ درجہ دے رکھا ہے کہ اس میں کسی ترمیم کو گناہ سمجھتے ہیں۔ طریقہ تعلیم بھی ان مدارس کا اتنا جان لیوا ہے کہ نئی نسل اس کا کسی طرح تحمل نہیں کر سکتی۔ اس نصاب اور اس طریقہ تعلیم کی اصلاح کے لئے جو کوششیں ہوئیں وہ ایک خاص دائرے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جمود ان کے سامنے روک بن کر کھڑا ہو گیا۔

ان مدارس کے گروہی رجحانات بھی ملی نقطہ نظر سے مضر ثابت ہوئے۔ دینی مدارس بالعموم الگ الگ فقہی مسالک کی بنیادوں پر قائم ہوئے اور انہی پر اب تک قائم چلے جا رہے ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ تھا کہ یہ مدارس کتاب و سنت کی بنیادوں پر قائم ہوتے اور پوری فقہ اسلامی کی خدمت کرتے اور اس کو آگے بڑھاتے تاکہ ان کے فارغین وسیع زاویہ نگاہ کے حامل بن کر اٹھتے اور مخصوص اپنے فرقے کی ترجمانی کرنے کے بجائے پوری ملت اسلامیہ کی خدمت کرتے اور تمام نوع انسانی پر اللہ کے دین کی شہادت دیتے۔ اس طرح ان کے اندر نہ صرف رواداری بلکہ تحقیق و اجتہاد کی وہ روح بھی پیدا ہوتی جس کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔

ان مدارس نے اپنے سامنے مطمح نظر بھی کچھ زیادہ بلند نہیں رکھا۔ عام طور پر مدرسی، امامت، فتویٰ نویسی، وعظ گوئی، مناظرہ اور ایک محدود معنی میں تبلیغ تک ان کی نگاہ محدود رہی۔ ہر چند یہ کام بھی ضروری تھے لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ عام طور پر ہمارے دینی مدارس کے فارغین علمی و عملی زندگی کے دوسرے میدانوں میں نمایاں نہ ہو سکے۔ صرف وہی لوگ اس سے مستثنیٰ رہے جو غیر معمولی دل و دماغ کے مالک تھے اور جن کی رہنمائی ان مدرسوں سے زیادہ خود ان کے عزم و ہمت نے کی۔

یہ جمود ان مدارس پر بہت پہلے سے طاری تھا اور اس کو بڑا دخل ہے اس زوال کو ہم پر مسلط کرنے میں جو مغربی اقوام بالخصوص انگریزوں کے ہاتھوں ہم پر مسلط ہوا۔ لیکن انگریزوں کے

حکمران ہو جانے کے بعد اس جمود پر مسکنت اور کس مپرسی کا بھی اضافہ ہو گیا اس لئے کہ حکومت کے انقلاب کے بعد ان کی مادی سرپرستی کا انحصار بیشتر غربا اور عام مسلمانوں کے صدقات و زکوٰۃ پر رہ گیا اور ان سے فائدہ اٹھانے والے بھی بیشتر اسی طبقہ کے لوگ رہ گئے جن کو انگریزی تعلیم کی آسانیاں حاصل نہ تھیں۔ گویا انگریزوں کے بعد سے ہمارے ہاں دینی تعلیم اگر زندہ رہی ہے تو وہ زیادہ تر عوام اور غربا کے واسطہ سے زندہ رہی ہے۔ حکومت اور امرا کے طبقہ کا حصہ اس میں محض برائے نام ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد اگر ہمارے اندر اپنے ملی نصب العین کا احساس ہوتا تو دینی تعلیم ہی ہمارے سارے نظامِ تعلیم کی بنیاد بنتی اور اسی بنیاد پر ہم تمام علوم جدیدہ کی عمارت قائم کرتے لیکن ہوا یہ کہ یہاں جس نسبت سے جدید تعلیم کو فروغ ہوا اسی نسبت سے دینی تعلیم کو زوال ہوا۔ اول تو یہ علاقہ دینی تعلیم کے لحاظ سے تقسیم سے پہلے بھی کچھ زیادہ زرخیز نہ تھا، ہماری دینی تعلیم کے جو بڑے بڑے ادارے تھے وہ سارے کے سارے ان صوبوں میں تھے جو بھارت کے قبضہ میں چلے گئے، مشہور کتبخانے بھی انہی صوبوں میں تھے۔ یہاں جو مدارس تھے یا قائم ہوئے اول تو وہ کچھ زیادہ باوقار نہ تھے اور اگر کچھ تھے بھی تو یہاں جدید تعلیم و تہذیب کی بہتی ہوئی گنگا کو چھوڑ کر کس کی شامت آئی ہوئی ہے کہ وہ عربی مدارس کی خشک گردانوں میں اپنی اوقات رائگاں کرے چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو دینی ادارے یہاں قائم ہیں ان کے لئے سرمایہ کی فراہمی سے زیادہ مشکل کام طلبہ کی فراہمی کا ہے۔ اگر روٹی، کپڑا، کتاب سب کچھ دے کر کچھ طلبہ کسی طرح حاصل بھی ہوتے ہیں تو ان میں شوقِ علم رکھنے والے شاید پانچ فی صد بھی نہیں ہوتے۔ زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جن کا مقصد محض اوقات گزاری ہوتا ہے۔

ہمارے ملک میں دینی مدارس کا یہ حال ہے اور یہی مدارس ہیں جن سے حاملین دین کے پیدا ہونے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ رہے وہ علما جو پہلے سے موجود تھے یا تقسیم ملک کے بعد یہاں آئے ان میں سے جو صف اول کے تھے ان میں اکثر اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ جو چند باقی ہیں وہ چراغ سحری ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کب ہم ان سے بھی محروم ہو جائیں۔ اس موقع پر میں آپ کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث یاد دلاتا ہوں جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے اندر سے علم دین کے اٹھا لئے جانے کی شکل یہ نہیں ہوگی کہ علم لوگوں کے سینوں سے نکال لیا جائے بلکہ علما اٹھا لئے

جائیں گے اور دین سے بے خبر چلا باقی رہ جائیں گے - وہ با علم خود سے دین کے خود گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو گمراہ کریں گے -

حضرات! اگر آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ بحیثیت امت مسلمہ اس دنیا میں قائم رہنے کے لئے ہم سب سے زیادہ دین اور دینی تعلیم ہی کے حاجتمند ہیں تو میں آپ کو اس صورت حال پر سنجیدگی سے غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں جس سے ہم اس وقت اپنے ملک میں دوچار ہیں - میں نے اختصار کے خیال سے صرف اپنے ہی ملک کا جائزہ لیا ہے - دوسرے مسلمان ملکوں میں صورت حال اس سے بھی زیادہ مایوس کن ہے - واقعہ یہ ہے کہ دوسرے مسلمان ملکوں میں دینی تعلیم پہلے ہی ختم ہو چکی تھی - اب تو اگر اس کی کچھ رمق باقی تھی تو پاک و ہند کے دینی مدارس اور ان کے علما کے ذریعہ سے باقی تھی - جہاں تک بھارت کا تعلق ہے وہاں مسلمانوں کا قومی وجود ہی خطرے میں ہے، دین اور دینی تعلیم کا کیا سوال - رہے آپ تو آپ کے حالات آپ کے سامنے ہیں - آپ اس ملک کے سب سے زیادہ تاریخی شہر کے معزز شہری ہیں - یہ شہر آپ کی تہذیب اور آپ کے علوم کا ایک اہم مرکز رہ چکا ہے، اس کی خاک میں بڑے بڑے علما و صوفیا دفن ہیں - میں نے آپ کے سامنے یہ سوال اس لئے رکھا ہے کہ آپ غور کریں کہ دینی تعلیم کے تحفظ کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے اور آپ اس میں اپنا حصہ کس طرح ادا کر سکتے ہیں -

سب سے زیادہ صحیح اور نتیجہ خیز چیز تو یہ تھی کہ اس ملک کا نظام تعلیم ہی از سر نو اسلام کی بنیاد پر اٹھایا جاتا تاکہ دین سارے نظام تعلیم و تربیت کی روح بن جاتا اور ہم ایک ہی نظام تعلیم سے قدیم و جدید دونوں کی برکتیں حاصل کرتے لیکن یہ محض آرزو ہے اور مجھے یہ آرزو اتنی بعید معلوم ہوتی ہے کہ میں اس کے لئے کوشش اور جدوجہد کرتے رہنے کا مشورہ دینے کے باوجود یہ کہونگا کہ اس آرزوئے خوش کے پیچھے دوسری چھوٹی بڑی تدبیروں سے ہمیں غافل نہیں رہنا چاہیئے - نظام تعلیم کی تبدیلی کا کام نظام کے کارفرماؤں کا ہے - ان حضرات کے متعلق یہی کہنا مشکل ہے کہ یہ دینی تعلیم کی قرار واقعی اہمیت سمجھتے بھی ہیں یا نہیں - اب تک تو ان کی طرف سے جو کچھ سامنے آیا ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دین کا دائرہ عمل ان کے ہاں بھی مسجدوں سے آگے نہیں ہے اور اگر ہے تو اس میں ان کا اعتماد اس ٹائپ کے لوگوں پر ہے جو دین کو مستشرقین کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - البتہ ہم اور آپ اگر اس کام کی اہمیت سمجھیں تو کچھ نہ کچھ اس کے تحفظ کے لئے کر سکتے ہیں - مثلاً

۱۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس اگر علم دین کے بقا کو عزیز رکھتے ہیں تو وہ بلا تاخیر اپنے نصاب تعلیم کو بدل کر اس کو آسان، مختصر اور زمانہ حال کی ضروریات کے مطابق بنائیں۔ عربی نحو و صرف اور عربی زبان کی تعلیم جدید طریقے پر دی جائے، قرآن، حدیث، فقہ کے سوا دوسری غیر ضروری چیزیں نصاب سے نکال کر انگریزی زبان اور دوسرے بعض عمرانی علوم کی کتابیں داخل کی جائیں تاکہ ان مدارس سے ایسے علما پیدا ہوں جو دین کے ساتھ زمانہ حال کے تقاضوں کو بھی سمجھ سکیں۔

۲۔ عربی مدارس اپنے ہاں ایک مختصر مگر جامع نصاب کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لئے بھی رکھیں جو عربی زبان اور علم دین کے حصول کا شوق رکھتے ہیں اور ان کے اوقات فرصت میں ان کو استفادہ کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ اس طرح جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے اندر سے ایک اچھی تعداد ایسے نوجوانوں کی نکل آئے گی جو دین کی خدمت کر سکیں گے۔

۳۔ ملک کے جید علما اپنے اپنے ہاں حلقہائے درس قائم کریں جن میں اس امر کا اہتمام کریں کہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے جن کے اندر دین کا شوق ہے وہ ان کے درس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ درس محض تبرک کی نوعیت کے نہ ہوں بلکہ تعلیمی نوعیت کے ہوں تاکہ تعلیم دین کے نقطۂ نظر سے مفید ہو سکیں۔ میں ذاتی تجربہ کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ اگر روزانہ صرف دو گھنٹے بھی اس کام پر صرف کئے جائیں تو تین سال کے عرصے میں یونیورسٹیوں کے فارغین کی ایک جماعت کو عربی زبان اور پورے دین کی تعلیم دی جا سکتی ہے جو ہر میدان میں دین کی خدمت کر سکتے ہیں اور یہ اللہ کا فضل ہے کہ ابھی ہماری قوم میں علم دین کے ایسے قدر داں موجود ہیں۔

۴۔ بڑے بڑے شہروں میں اسلامی ہاسٹل قائم کئے جائیں جن میں کالجوں کے طلبہ کے لئے قیام اور اسلامی تعلیم و تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔

حضرات! یہ سارے کام اسی صورت میں ممکن ہیں جب ملک کے ہوشمند اور دردمند لوگ اس کام کی اہمیت سمجھیں، دوسروں کو اسکی اہمیت سمجھائیں اور جہاں بھی کام کرنیکا امکان ہو اس کی راہیں ہموار کریں اور جہاں کام ہو رہا ہو اس میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ کام صرف علما ہی کا نہیں ہے بلکہ اس کی ذمہ داری ہر اس شخص پر عاید ہوتی ہے جس کو اس ملک میں اسلام کا مستقبل عزیز ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم اس ملک میں خیر امت اور شہداء اللہ فی الارض کی حیثیت سے سربلند ہوں اور ہماری سربلندی اللہ کے دین کی سربلندی ہو۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

(۲۱)

تفسیر سورۂ بقرہ

۸۵ - الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۬ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓـئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۵۷

ولی، کے معنی مددگار، کارساز، ساتھی اور حمایتی کے ہیں۔

نور سے مراد یہاں عقلی، ایمانی، عملی اور اخلاقی روشنی ہے۔ اسی طرح ظلمات سے یہاں مراد عقلی و اخلاقی ظلمات ہیں۔ چونکہ حق کی روشنی کا منبع ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نیز حق میں انتشار نہیں بلکہ وحدت پائی جاتی ہے اس وجہ سے یہ لفظ واحد استعمال ہوا۔ برعکس اس کے ظلمات، جمع استعمال ہوا اس لئے کہ اس کے ظہور میں آنے کے راستے بھی مختلف ہیں اور اس کے مزاج میں انتشار و اختلاف بھی ہے۔

لفظ "طاغوت" کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں اصل اہمیت رکھنے والی شئے یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کا دامن پکڑتا ہے یا کسی غیر کا۔ اگر خدا کا دامن پکڑتا ہے تو خدا اپنے اس بندے کا کارساز و مددگار بن جاتا ہے اور اپنی توفیق بخشی سے درجہ بدرجہ اسے نفس و شہوات کی تمام تاریکیوں اور کفر، شرک اور نفاق کی تمام ظلمات سے نکال کر ایمان کامل و توحید خالص کی شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اور اگر بندہ اپنے

رب سے منہ موڑ کر کسی اور راہ پر جا نکلتا ہے تو پھر وہ شیطان اور اس کی ذریات کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور وہ اس کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر عقل و فطرت کی ہر روشنی سے دور کر کے ضلالت کے کھڈ میں گرا دیتے ہیں۔ مشہور مثل ہے "خانہ خالی را دیو میگیرد" جس گھر میں آدمی نہیں رہتا وہ شیطان کا مسکن بن جاتا ہے۔ اسی طرح جو دل ایمان سے خالی ہوتا ہے وہ شیطانوں کا اڈا بن جاتا ہے۔ اور پھر شیاطین ایسے شخص کو گمراہی کی وادیوں میں سرگشتہ و حیران رکھتے ہیں۔ سورۂ انعام میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ قُلْ اَنَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلٰٓى اَعْقَابِنَا بَعْدَ اِذْ هَدٰىنَا اللّٰهُ كَالَّذِى اسْتَهْوَتْهُ الشَّيٰطِيْنُ فِى الْاَرْضِ حَيْرَانَ ۞ ————

"کہہ دو کیا ہم اللہ کے سوا ان کو پکاریں جو نہ ہمیں نفع پہنچاتے نہ نقصان اور اللہ کی ہدایت بخشی کے بعد پھر پیٹھ پیچھے پلٹا دیئے جائیں، اس شخص کے مانند جس کو شیاطین نے بہکا کر کسی صحرا میں سرگشتہ و حیران چھوڑ دیا ہو۔"

اعراف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِىٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۞ ————

"اور ان کو اس کا ماجرا سناؤ جس کو ہم نے اپنی آیتوں سے نوازا تو وہ ان سے نکل بھاگا تو شیطان اس کے پیچھے لگ گیا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہوں میں سے بن گیا۔"

یہی بات سورۂ زخرف میں بھی ارشاد ہوئی ہے۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۳۶ ————

"جو لوگ اللہ کے ذکر سے بے پروا ہو جاتے ہیں، ہم ان پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں، اور وہ ان کا ساتھی بن جاتا ہے۔"

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ۭ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۞ ۲۵۸

"الم تر" کے خطاب کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

"الذی" سے اگرچہ یہاں واضح نہیں ہے کہ کون مراد ہے لیکن ہمارے مفسرین نے اس سے عام

طرح تمود کو مولیا ہے۔ یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔ یہ حضرت ابراہیمؑ کا ہم عصر بادشاہ تھا اور تالمود میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ اس کا وہ مناظرہ بھی مذکور ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔

"فی ربہ" رب کے بارے میں بحث کی وجہ یہ ہوئی ہوگی کہ اس زمانے میں عام طور پر جو بادشاہ ہوتے تھے وہ اپنے آپ کو اوتار یا دشاہ (God Kings .) کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے یعنی ان کی قوم کے لوگ جن دیوتاؤں کو پوجتے تھے بادشاہ ان میں سے سب سے بڑے دیوتا کا مظہر سمجھا جاتا تھا اس طرح بادشاہ کو بیک وقت سیاسی اور مذہبی دونوں قسم کا اقتدار حاصل ہوجاتا تھا۔ ہندوستان، چین اور مصر وغیرہ کے قدیم بادشاہوں میں سے اکثر کی حیثیت یہی تھی۔ نمرود کی قوم جن دیوتاؤں کو پوجتی تھی اقدیم صحیفوں اور قرآن دونوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سورج کو سب سے بڑے دیوتا کا درجہ حاصل تھا اس وجہ سے لازماً نمرود سورج دیوتا کا اوتار مانا جاتا رہا ہوگا۔ اس زعم کے ساتھ ظاہر ہے کہ اپنی خدائی میں کسی اور خدا کی خدائی کی دعوت اس کے لئے ایک بالکل ناقابل برداشت چیز تھی چنانچہ جب حضرت ابراہیمؑ نے اس بات کا اعلان کیا ہوگا کہ رب حقیقی صرف اللہ واحد ہی ہے اس کے سوا کوئی رب نہیں تو اس دعوت کی زد اس نے اپنی خدائی پر بھی پڑتی محسوس کی ہوگی اور حضرت ابراہیمؑ کو بلا کر ان سے باز پرس کی ہوگی کہ یہ کون رب ہے جس کی تم دعوت دے رہے ہو رب تو میں ہوں کہ سورج دیوتا کا مظہر اور اس کا اوتار ہوں۔

"ان آتاہ الملک" میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق "ان" سے پہلے حرف جر محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس خدائی کے گھمنڈ میں وہ اس وجہ سے کہ یہ نعمت پاکر وہ خدا کا شکر گزار اور فرمانبردار بندہ بنتا لیکن تنگ ظرفوں اور کم عقلوں کے لئے نعمت اکثر گمراہی کا باعث ہوئی ہے اور انہوں نے اس کو شکر کی جگہ کفر کا سبب بنایا ہے۔ جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہوجاتا ہے جب وہ اس اقتدار کو اللہ کے فضل وکرم کے بجائے اپنے استحقاق، اپنے علم یا تدبیر کا ثمرہ سمجھ بیٹھتے ہیں تو وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ خدا یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کر رہا ہے بلکہ وہ استکبار میں مبتلا ہو کر خود اپنی خدائی کا تخت بچھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے تدبیر یہ اختیار کرتے ہیں کہ خدا کے اوتار یا مظہر یا ظل اللہ کے روپ میں اپنے کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ دولت ونعمت اور اقتدار کا گھمنڈ ہمیشہ ضلالت کے اسباب میں سے سب سے بڑا سبب رہا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلے ہیں جو اپنے آپ

- یعنی جب کہ اللہ نے اس کو حکومت اور اقتدار بخشا تو چاہیے تھا کہ اللہ کی بخشی ہوئی

کو اس فتنہ سے بچا سکے ہیں۔

نمرود کے سوال کے جواب میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اللہ کی تعریف میں سب سے پہلے وہی بات کہی جو سب سے زیادہ واضح تھی یعنی میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے۔ جو شخص بھی زندگی اور موت کے سوال پر غور کرتا ہے یہ سوال اس کو خدا کے ماننے پر مجبور کر دیتا ہے بشرطیکہ اس کے دماغ میں کوئی خلل نہ ہو لیکن نمرود کے ذہن میں اقتدار کا خناس سمایا ہوا تھا اس وجہ سے اُس نے اس واضح حقیقت پر بھی یہ معارضہ کر دیا کہ موت اور زندگی پر اختیار تو میں بھی رکھتا ہوں جس کا چاہوں سر قلم کر دوں، جس کو چاہوں بخش دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک بالکل ہی احمقانہ معارضہ تھا اس لئے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک بالکل ہی دوسری بات فرمائی تھی اور یہ ایک بالکل ہی دوسری بات تھی حضرت ابراہیمؑ چاہتے تو دونوں باتوں کے درمیان جو فرق ہے اس کو واضح کر دیتے لیکن انہوں نے محسوس فرما لیا کہ ان کی واضح بات پر اس قسم کا احمقانہ معارضہ وہی کر سکتا ہے جو کٹھ حجتی پر اُتر آیا ہو اس وجہ سے انہوں نے اس کو مزید حجت کے لئے موقع دینا پسند نہیں فرمایا۔ انبیاء علیہم السلام مناظر نہیں بلکہ داعی ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے انہوں نے خاص اس پہلو پر اُلجھنے کے بجائے اپنے رب کی ایک دوسری صفت بیان کر دی جس میں نمرود کے لئے کسی بحث کی راہ بالکل مسدود تھی۔

انہوں نے فرمایا کہ اچھا، اگر یہ بات ہے تو میرا رب روز سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تم ایک دن ذرا اس کو مغرب سے نکال دو۔ حجت ابراہیمی کا یہ وار ایسا بھرپور تھا کہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ یہاں بلاغت کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خاص طور پر سورج کی تسخیر کا ذکر فرمایا جس کو نمرود کی نظر میں معبودِ اعظم کی حیثیت حاصل تھی اور وہ اپنے آپ کو اسی معبودِ اعظم کا مظہر بنائے ہوئے بیٹھا تھا۔ بہترین استدلال اور لطیف ترین طنز کی یہ ایک نہایت خوبصورت مثال ہے۔

آخر میں فرمایا کہ "اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں بخشا کرتا"، یہ ہدایت و ضلالت کے معاملے میں بطور خلاصہ بحث وہ اصول بیان ہوا ہے جس کو واضح کرنے ہی کے لئے اوپر والا واقعہ مذکور ہوا ہے۔ اس میں ظالم کا لفظ خاص طور پر قابل غور ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں ظالم سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بیجا استعمال کرتے ہیں، جو اللہ کے انعامات کو اس کا فضل قرار دینے کے بجائے ان کو اپنا حق سمجھتے ہیں، جو نعمتوں پر خدائے منعم کے شکر گزار

ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہوتے اور ابلیس کی طرح اکڑتے ہیں جو خدا کی بندگی اور فرمانبرداری کی روش اختیار کرنے کے بجائے خود اپنی خدائی کے تخت بچھاتے اور اپنے کو رب ٹھہراتے ہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ اس ظلم میں مبتلا ہوتے ہیں ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلا کرتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنے ہی واضح طریقہ پر آئے وہ اس کو قبول کرنے کے بجائے بحث اور کٹ حجتی کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ ہی لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر انہیں اس کی کوئی راہ ملتی نظر نہیں آتی تو وہ نمرود کی طرح ہکے بکے اور ششدر ہو کر تو رہ جاتے ہیں لیکن حق کو قبول پھر بھی نہیں کرتے۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَىٰ قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا قَالَ أَنَّىٰ يُحْيِي هَٰذِهِ اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِهَا فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهُ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ، قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ إِلَىٰ طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ، وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِلنَّاسِ وَانْظُرْ إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهَا لَحْمًا، فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝٢٥٩ -

حرف "او" اصلاً تقسیم کے لئے آیا کرتا ہے۔ پہلے ان لوگوں کی مثال پیش کی جن کا ذکر اوپر "الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ" کے الفاظ سے فرمایا تھا، اب یہ ان لوگوں کی مثال بیان ہو رہی ہے جن کا ذکر "اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ" سے فرمایا ہے۔ اس تقسیم کی مثال اسی سورہ کی آیات ۱۷–۲۰ میں گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے ہمارے نزدیک صاحب کشاف کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ یہاں جس شخص کا حوالہ دیا گیا ہے وہ کافر تھا بلکہ یہ ایک ایسے بندہ مومن کا ذکر معلوم ہوتا جو ایمان سے تو بہرہ ور تھا لیکن وہ اپنے اس ایمان میں اس اطمینان قلب اور یقین کا طالب تھا جس کو حق الیقین کہتے ہیں۔ اس کا یہ سوال کہ "اس بستی کو خدا اس طرح فنا ہو جانے کے بعد کس طرح زندہ کریگا" انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ اظہار حیرت کی نوعیت کا ہے۔ انسان بسا اوقات ایک چیز کو مانتا ہے اس لئے کہ عقل و فطرت اس کی گواہی دے رہی ہوتی ہے لیکن وہ بات بجائے خود ایسی حیران کن ہوتی ہے کہ اس سے متعلق دل میں بار بار یہ سوال ابھرتا رہتا ہے کہ یہ کیسے واقع ہو گی؟ یہ سوال انکار کے جذبہ سے نہیں بلکہ جستجوئے حقیقت کے جوش سے ابھرتا ہے اور خاص طور پر ان مواقع پر زیادہ زور سے

اُبھرتا ہے جب سامنے کوئی ایسا منظر آجائے جو باطن کو جھنجوڑ دینے والا ہو۔ یہ حالت ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس ایمان کے مقتضیات میں سے ہے جس کی بنیاد عقل و بصیرت پر ہو۔ یہ سلوک باطن کی ایک ریاضت ہے جس سے ہر طالب حقیقت کو گزرنا پڑتا ہے اور یہ سفر برابر اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ کے انوار سے قلب و نظر جگمگا نہ جائیں۔ اس سفر میں ہر منزل اگرچہ خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کی نوعیت کی ہوتی ہے لیکن عارف کی نظر میں اس کا ہر آج اس کے گذشتہ کل سے اتنا زیادہ روشن ہوتا ہے کہ وہ کل اس کو آج کے مقابل میں شب نظر آتا ہے۔

"اَلَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَۃٍ" سے یہاں کس کی طرف اشارہ ہے؟ اس سوال کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ ارباب تفسیر میں سے کسی نے خضرؑ کا نام لیا ہے، کسی نے عزیرؑ کا لیکن قدیم صحیفوں میں ان دونوں بزرگوں سے متعلق کوئی اس قسم کا واقعہ منقول نہیں ہے جس کی طرف قرآن نے یہاں اشارہ کیا ہے۔ البتہ صحیفہ حزقی ایل میں اس سے ملتی جلتی ہوئی ایک چیز ملتی ہے جس کی نوعیت ایک مکاشفہ کی ہے ملاحظہ ہو۔

"خداوند کا ہاتھ مجھ پر تھا اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پُر تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے پاس چوگرد پھرایا اور دیکھ وہ وادی کے میدان میں بکثرت اور نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد، کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں؟ میں نے جواب دیا اے خداوند خدا تو ہی جانتا ہے، پھر اس نے مجھے فرمایا تو ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ اے سوکھی ہڈیو خداوند کا کلام سنو۔ خداوند خدا ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی اور تم پر نسیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی اور جانو گی کہ میں خداوند ہوں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور جب میں نبوت کر رہا تھا تو ایک شور ہوا اور ایک زلزلہ آیا اور ہڈیاں آپس میں مل گئیں ہر ایک ہڈی اپنی ہڈی سے اور میں نے نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہوں کہ نسیں اور گوشت ان پر چڑھ آئے اور ان پر چمڑے کی پوشش ہو گئی پر ان میں دم نہ تھا، تب اس نے مجھے فرمایا کہ تو نبوت کر، تو ہوا سے نبوت کر اے آدم زاد اور ہوا سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے دم تو

چاروں طرف سے [illegible] ان مقتولوں پر پھونک کہ زندہ ہو جائیں۔ پس میں نے حکم کے مطابق نبوت کی اور ان میں دم آیا [illegible] اپنے پاؤں پر کھڑی ہوئیں۔ ایک نہایت بڑا لشکر۔

(حزقی ایل باب ۳۷ ۱ - ۱۱)

اگرچہ قرآن اور تورات کے بیان میں کچھ فرق ہے لیکن یہ فرق تضاد کی نوعیت کا نہیں بلکہ اجمال و تفصیل کی نوعیت کا ہے۔ اس طرح کا فرق بسا اوقات ایک ہی مقصد کی دو روایات میں پایا جاتا ہے جس کو تناقض پر نہیں بلکہ اجمال و تفصیل پر محمول کیا جاتا ہے۔ قرآن میں بعض باتیں زیادہ ہیں جو تورات میں نہیں ہیں۔ ایسے مواقع میں قرآن کے بیان کو ترجیح حاصل ہوگی اس لئے کہ وہ براہ راست خدا کا کلام اور بالکل محفوظ ہے۔ مثلاً تورات میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ خود حزقی ایل پر بھی سو سال کے لئے موت طاری کر دی گئی۔ اسی طرح ان کے کھانے کے نہ بگڑنے اور گدھے کے دوبارہ زندہ ہونے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے لیکن ان کے ذکر نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مشاہدات حزقی ایل کو نہیں ہوئے۔ جو مشاہدات ان کو کرائے گئے ان میں یہ بھی ہیں لیکن تورات میں یا تو ان کا ذکر نہیں ہوا یا ذکر تو ہوا لیکن اہل تورات نے ان کو ضائع کر دیا۔

اگر قرآن کے اس حوالہ کا تعلق حزقی ایل نبی کے اسی مشاہدہ ملکوت سے مان لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ یہ آیات الٰہی کے مشاہدہ کے لئے اسی طرح کی ایک سیر ملکوت تھی جس طرح کی سیر ملکوت کی اس سے اعلیٰ مثال ہمارے یہاں واقعہ معراج ہے۔ یہ معاملات چونکہ ایک ایسے عالم میں پیش آتے ہیں جو ہمارے عالم کون و فساد کے ضابطوں اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہے اس وجہ سے ایک کے احکام کو دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس عالم میں صدیوں اور قرنوں کے معاملات لمحوں میں انجام پاتے ہیں۔

"وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا" یہ ڈھی ہوئی بستی کی تصویر ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ کہنہ عمارتیں جب گرتی ہیں تو ان کے انہدام کا آغاز ان کے کنگروں، میناروں اور ان کی چھتوں سے ہوتا ہے۔ پہلے بلندیاں پست ہوتی ہیں، اس کے بعد دیواروں کی باری آتی ہے۔

"اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا" یہ سوال جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا انکار کی نوعیت کا نہیں ہے

قرآن اور تورات کے بیانات میں فرق کی نوعیت

آیات الٰہی کے مشاہدہ کے لئے ایک سیر ملکوت

[illegible]

حیرت واستعظام کی نوعیت کا ہے۔ اس سے مقصود حق الیقین کی طلب تھی اس وجہ سے یہ ایمان کے منافی نہیں بلکہ اس کے مدارج ومقامات میں سے ہے۔ یقین کے مختلف مدارج ہیں اس وجہ سے اس کی طلب ہر درجے کے اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حضرات انبیاء بھی جو ایمان ویقین کے بلند ترین مدارج پر فائز ہوتے ہیں، اس سے مستغنی نہیں ہوتے بلکہ اس میں اضافہ کے لئے وہ بھی برابر دعائیں کرتے رہتے ہیں۔ اس طرح کے سوالات کے ابھرنے کا محل ایک طالب حقیقت کا اپنا ہی باطن ہوتا ہے۔ وہ یہ سوال دوسروں سے نہیں بلکہ خود اپنے ہی سے کرتا ہے اور اس کا جواب دوسروں سے نہیں بلکہ اس رہنمائے غیب سے چاہتا ہے جس کی تجلیات اس کے اپنے باطن کے افق اعلیٰ پر نمایاں ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اسی نوعیت کی ایک خلش حزقی ایل بھی اپنے اندر محسوس فرماتے تھے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی آیات کا مشاہدہ کرا کے ان کی یہ الجھن دور فرما دی اور اس طرح ان کو نہ صرف حیات بعد الموت کے معاملے میں اطمینان قلب کی ٹھنڈک حاصل ہو گئی بلکہ جیسا کہ آگے واضح ہوگا، احیائے بنی اسرائیل کی اس مہم کے لئے بھی ان کا دل پوری طرح مضبوط ہو گیا جس پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے تھے۔ یہ سنت الٰہی ہے کہ وہ ہدایت کے طالبوں پر اپنی راہیں کھولتا اور ان کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے لئے ان کی تربیت فرماتا اور ان کو روشنی عطا کرتا ہے۔

"كَمْ لَبِثْتَ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ" یہ سوال وجواب اس حقیقت کے اظہار کے لئے ہے کہ آدمی کا جو زمانہ عالم برزخ میں گزرے گا اس پر اس کا کوئی احساس باقی نہیں رہے گا' ایسا معلوم ہوگا کہ ابھی سوئے تھے ابھی جاگ اٹھے ہیں۔ آج معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کی زندگی، پھر موت پھر بعث پھر قیامت ایک بہت دور کی بات ہے، اس کے لئے ابھی سے اپنا عیش مکدر کرنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن جب قیامت کو اٹھیں گے تو معلوم ہوگا جو کچھ گزرا ہے وہ بہت دور کی بات نہیں بلکہ بالکل صبح وشام کا قصہ ہے۔

"وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" یہاں "انظر الی حمارک" کے بعد کیف نحییہ کے الفاظ محذوف ہیں۔ یعنی دیکھو کہ کس طرح ہم اس گدھے کو زندہ کئے دیتے ہیں۔ اس حذف کی وجہ یہ ہوئی کہ آگے زندہ کرنے سے زیادہ عجیب ماجرے، اس کی سڑی گلی ہڈیوں کے جوڑنے اور ان پر گوشت اور کھال چڑھانے کی تفصیل آ رہی ہے۔ اس مذکور کے اندر یہ محذوف آپ سے آپ موجود ہے۔

"وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ" میں حرف عطف کا وجود دراں حالیکہ یہاں کوئی لفظ ایسا موجود نہیں ہے جو اس کا معطوف علیہ بن سکے، اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ یہاں معطوف علیہ محذوف ہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ہیں۔ آگے جگہ جگہ اس کی وضاحت ہوگی۔ اس حذف کا فائدہ یہ ہے کہ الفاظ بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور بات اس کے اندر بہت زیادہ سما سکتی ہے۔ اس لئے کہ ایسے مواقع میں وہ ساری بات حذف کی جا سکتی ہے جس پر سیاق و سباق دلیل بن سکے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ لتؤمن بالبعث اور اس معنی کے الفاظ حذف ہیں۔ گویا پوری بات یوں ہوگی کہ "اور تم اپنے گدھے کو دیکھو کہ کس طرح ہم اس کو زندہ کئے دیتے ہیں تاکہ حیات بعد الممات پر تمہارا ایمان پکا ہو جائے اور تاکہ تمہیں ہم لوگوں کے لئے ایک نشانی بنائیں۔ یہ نشانی بنانا چونکہ اس کا ایک بعید فائدہ تھا جس کی طرف آسانی سے ذہن منتقل نہیں ہو سکتا تھا اس وجہ سے اس کو ظاہر کر دیا اور ایمان بالبعث اس کا بالکل واضح اور قریبی فائدہ تھا اس وجہ سے اس کو حذف کر دیا اور حرف ربط کے ذریعہ سے اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ عربی زبان میں اس کو ایجاز کہتے ہیں اور ایجاز بلاغت کلام کا ایک نہایت اہم شعبہ ہے۔

"اور تاکہ ہم تم کو لوگوں کے لئے نشانی بنائیں" یعنی ہم نے تم کو آیات الٰہی کا یہ مشاہدہ اس لئے بھی کرایا ہے کہ تم بنی اسرائیل کے سے اس بات کی نشانی بن سکو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ وہ ان کو از سر نو غلامی و محکومی کی ذلت سے چھڑا کر آزادی اور قوت و عزت کی زندگی بخش دے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ حزقی ایل نبی منکروں کی طرف نہیں بلکہ بنی اسرائیل کی طرف بھیجے گئے تھے اور ان کا خاص مقصد بنی اسرائیل کو از سر نو زندہ کرنا تھا۔ لیکن تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بنی اسرائیل اپنے مستقبل کی طرف سے بہت مایوس تھے۔ چنانچہ اوپر ہم نے صحیفہ حزقی ایل کی جو عبارت نقل کی ہے اس کا خاتمہ ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

تب اس نے مجھے فرمایا اے آدم زاد یہ ہڈیاں تمام بنی اسرائیل ہیں، دیکھ یہ کہتے ہیں ہماری ہڈیاں سوکھ گئیں اور ہماری امید جاتی رہی ہم تو بالکل فنا ہو گئے اس لئے تو نبوت کر اور ان سے کہہ خداوند خدا یوں فرماتا ہے کہ اے میرے لوگو دیکھو میں تمہاری قبروں کو کھولوں گا اور تم کو ان سے باہر نکالوں گا تب تم جانو گے کہ خداوند میں ہوں اور میں اپنی

روح تم میں ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے اور میں تم کو تمہارے ملک میں بساؤں گا تب تم جانو گے کہ میں خداوند نے فرمایا"

حزقی ایل باب ۳۷ ۱۱-۱۴

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حزقی ایل نبی کو ان آیات کا مشاہدہ کرانے سے مقصود ایک تو یہ تھا کہ موت کے بعد زندگی کے مسئلہ میں خود ان کو شرح صدر حاصل ہو جائے، دوسرا یہ کہ ان کا یہ مشاہدہ بنی اسرائیل کے لئے پیغام حیات کا کام دے اور ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ انہیں بھی دوبارہ ایک زندہ قوم بنانے پر قادر ہے۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ یہاں کھانے پینے کی چیزوں سے متعلق تو فرمایا کہ لَمْ يَتَسَنَّهْ ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا، برعکس اس کے گدھے کی ہر چیز سڑ گل گئی۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایک ہی طرح کے حالات میں یہ دو مختلف اثرات کیوں نمایاں ہوئے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ طالب کی جو اصلی ذہنی خلش تھی وہ یہی تھی کہ ایک چیز مرکھپ جانے اور مٹی میں مل جانے کے بعد از سر نو زندگی کس طرح حاصل کرلے گی؟ اس مشاہدے نے اس کی یہ خلش دور کردی۔ ساتھ ہی کھانے پینے کی چیزوں کا کوئی تغیر نہ قبول کرنا اس کے لئے اس بات کا ثبوت بن گیا کہ اصل شئی اللہ کا حکم ہے، اگر اللہ چاہے تو ایک شئے کو اس کے سڑ گل جانے کے بعد بھی از سر نو زندگی بخش سکتا ہے اور اگر چاہے تو کسی شئے کو تمام قوانین طبعی کے عمل سے بالاتر بھی رکھ سکتا ہے۔ قرآن میں اصحاب الکہف کا جو واقعہ مذکور ہے وہ اس کی مثال ہے۔

آخر میں فرمایا کہ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یعنی اس مشاہدے کے بعد جب ان پر حیات بعد الممات کا راز بے نقاب ہو گیا تو وہ پکار اٹھے کہ اب میں مانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہاں "أَعْلَمُ" کا لفظ اپنے کامل معنی میں ہے۔ یعنی وہ جاننا جس کو قرآن نے علم الیقین سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہ علم الیقین ان کو قیامت سے متعلق بھی حاصل ہو گیا اور بنی اسرائیل کے مستقبل کے باب میں بھی۔ گویا اس پردے میں انہوں نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں میں زندگی پیدا ہوتے اور ان پر گوشت پوست چڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنے مشن کی کامیابی پر انہیں پورا اعتماد ہو گیا۔ اس پہلو سے وہ اپنی قوم کے لئے ایک نشانی ٹھہرائے گئے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن قَالَ بَلَىٰ ٥ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ٥ ۲۶۰

"اطمینان" کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ٹھیک اس طرح ٹِک جانا کہ اس کے اِدھر یا اُدھر جھکنے یا لڑھکنے کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ برتن اگر اپنی جگہ پر ٹھیک جم کر بیٹھ گیا ہے تو کہیں گے اطمان۔ اگر چراغ کی لو بالکل سیدھی ہے، اس میں ہوا کے سبب سے کسی طرف کو جھکاؤ نہیں ہے تو اس کے لئے بھی یہی لفظ لائیں گے۔ یہیں سے یہ لفظ نفس یا دل کی حالت کی تعبیر کے لئے استعمال ہونے لگا۔ جو نفس اپنے عقائد و اعمال میں بالکل پا برجا رہے، حالات کے تغیر و تلون سے اس کے اطمینان اور اس کی دلجمعی میں کوئی فرق واقع نہ ہو اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں۔ یہ اطمینان ایمان کے اعلیٰ مدارج میں سے ہے۔ قرآن مجید میں اس کو شرح صدر کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے أَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ (کیا ہم نے تمہارے سینے کو کھول نہیں دیا؟) سلوک باطن کے مدارج و مقامات درجہ بدرجہ طے ہوتے ہیں اس وجہ سے سیر باطن کے ایک دور میں حضرات انبیاء بھی اس مقام کے طالب ہوتے ہیں حالانکہ جہاں تک ایمان کا تعلق ہے وہ اس سے روز اول سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہ طلب ایمان کے منافی نہیں ہے بلکہ یہ اس کی تکمیل ہے۔

"صَوْرٌ" کے معنی میلان اور جھکاؤ کے ہیں۔ صُرْتُ الشَّیْءَ یا أَصَرْتُ الشَّیْءَ کے معنی ہوں گے میں نے اس کو اپنی طرف مائل کر لیا، جھکا لیا، اپنے سے اس کو ہلا لیا۔ اسی سے "فَصُرْهُنَّ" ہے۔ یعنی ان پرندوں کو اپنے سے ہلا لو۔

جس طرح اُوپر والے واقعے میں ایک بندہ مومن نے اپنی ایک باطنی خلش کا اللہ تعالیٰ کے سامنے اظہار کیا تو اس نے اس کے لئے اپنی ملکوت کا ایک گوشہ بے نقاب کر کے اس کی خلش دُور فرما دی اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے سلوک باطن کے ایک دور میں (یہ دَور ان کی زندگی کا ابتدائی دَور ہی ہو سکتا ہے) اس بات کی خواہش کی۔ اسی طرح کی ایک خواہش ہے جس طرح کی خواہش حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اندر اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے لئے پیدا ہوئی۔ اس خواہش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیامت کا اعتقاد نہیں تھا، اعتقاد تو تھا لیکن ایک حقیقت عقل کے نزدیک کتنی ہی ثابت شدہ

مثال کیوں نہ ہو، جب تک وہ نادیدہ ہوتی ہے اس وقت تک اسکو ماننے کے باوجود انسان اس کے باب میں شرح صدر کا آرزومند رہتا ہی ہے۔ یہ آرزو انبیاء کی شان کے خلاف نہیں ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی قرآن میں یہ دعا سکھائی گئی کہ وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا (دُعا کرتے رہو کہ اے رب میرے علم کو بڑھا) یہ تشنگی تو اسی وقت دُور ہو سکے گی جب اسباب کے تمام پردے بیچ سے ہٹا دیئے جائیں گے اور اصل حقیقت بالکل بےنقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔ لیکن یہ چیز اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں حاصل ہوگی البتہ جہاں تک اطمینان قلب اور شرح صدر کا تعلق ہے اس سے وہ اپنے ان بندوں کو محروم نہیں رکھتا جو صدق دل سے اس کے طالب ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس مقصد کے لئے اگر اس کی حکمت کا تقاضا ہوتا ہے تو وہ اپنے خاص بندوں کو اپنی قدرت کے بعض مخصوص گوشوں کا بھی مشاہدہ کرا دیتا ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے فضل خاص کی دلیل ہے۔ وہ اپنے اُوپر ایمان رکھنے والوں کا مددگار اور ولی ہے، وہ ان کو کبھی حیرانی و تشنگی میں نہیں چھوڑتا بلکہ ان کو ہمیشہ تاریکی سے روشنی اور اضطراب سے اطمینان کی طرف بڑھاتا رہتا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اضطراب کو دُور کرنے کے لئے ان کو یہ ہدایت ہوئی کہ چار پرندے لے کر ان کو پہلے اپنے سے ہلالو، پھر ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے گوشت کا ایک ایک حصہ اپنے گرد و پیش کی پہاڑیوں پر رکھ دو۔ پھر ان کو اپنی طرف بلاؤ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔

چار پرندوں کی ہدایت اس لئے ہوئی ہوگی کہ چاروں سمتوں سے ان کے مجتمع ہونے کا ان کو مشاہدہ کرایا جائے تاکہ اس بات پر ان کا یقین مستحکم ہو جائے کہ قیامت کے دن اسی طرح نفخ صور پر تمام مخلوق ہر سمت سے اپنے پروردگار کی طرف دوڑے گی۔

اپنے سے ہلا لینے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی ہوگی کہ ان کو وہ اچھی طرح پہچان رکھیں تاکہ ان کو اس امر میں کوئی اشتباہ نہ پیش آئے کہ جو پرندے زندہ ہو کر آئے ہیں وہی ہیں جن کو انہوں نے ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا، دوسرے نہیں ہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو جائے کہ دوبارہ جو زندگی ہوگی اس میں دنیوی زندگی کی ساری یادداشتیں بھی زندہ ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ مانوس پرندے اپنے مالکوں کی آواز بھی پہچانتے ہوں گے۔

اگرچہ یہاں پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے معنی کے لئے کوئی خاص لفظ استعمال نہیں ہوا

لیکن ان سے یہ معنی لینے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اول تو یہاں "جزءًا" کا جو لفظ آیا ہے وہ واضح قرینہ اسی بات کا ہے کہ ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہی پہاڑوں پر ڈالنے کی ہدایت ہوئی تھی۔ اگر ایک ایک پرندے کو زندہ الگ الگ پہاڑ پر رکھوا دینا مقصود ہوتا تو اس مفہوم کے لئے زبان کا یہ اسلوب صحیح نہیں ہے۔ عربی میں اس معنی کو ادا کرنے کے لئے اسلوب اس سے بالکل مختلف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کو تردد مُردوں کے زندہ ہونے کے باب میں تھا، یہ تردد اس طرح تو دور نہیں ہو سکتا تھا کہ چند مانوس چڑیاں ان کی آواز پر ان کے پاس آجائیں۔ اس قسم کا تجربہ تو تیتر، بٹیر، کبوتر اور شکرے پالنے والے ہر روز کرتے ہی رہتے ہیں۔ اگر یہی تجربہ حضرت ابراہیمؑ کو کرا دیا جاتا تو اس سے ان کی وہ اُلجھن کس طرح دُور ہو سکتی تھی جو انہوں نے اپنے رب کے سامنے پیش کی تھی۔ یہ تو دور ہو سکتی تھی تو اسی شکل میں دور ہو سکتی تھی جب ایک شئے کے اجزاء فنا اور انتشار کے بعد از سر نو مختلف گوشوں سے جمع ہو کر حیات تازہ حاصل کریں۔

البتہ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ ان معجزات میں سے نہیں ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے اپنی قوم پر حجت قائم کرنے کے لئے ظاہر ہوئے۔ بلکہ یہ ان مشاہدات میں سے ہے جو ذاتی طور پر حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس لئے کرائے گئے کہ ان کو اطمینان قلب اور شرح صدر کی دولت حاصل ہو۔ اس قسم کے مشاہدات حضرات انبیاء علیہم السلام کو اس لئے کرائے جاتے ہیں کہ ان کی تربیت ہو اور وہ اس بارِ عظیم کے اُٹھانے کے لئے پوری طرح اہل ہو جائیں جو قدرت کی طرف سے ان پر ڈالا جاتا ہے۔ دوسرے طالبین حق بھی اس میں سے حصہ پاتے ہیں لیکن ان کا حصہ ان کی استعداد اور اُن کے درجے اور مرتبے کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ اس قسم کا مشاہدہ عالم ظاہر میں بھی ہو سکتا ہے اور عالم روح میں بھی، مگر جس کو ہوتا ہے اس کے لئے موجب اطمینان و یقین ہوتا ہے اور یہی ان کا مقصود ہوتا ہے۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات عزیز، حکیم۔ پر نگاہ جمائے رکھنے کی ہدایت اس وجہ سے ہوئی کہ انہی صفتوں کی یاد داشت سے یہ یقین مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ ضرور اُٹھائے گا اس لئے کہ وہ اس پر قادر بھی ہے اور ایسا کرنا اس کی حکمت کا مقتضیٰ بھی ہے۔

۸۶۔ آگے کا مضمون آیات ۲۶۱-۲۷۴

آگے کا مضمون آیات ۲۶۱-۲۷۴

ہم اُوپر یہ اشارہ کر آئے ہیں کہ یہاں اصل سلسلۂ بیان تو جہاد و انفاق کا تھا لیکن آیت لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ میں ہدایت و ضلالت سے متعلق ایک سنت اللہ کا ذکر آگیا تھا جس کی وضاحت کے لئے

مذکورہ مثالوں کا ذکر ضروری ہوا اور اس طرح اس بحث میں وسعت پیدا ہو گئی۔ اب یہ ضمنی بحث ختم ہو گئی اور انفاق کا مضمون جو سلسلے کا اصل مضمون تھا پھر سامنے آ گیا اور نہایت تفصیل کے ساتھ انفاق کی برکات، اس کی خصوصیات اور اس کی آفات بیان ہوئیں۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ
كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ
عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ
مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ
لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَمَثَلُ
الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ
جَنَّةٍ ۢبِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ
ضُعَفَآءُ ۚۖ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ
لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ
اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۪ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ
اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ
يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝
يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ؕ وَمَا يَذَّكَّرُ
اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ
يَعْلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ

تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ۗ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ
اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ
ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۫ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا
يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ
اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

ان لوگوں کے مال کی تمثیل جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اس دانے کے مانند ہے جس سے سات بالیاں پیدا ہوں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں - اللہ برکت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ بڑی گنجائش والا اور علم والا ہے - جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں پھر اس کے پیچھے نہ احسان جتاتے نہ دل آزاری کرتے، ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے اور نہ تو ان کے لئے کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے - دلداری کا ایک کلمہ کہہ دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو، اللہ بے نیاز اور بردبار ہے - اے ایمان والو! احسان جتا کر اور دل آزاری کر کے اپنی خیرات کو اکارت مت کرو - اس شخص کے مانند جو اپنا مال دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر وہ ایمان نہیں رکھتا - ایسے شخص کی تمثیل یوں ہے کہ ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو پھر اس پر زور کا مینہ پڑے اور وہ اس کو بالکل سپاٹ پتھر چھوڑ جائے - ان کی کمائی میں سے کچھ بھی ان کے پلے نہیں پڑے گا - اور اللہ ناشکروں کو بامراد نہیں کرے گا - ۲۶۱ - ۲۶۴

اور ان لوگوں کے عمل کی تمثیل جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے دلوں کو جمائے رکھنے کے لئے خرچ کرتے ہیں اس باغ کے مانند ہے جو بلندی پر واقع ہو، اس پر بارش ہوگئی تو دو چند پھل لایا، بارش نہ ہوئی تو پھوار بھی کافی ہوگئی اور اللہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو

اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۲۶۵

کیا تم میں سے کوئی بھی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، نیچے اس کے نہریں بہہ رہی ہوں، اس میں اس کے واسطے ہر قسم کے پھل ہوں، اور وہ بوڑھا ہو جائے اور اس کے بچے ابھی ناتواں ہوں اور باغ پر سموم کا بگولا پھر جائے اور وہ جل کر خاک ہو جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمہارے لئے واضح کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ ۲۶۶

اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے پاکیزہ مالوں میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں اور اس میں سے وہ مال تو خرچ کرنے کا خیال بھی نہ کرو جس کو خدا کی راہ میں تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو بغیر آنکھیں میچے اس کو نہ لے سکو اور اس بات کو خوب یاد رکھو کہ اللہ بے نیاز اور ستودہ صفات ہے۔ ۲۶۷

شیطان تمہیں تنگ دستی سے ڈراتا اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت بخشتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر کا خزانہ ملا۔ مگر یاددہانی وہی حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ ۲۶۸ - ۲۶۹۔

اور جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے یا جو کچھ بھی نذر مانو گے تو یاد رکھو کہ اللہ اس سے اچھی طرح واقف ہے اور ان لوگوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا جو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ ۲۷۰۔

اور اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو وہ بھی اچھا ہے اور اگر تم ان کو چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے گناہوں کو جھاڑ دے گا۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۲۷۱

ان کو ہدایت دینا تمہارے ذمے نہیں ہے بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے اس کا نفع تمہیں کو حاصل ہوتا ہے اور نہ خرچ کیجیو مگر اللہ کی

رضاجوئی ہی کے لئے اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا کر دیا جائے گا اور تمہارے حق میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی - ۲۷۲

یہ ان غریبوں کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں، زمین میں کاروبار کے لئے نقل و حرکت نہیں کر سکتے، بے خبر ان کی خودداری کے سبب سے ان کو غنی خیال کرتا ہے، تم ان کو ان کی صورت سے پہچان سکتے ہو، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے - اور جو مال بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس کو خوب جانتا ہے - جو لوگ اپنے مال رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور نہ ان کے لئے خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے - ۲۷۳-۲۷۴

۸۷ - الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تاویل -

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تاویل

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۲۶۱

فی سبیل اللہ کا مفہوم

"فی سبیل اللہ" قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے تحت وہ سارے کام آتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کئے جائیں - حالات کے اعتبار سے کوئی کام زیادہ اہم ہو سکتا ہے کوئی کم لیکن جو کام بھی رضائے الٰہی کے لئے اور شریعت کی ہدایات کے تحت کیا جائے وہ فی سبیل اللہ ہے -

یہ اُس بڑھوتری کی تمثیل ہے جو راہ خدا میں خرچ کئے ہوئے مال کے اجر و ثواب میں ہوگی - فرمایا کہ جس طرح ایک دانے سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں اسی طرح ایک ایک نیکی کا صلہ سات سو گنے تک بندے کو آخرت میں ملے گا - اس مضمون کی وضاحت احادیث میں بھی ہوئی ہے - حضور نے فرمایا ہے کہ نیکیوں کا بدلہ دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک ملے گا - یہ فرق ظاہر ہے کہ عمل کی نوعیت، عمل کے زمانے اور عمل کرنے والے کے ظاہری و باطنی حالات پر مبنی ہوگا - اگر ایک نیکی مشکل حالات اور تنگ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر زیادہ ہوگا اور اگر ایک نیکی آسان حالات اور کشادہ وسائل کے ساتھ کی گئی ہے تو اس کا اجر کم ہوگا - پھر نیکی کرنے

والے کے احساسات کا بھی اس پر اثر پڑے گا۔ ایک نیکی پوری خوش دلی اور پورے جوش و خروش کے ساتھ کی گئی ہے اور دوسری سرد مہری اور نیم دلی کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ دونوں کے اجر و ثواب میں بھی فرق ہوگا آیت میں اجر کی وہ شرح بیان ہوئی ہے جو سب سے اونچی ہے اور فرمایا ہے کہ "اللہ تعالیٰ جس کے لئے چاہتا ہے بڑھاتا ہے"۔ یہ اس ضابطے کی طرف اشارہ ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا۔ اللہ تعالیٰ کا کوئی چاہنا بھی عدل و حکمت کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے یہ بڑھوتری انہی کے لئے وہ چاہتا ہے جو اس کے ٹھہرائے ہوئے ضابطے کے مطابق اس کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

"وَاسِعٌ عَلِيمٌ" میں ایک تو یہ بات واضح فرمائی کہ اجر کی اس وسعت پر بندہ اپنی تنگ دامانی پر قیاس کرکے حیران ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ غیر محدود سمائی رکھنے والا ہے، دوسری، یہ بات فرمائی کہ خدا کی راہ میں جو چھوٹی یا بڑی، پوشیدہ یا علانیہ نیکی کی جاتی ہے سب اس کے علم میں رہتی ہے اس وجہ سے ہر شخص اپنے اجر کی طرف سے مطمئن رہے۔ جب دینے والے کا خزانہ بھی غیر محدود ہے اور اس کا علم بھی غائب و حاضر سب پر محیط ہے تو تشویش کی گنجائش کہاں باقی رہی!

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ۲۶۲

"اَذًی" کا لفظ ہر اس چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے جو باعث رنج و اذیت ہو عام اس سے کہ یہ رنج و اذیت جسمانی ہو یا جذباتی و روحانی۔ یہاں اس سے مراد وہ طعن و تشنیع اور توہین و تحقیر ہے جو عموماً کم ظرفوں کی طرف سے ان لوگوں کے لئے ظاہر ہوتی ہے جن پر وہ کبھی کوئی احسان کر بیٹھتے ہیں۔

فرمایا کہ یہ اجر عظیم جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا ان خرچ کرنے والوں کے لئے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ تو ان لوگوں پر کوئی احسان جتائیں جن پر انہوں نے خرچ کیا ہے اور نہ کسی پہلو سے ان کی کوئی دل آزاری کریں۔ واضح رہے کہ یہ احسان جتانا اور دل آزاری کرنا دونوں چیزیں ایک ہی فاسد کردار کے دو پہلو ہیں۔ لئیم اور کم ظرف لوگ اگر کسی پر کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ شخص زندگی بھر ان کا ممنون احسان بلکہ زر خرید غلام بن کے رہے۔ اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے تو پھر وہ اس کو اپنے طعنوں کا ہدف بنا لیتے ہیں اور جہاں ان کو موقع ملتا ہے اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لئے کوئی اجر نہیں

ہے۔ اجر ان لوگوں کے لئے ہے جن کا انفاق اس بلا سے محفوظ رہے۔

"لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ" دوسری جگہ ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ جنت کی تعبیر ہے اس لئے کہ جنت ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی پچھتاوا۔ یہاں جنت کی تعریف ان لفظوں میں جو کی گئی ہے اس میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ انفاق کرنے والے اس جنت کے سزاوار اس لئے ٹھہریں گے کہ نہ تو خدا کی راہ میں خرچ کر کے انہوں نے کبھی اس بات کا غم کیا کہ کیوں خرچ کر دیا اور نہ کبھی شیطان کے ڈراوؤں سے متاثر ہو کر مستقبل کے اندیشوں میں مبتلا ہوئے کہ کل کیا کھائیں گے۔ ان کے اس حوصلے کے صلے میں خدا ان کو سات سو گنے تک اجر بھی دے گا اور وہ بہشت بھی جو ماضی اور مستقبل دونوں طرف سے انہیں مطمئن اور بےغم کر دے گی۔

تسامح :- میثاق اگست ۱۹۶۴ء کے صفحہ ۹ کی نیچے سے تیسری سطر میں غلطی سے طالوت کی بجائے جالوت کتابت ہو گیا ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

اِس شمارہ کے چند صفحے ایک دوسرے کاتب سے کتابت کروانے پڑے جس کے نتیجے میں کتابت خاطر خواہ نہ ہو سکی۔ (ادارہ)

افاداتِ فراہیؒ

خالد مسعود صاحب

معجزہ کی حقیقت

معجزہ سے مراد وہ کام ہے جو انسان کی قوت اور اس کی تدابیر کی حدود سے باہر ہو۔ اس اعتبار سے نشانیٔ معجزہ بھی ہوتی ہیں اور امرِ رب پر دلیل بھی۔ معجزہ کا یہ مفہوم اس آیت سے واضح ہوتا ہے جس میں قرآن مجید نے انزالِ مائدہ کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا قول نقل کیا ہے:۔

قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ الشّٰهِدِيْنَ ○ (مائدہ ۱۱۳)

انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں کہ اس مائدہ میں سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہم جان جائیں کہ آپ نے ہمیں سچی بات کہی اور ہم اس پر گواہ بنیں۔

یعنی اگر خدا ہماری اس درخواست پر آسمانی خوان اتار دے گا تو ہم اس بات کا یقین کر لیں گے کہ اسی نے آپ کو رسول بنایا اور آپ جو پیغام خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں وہ واقعی اسی کا ہے۔ یہ معجزہ دیکھ کر ہم آپ کی حقانیت کی گواہی ان لوگوں کے سامنے دیں گے جو یہاں موجود نہیں۔

معجزہ اور شعبدہ میں فرق

شعبدہ اور معجزہ میں یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر محض لہو کے لئے اور ثانی الذکر نعمت و نصرت کے لئے ہوتا ہے۔ شعبدہ کا اثر انسان کے سفلی جذبات پر پڑتا ہے۔ اس کی نشوونما تقویٰ کی بنیاد پر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی شعبدہ باز نے نہ تو اپنی قوم کی قیادت کی اور نہ اس کو سربلند کیا ہے

یہ لوگ ہمیشہ ذلیل و خوار رہے ہیں۔ قرآن نے اسی حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ (طٰہٰ ۶۹) اور جادوگر جہاں جائے فلاح نہیں پائے گا۔

اس کے برعکس معجزہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس سے نبی اپنے مشن کو ترقی دیتا اور اپنے دشمنوں کو مغلوب کرتا ہے۔

معجزہ کی ضرورت

زمرۂ انبیاء کا کوئی فرد جھوٹ سے متہم نہیں ہوتا کہ اس کی صداقت کے اثبات کے لئے معجزات اتارنے کی ضرورت ہو۔ بلکہ نبی جب اپنی قوم کو توحید اور آخرت کی حقیقت سمجھاتا ہے تو وہ اس کے صحیح ہونے میں شک کرتی ہے اس مرحلہ میں نبی کی صداقت کا نہیں بلکہ توحید و معاد کا اثبات ضروری ہوتا ہے اسی لئے ابتدا میں تو وحی کے ذریعے سے نبی کو صرف دلائل عطا ہوتے ہیں تاکہ مخاطبین کی عقل کی گرہیں کھلیں، معجزہ ظاہر کرنے سے اس وقت اجتناب کیا جاتا ہے۔ لیکن معاملہ جب اتمامِ حجت کا ہو، اس وقت نبی کو معجزہ عطا کیا جاتا ہے اور اس کے بعد قوم کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے۔

چونکہ انسان کی عقل کسی مثال کو دیکھ کر ایک حقیقت کو مانتی اور اس پر غور کرتی ہے اس لئے معجزہ نبوت کی ایک دلیل بھی ہے۔ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ معجزہ بطور دلیل بھی آتا ہے فر

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَىٰ تِسْعَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ فَاسْأَلْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُمْ فَقَالَ لَهُ فِرْعَوْنُ إِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا مُوسَىٰ مَسْحُورًا ۝ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا أَنْزَلَ هَٰؤُلَاءِ إِلَّا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ بَصَائِرَ وَإِنِّي لَأَظُنُّكَ يَا فِرْعَوْنُ مَثْبُورًا ۝ (بنی اسرائیل ۱۰۱، ۱۰۲)

ہم نے موسیٰ کو کھلی نشانیاں عطا کیں، بنی اسرائیل سے پوچھو کہ جب وہ ان کے پاس آیا تو اس سے فرعون نے کہا، موسیٰ میں تو تمہیں سحر زدہ خیال کرتا ہوں موسیٰ نے جواب دیا تمہیں معلوم ہے کہ ان کو نہیں اتارا مگر آسمانوں اور زمین کے رب نے نشانیاں بنا کر اور فرعون، میں سمجھتا ہوں کہ تم ہلاکت میں پڑنے والے ہو۔

معجزہ خدا کا فعل ہے

یہ دعویٰ کہ معجزہ نبی کا فعل ہوتا ہے، شریعت کی رو سے بالکل بے بنیاد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معجزہ ظاہر کر

والا خدا ہے۔ وہ یا تو نبی کے ہاتھ سے معجزہ دکھاتا ہے یا اس کی نبوت کی شہادت کے طور پر خود اتارتا ہے۔ اس حقیقت کی تصریح قرآن کے علاوہ پہلے صحیفوں میں بھی ملتی ہے۔ قرآن میں ہے

وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ (رعد ۳۸)

کسی رسول کا یہ کام نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائے۔

دوسری جگہ فرمایا۔

قَالَتْ رُسُلُهُمْ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يَدْعُوكُمْ لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرَكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ۚ قَالُوا إِنْ أَنْتُمْ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُنَا تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ۝ قَالَتْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ (ابراہیم ۱۰، ۱۱)

ان کے پیغمبروں نے کہا کیا خدا کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے، وہ تمہیں اس لئے بلاتا ہے کہ تمہارے گناہ بخشے اور تمہیں ایک مدت معینہ تک مہلت دیتا ہے انہوں نے کہا، تم ہماری ہی طرح کے انسان ہو اور چاہتے یہ ہو کہ ہمیں ان چیزوں سے روکو جن کو ہمارے باپ دادا پوجتے رہے۔ اچھا لاؤ کوئی واضح نشانی۔ رسولوں نے ان سے کہا، ہم تو تمہاری ہی طرح کے انسان ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے احسان کرتا ہے۔ اور ہمارا یہ منصب نہیں کہ ہم اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائیں۔ اور مومنوں کو تو اللہ ہی پر توکل کرنا چاہیے۔

یہاں سلطان مبین، سے مراد اس عذاب کی نشانیاں ہیں جس سے انبیاء کرام اپنی قوم کو متنبہ کرتے تھے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کا مقصود نبی کی رسالت کا اثبات ہوتا ہے۔ اگر معجزہ نبی کا فعل ہوتا تو یہ اس کی رسالت کی نہیں

بلکہ الوہیت کی دلیل ہوتا۔ اسی لئے نبی پر یہ واجب کیا گیا ہے کہ وہ واضح طور پر یہ کہہ دے کہ معجزہ دکھانا اس کی قوت سے باہر ہے۔

فیصلہ کن معجزہ کا وقت معین ہوتا ہے

نبی کو جو معجزہ قوم پر اتمام حجت کے لئے دیا جاتا ہے اور جس کے بعد ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کی ہلاکت مقدر ہو جاتی ہے، اس کا وقت خدا کے ہاں معین ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے سبب سے کسی امت کی مہلت میں مزید اضافہ کر دیتا ہے تاکہ وہ معجزہ دیکھے بغیر ہی ایمان لائے۔ اس میں ایک حکمت یہ ہے کہ ہدایت اس فہم و بصیرت سے نشوونما پاتی ہے جس کی تربیت نبی کے ہاتھوں ہوتی ہے اس کے برعکس جو ایمان معجزہ دیکھ کر لایا جائے وہ محض مقلدانہ ایمان ہوتا ہے جس کے بعد نبی کے لائے ہوئے پیغام کے بارے میں کوئی بصیرت نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس میں دوسری حکمت یہ ہے کہ فیصلہ کن معجزات کے ظہور کے بعد صرف عذاب باقی رہ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کو فیصلہ کن معجزات اسی وقت دیئے جاتے ہیں جب قوم کے اندر فکر و فہم کے ذریعہ سے ایمان لانے والا کوئی نہیں رہ جاتا اور جو لوگ معجزہ دیکھنے سے پہلے ایمان نہیں لاتے، وہ اسے دیکھنے کے بعد بھی کم ہی ایمان لاتے ہیں۔ جیسا کہ فرمایا۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ۭ كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰي قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ؁

(یونس ۷۴)

پھر ہم نے اس کے بعد رسولوں کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان کے پاس کھلی نشانیاں لائے مگر لوگ جن باتوں کو پہلے سے جھٹلا چکے تھے ان پر ایمان لانے والے نہ بنے ہم حد سے بڑھ جانے والوں کے دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیا کرتے ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا۔

وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ؁ فَهَلْ يَنْتَظِرُوْنَ

معجزات اور تنبیہات ان لوگوں کے کسی کام نہیں آتیں جو ایمان لانے والے نہیں ہوتے

مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ۔۔۔ یہ لوگ بھی اسی طرح کے عذابوں کے منتظر ہیں
قُلْ فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ ۔۔۔ جس طرح کے عذاب پہلے لوگوں پہ گزر چکے۔
الْمُنْتَظِرِیْنَ ۔۔۔ کہو کہ انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار
(یونس ۱۰۱، ۱۰۲) ۔۔۔ کرنے والوں میں ہوں

پس معجزہ چونکہ قیامت کی مانند فصل و فرقان ہوتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کے ظہور کے وقت کو غیب میں رکھتا ہے اور نبی اس کا منتظر رہتا ہے۔ کبھی کبھی نبی کا دل لوگوں کے باطل پر اصرار کر لینے سے تنگ ہوتا ہے تو وہ فیصلہ طلب کرنے میں جلدی کرتا ہے اور کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ نبی معجزہ کے بعد آنے والے عذاب کے اندیشہ سے ان لوگوں پر غضبناک ہوتا ہے جو معجزہ طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ مسیح علیہ السلام نے فریسیوں سے یہی سلوک کیا۔

"[1] پھر فریسیوں اور صدوقیوں نے پاس آکر آزمانے کے لئے اس سے درخواست کی کہ ہمیں کوئی آسمانی نشانی دکھا۔ اس نے جواب میں ان سے کہا شام کو تم کہتے ہو کہ کھلا رہیگا کیونکہ آسمان لال اور دھندلا ہے۔ تم آسمان کی حرارت میں تمیز کرنا جانتے ہو مگر زمانے کی علامتوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اس زمانہ کے برے اور زناکار لوگ نشان طلب کرتے ہیں مگر یوناہ کے نشان کے سوا کوئی اور نشان ان کو نہ دیا جائیگا۔ اور وہ ان کو چھوڑ کر چلا گیا"

متی ۱۶ : ۱ — ۴

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین عذاب کی جو نشانیاں مانگتے تھے، قرآن نے اس کا جواب بڑی وضاحت سے دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ نشانیاں خدا کے پاس محفوظ ہیں اور نبی خود ان کے منتظر ہیں۔ فرمایا۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ ۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ اس پر اس کے رب کی جانب سے
اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ ۔۔۔ نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، کہو غیب کا مالک اللہ ہے،

---

[1] مصنف علیہ الرحمہ نے یہاں بیاض چھوڑی ہے۔ بائبل کا یہ اقتباس ہم نے خود بڑھایا ہے۔ مصنف کا اشارہ بھی اسی اقتباس یا اس جیسی کسی اور عبارت کی طرف ہوگا۔
ا غ - م

بِّلّٰہِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ۝ (یونس ۲۰)

تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔

یعنی عذاب کی جن نشانیوں کا مطالبہ تم کر رہے ہو، وہ آئیں گی تو ضرور مگر خدا کے ہاں ان کے آنے کا وقت مقرر ہے، جس کا علم صرف خدا کو ہے۔ میں خود اس کا انتظار کر رہا ہوں۔ اسی طرح کی آیت یہ بھی ہے۔

قُلْ اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّیْ وَكَذَّبْتُمْ بِهٖ ۚ مَا عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ ۚ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۚ یَقُصُّ الْحَقَّ وَهُوَ خَیْرُ الْفٰصِلِیْنَ ۝ قُلْ لَّوْ اَنَّ عِنْدِیْ مَا تَسْتَعْجِلُوْنَ بِهٖ لَقُضِیَ الْاَمْرُ بَیْنِیْ وَبَیْنَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَیْبِ لَا یَعْلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ۚ (انعام ۵۷ - ۵۹)

کہو کہ میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور تم اس کو جھٹلاتے ہو۔ میرے پاس وہ چیز نہیں جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو۔ فیصلہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہ سچی امر بیان کرتا ہے اور سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔ کہو کہ اگر وہ چیز میرے پاس ہوتی جس کے لئے تم جلدی مچا رہے ہو تو میرے اور تمہارے درمیان معاملہ طے ہو چکا ہوتا اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

یہی مضمون آیت ذیل میں بھی بیان ہوا ہے۔

قُلْ لَّسْتُ عَلَیْكُمْ بِوَكِیْلٍ ۝ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ (انعام ۶۶-۶۷)

کہو کہ میں تمہارے اوپر داروغہ نہیں ہوں۔ ہر خبر کا وقت معین ہے اور عنقریب تم جان لوگے

معجزات کی اقسام

انبیاء کے مخاطبین جن معجزات کا مطالبہ کرتے تھے ان کی دو قسمیں ہیں:۔

معجزات کی ایک قسم وہ ہے جن کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا۔ یہ دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو انسان کے حال سے بلند ہوتے ہیں مثلاً خدا کو آنکھوں سے دیکھنے کا مطالبہ یا یہ مطالبہ کہ ان پر آسمان سے ایک کھلی کتاب اتاری جائے۔ دوسرے وہ جن کا تقاضا نبی کی قوت

کے بارے میں غلط گمان کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ نبی ان کے پاس وہ چیزیں لائے جو ان کو محبوب ہیں، اس کا ایک خزانہ ہو یا اس کے ہمراہ فرشتے نازل ہوں۔

دوسری قسم کے معجزات وہ ہوتے ہیں جن کے جواب میں تاخیر کی جاتی ہے۔ اس تاخیر میں دو مصلحتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ فہم و تقویٰ رکھنے والے لوگ بصیرت کے ساتھ ایمان لائیں، دوسری یہ کہ ایمان نہ لانے والوں پر حجت تمام ہو جائے اور اس مرحلے سے پہلے ان پر عذاب نہ نازل ہو۔

یہ چار اسباب ہیں جن کی وجہ سے نبی معجزہ دکھلانے کا مطالبہ مسترد کر دیتا ہے۔ ہم نے یہاں ان اسباب کا ذکر مجمل طریقہ سے کیا ہے۔ قرآن میں یہ حقائق تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

قرآن کی جن آیات میں معجزات کے مطالبہ کو رد کیا گیا ہے ان سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی معجزہ عطا نہیں ہوا۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں انہوں نے ان آیات کے موقع و محل کو نہیں سمجھا۔ ورنہ قرآن تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں معجزات کے وقوع پر شاہد ہے۔ مثلاً فرمایا۔

وَإِذَا رَأَوْا آيَةً يَسْتَسْخِرُونَ وَقَالُوا إِنْ هٰذَا إِلَّا سِحْرٌ مُّبِينٌ ۝ (صافات ۱۴) — اور جب وہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

قرآن کا معجزہ ہم مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ قرآن اس شخص کے لئے معجزہ ہے جو اس جیسی کتاب تصنیف کرنے کا دعویٰ کرے۔ لیکن علماء کے درمیان اس بارے میں اختلاف ہے کہ قرآن کے اعجاز کا کیا پہلو ہے۔ میرے نزدیک اور بیشتر علماء کے نزدیک، قرآن کی فصاحت و بلاغت اس کا اعجاز ہے۔ جو لوگ اس پہلو کا انکار کرتے ہیں ان کے نزدیک قرآن کی ہدایت اس کا معجزہ ہے۔ ان کا استدلال اس آیت سے ہے۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَإِن لَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمْ أَنَّمَا يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ — کہو کہ لاؤ کوئی کتاب اللہ کی طرف سے جو ان دونوں یعنی تورات و قرآن سے زیادہ ہدایت دینے والی ہو، اگر تم سچے ہو۔ پس اگر یہ تمہیں کوئی جواب نہ دے سکیں تو جان لو کہ یہ اپنی خواہشات

سکے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ (قصص ۳۹، ۵۰)

ان علماء کی تقریر ہمارے نقطہ نظر کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ہدایت اسی وقت اھدیٰ اور دلنشین کہلاتی ہے جب وہ ایک ایسے کلام میں پیش کی جائے جو فصاحت و بلاغت کی آخری حد پر ہو۔ پس قرآن کا معجزہ کی حد تک بلیغ ہونا اس کے اھدیٰ ہونے کے منافی نہیں ہے۔

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر قرآن	(قرآن فہمی کی رہنما)		۲۵	۳
تدبر قرآن	(تفسیر آیہ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ)		۷۵	۰
اسلامی قانون کی تدوین		۲/۰	۰	۳
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ			۲۵	۲

مطبوعات دیگر مصنفین!

(آنحضرتؐ) سیرت ابن ہشام	۰	۴۰
ابوبکرؓ صدیق اکبر	۵۰	۴
عمرؓ فاروق اعظم	۰	۲۰
حیات امام ابوحنیفہؒ	۰	۱۵
حیات امام احمد بن حنبلؒ	۰	۱۰
آثار امام شافعیؒ	۰	۱۲
حیات امام مالکؒ	۰	۱۰
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ	۰	۲۱
زادِ سفر (حصہ اول)	۷۵	۳
ISLAM AND THE WORLD.	۰	۴

منگوانے کا پتہ:- مکتبہ میثاق رحمانپورہ (اچھرہ) لاہور ۱۲

بحث ونظر

امین احسن اصلاحی

خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب

(۲)

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک چونکہ قرآن نے تحدید آبادی کے مسئلے سے براہ راست کوئی تعرض ہی نہیں کیا ہے، صرف عام نوعیت کے بیانات ہی اس میں ملتے ہیں اس وجہ سے اس بحث میں انھوں نے قرآن کو بالکل خارج از بحث قرار دے دیا ہے، صرف ایک دو آیتیں موصوف کے نزدیک ایسی ہیں جن سے مخالفین استدلال کرتے ہیں مثلاً "زمین پر چلنے والا کوئی ذی روح ایسا نہیں ہے جس کا رزق خدا کے ذمے نہ ہو" لیکن اس آیت سے خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف استدلال ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ایک بچگانہ حرکت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "قرآن کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ ہر زندہ مخلوق کے لیے رزق مہیا کرنا اللہ کی ذمہ داری ہے خواہ وہ خود اپنے لیے قوت لایموت مہیا کرنے کے قابل ہو یا نہ ہو"۔ ڈاکٹر صاحب نے اس آیت کا ایک مضمون از خود فرض کیا ہے اور پھر نہایت تحقیر کے انداز میں اس کی تردید فرمائی ہے، حالانکہ یہ کوئی نہیں کہتا کہ "ہر زندہ مخلوق کے لئے رزق مہیا کرنا اللہ کی ذمہ داری ہے"، خدا پر کوئی ذمہ داری عاید کرنے والا کون ہے! لوگ تو اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ ہر مخلوق کو روزی دینا اللہ ہی کا کام ہے، کوئی دوسرا رزق بہم پہنچانے والا نہیں ہے، اور یہ ہر مسلمان کا عقیدہ ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ آیت ان لوگوں کے وہم پر ایک کاری ضرب لگاتی ہے جو آج اپنے آپ کو خلق کا رزاق سمجھ کر اس کی تحدید کے منصوبے بنا رہے ہیں۔ اگر اس آیت سے اس

منصوبے کے خلاف استدلال ڈاکٹر صاحب کے نزدیک کوئی بچکانہ حرکت ہے تو میں ڈاکٹر صاحب کو یہ اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ اس "بچکانہ حرکت" کا ارتکاب ان امام غزالی صاحب نے بھی فرمایا ہے جن کی پشت پناہی کے بھروسے پر ڈاکٹر صاحب نے یہ پورا مضمون لکھا ہے۔ امام صاحب نے عزل کی اسی بحث میں جس کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کی بنیاد بنایا ہے معاشی وجوہ کی بنا پر عزل کرنے والوں کے اس فعل کو اعتماد علی اللہ کے منافی قرار دیا ہے اور اپنے اس دعوے پر استدلال اسی آیت سے کیا ہے۔ امام صاحبؒ کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں۔ فرماتے ہیں۔

نَعَمْ الکمال والفضل فی التوکل والثقة بضمان اللہ حیث قَالَ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا فَلَاجَرَمَ فِيْهِ سقوط عن ذروة الکمال	ہاں، کمال اور فضیلت کا درجہ اللہ پر توکل کرنے اور اس کی دی ہوئی ضمانت پر بھروسہ کرنے ہی میں ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ "اور نہیں ہے زمین میں کوئی جاندار مگر اس کی روزی اللہ ہی کے ذمہ ہے"۔ سو اس اعتبار سے بلاشبہ معاشی وجوہ کی بنا پر عزل کرنے والوں کا فعل درجہ کمال سے گرنے کے ہم معنی ہے۔
(احیاء ج ۲ ص ۴۷)	

یہ بحثیں تو آگے آئیں گی کہ عزل کے باب میں شریعت کا حکم کیا ہے؟ اس سے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں استدلال کس درجہ غیر منطقی بلکہ لغو ہے؛ امام غزالیؒ کا مسلک درباب عزل کیا ہے اور ان پر خاندانی منصوبہ بندی کے حامی ہونے کی تہمت کتنی بے بنیاد ہے؟ یہاں صرف یہ دیکھیے کہ جس استدلال کو ڈاکٹر صاحب ایک "بچکانہ حرکت" قرار دیتے ہیں اس کے مرتکب خود امام غزالیؒ ہوئے ہیں یا نہیں! لیکن ہمارے ان مشرقی مستغربین کا حال یہی ہے کہ اگر کسی شخص کی کوئی بات یہ توڑ مروڑ کر اپنے حسب منشا بنا سکیں تب تو یہ اس کے نام کی آڑ لے کر ایک پوری شریعت تصنیف کر ڈالتے ہیں، اور اگر بات ان کی خواہشوں کے خلاف جا رہی ہو تو وہ "بچکانہ حرکت" بن جاتی ہے۔

اب آیئے دیکھیے کہ باوجودیکہ خاص "خاندانی منصوبہ بندی" کے الفاظ قرآن میں استعمال نہیں ہوئے ہیں لیکن کتنے مختلف پہلوؤں سے یہ منصوبہ بندی قرآن کے خلاف ہے۔

۱۔ سب سے پہلے تو یہ چیز نگاہ میں رکھنے کی ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی ساری اسکیم اولاد کی کثرت کو ایک خطرہ، ایک مصیبت اور ایک آفت سمجھنے کے تصور پر مبنی ہے لیکن قرآن اولاد کی کثرت کو اللہ کا ایک فضل، اس کی نعمت اور اس کی امداد قرار دیتا ہے۔ چند آیات ملاحظہ ہوں۔

ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيرًا۔ (۶ بنی اسرائیل)

پھر ہم نے تمہاری باری ان کے اوپر لوٹائی اور تمہیں کمک پہنچائی مال سے اور اولاد سے اور تمہیں تعداد میں زیادہ کیا۔

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (۴۶ کہف)

مال و اولاد دنیا کی زندگی کی زینت ہیں۔

وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُم مِّنْ أَزْوَاجِكُم بَنِينَ وَحَفَدَةً (۷۲۔ نحل)

اور اللہ نے تمہاری ہی جنس سے تمہارے لیے بیویاں بنائیں اور ان بیویوں سے بیٹے اور پوتے پیدا کیے۔

وَأَمَدَّكُم بِأَنْعَامٍ وَبَنِينَ ۝۱۳۳ (شعراء)

اور اللہ نے چوپاؤں اور اولاد سے تمہاری امداد فرمائی۔

وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ (۱۲ ۔ نوح)

اور اللہ مال و اولاد سے تمہاری مدد فرمائے گا۔

ذَرْنِي وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِيدًا وَجَعَلْتُ لَهُ مَالًا مَّمْدُودًا وَبَنِينَ شُهُودًا (۱۲-۱۳- مدثر)

بس چھوڑ دو مجھے اور اس کو جس کو میں نے پیدا کیا تنہا اور اس کو عطا کیا پھیلا ہوا مال اور حاضر باش اولاد۔

خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً

اور اسی کی جنس سے بنایا اس کا جوڑا اور ان دونوں سے پیدا کیے بہت سے مرد اور بہت

(۱- نساء) کی عورتیں۔

ہم نے اس مضمون کے متعلق قرآن کی بے شمار آیات میں سے چند آیات نقل کی ہیں جن میں سے ہر آیت سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نہ صرف اولاد بلکہ اولاد کی کثرت اللہ کا ایک انعام اور اس کی بہت بڑی امداد ہے۔ برعکس اس کے قرآن سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی شہادت بھی اس بات کی نہ مل سکیگی کہ اولاد کوئی مصیبت ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے قومی پیمانے پر منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔

یہ امر بھی یہاں اچھی طرح ملحوظ رہے کہ کثرت اولاد کے نعمت ہونے کا یہ ذکر ان عربوں کے سامنے ہو رہا ہے جن کے معاشی وسائل کی تنگی ساری دنیا میں ضرب المثل رہی ہے اور جو ہم سے کہیں زیادہ اس بات کے حقدار تھے کہ ان کو یہ نصیحت کی جاتی کہ اولاد کی مصیبت سے نجات حاصل کرکے اپنے معیار زندگی کو اونچا کرنے کی کوشش کرو۔

۲۔ اس چیز کے مخالفِ قرآن ہونے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن نے عورتوں کو کھیتی قرار دیا ہے چنانچہ فرمایا ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۲۲۳- بقرہ

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں تو تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو اور اپنے لیئے آگے بڑھاؤ

عورتوں کو کھیتی سے تشبیہ دینے سے جو باتیں صاف طور پر نکلتی ہیں ان میں سے چند باتوں کی طرف ہم یہاں اشارہ کرتے ہیں جن میں سے ہر بات خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف جاتی۔

اس استعارہ سے پہلی بات تو یہ نکلتی ہے کہ جس طرح کھیتی سے اصل مقصود پیداوار حاصل ہوتا ہے اسی طرح عورتوں سے اصل مقصود افزائش نسل انسانی ہے۔ جس طرح اس مقصد سے نکل جانے کے بعد کھیتی کھیتی نہیں رہ جاتی ہے اسی طرح مذکورہ مقصد سے نکل جانے کے بعد عورت عورت نہیں باقی رہتی۔

دوسری بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جس طرح ہر کسان اپنے لیے زرخیز اور فصل آور زمین کا انتخاب کرتا ہے، نہ کہ شور اور بنجر زمین کا، اسی طرح ہر مرد کو ازدواجی تعلق کے لیے ایسی عورت کا انتخاب کرنا چاہیئے جو بچے جننے والی، بچوں سے محبت کرنے والی اور بچوں کی اٹھا

والی ہو، نہ کہ بانجھ یا اولاد سے بیزار عورت کا، خواہ اس کا بانجھ پن مصنوعی ہو یا حقیقی۔ اسی بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں واضح فرمایا ہے کہ تَنَاکَحُوا الْوَلُوْدَ الْوَدُوْدَ (نکاح کرو بچے جننے والی اور بچوں سے محبت کرنے والی عورت سے)

تیسری بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جس طرح ایک زیرک اور ہوشمند کسان ہر موسم پر اپنے کھیت میں ہل چلاتا اور تخم ریزی کرتا ہے، اور اگر وہ اس میں کوتاہی کرتا ہے تو اس سے اس کی انفرادی دولت کو بھی نقصان پہنچتا ہے اور ملک کی اجتماعی دولت کو بھی، اسی طرح جو شخص عورت کی بارآوری اور اس کی آمادگی کے زمانے کو ضائع کرتا ہے وہ اپنی ذاتی ثروت کو بھی نقصان پہنچاتا ہے اور اپنی قومی و ملی طاقت کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

چوتھی بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جس طرح کوئی کسان اپنی زمین میں کبھی، اس مقصد کے لیے زہر پاشی نہیں کرتا کہ اس کی زمین شور اور بنجر ہو جائے یا اس میں بوئے ہوئے تخم مارے جائیں اسی طرح کسی مرد کے لیئے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ عورت کو ناقابل ولادت بنا دینے کی تدبیریں کرے یا ایسی صورتیں اختیار کرے جن سے نطفہ قرار نہ پکڑ سکے یا حمل ضائع ہو جائے۔

پانچویں بات اس سے یہ نکلتی ہے کہ جس طرح کوئی کسان اپنی زمین میں محض محنت برائے محنت کیلئے ہل چلانے کی حماقت نہیں کرتا بلکہ ہل چلاتا ہے تو پیش نظر تخم ریزی بھی ہوتی ہے سی طرح ایک مرد کے لئے بھی یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ اپنے بدن کا بخار نکالنے کے لیئے تو ورت سے مواصلت کا خواہشمند ہو لیکن بیوی کے حاملہ ہو جانے کی ذمہ داریوں سے گھبرائے۔

یہ ہم نے اس استعارے کے صرف چند نمایاں پہلو بیان کیئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آیت کے لفاظ سامنے رکھکر ابھی غور فرمائیں کہ یہ ساری باتیں قرآن سے نکلتی ہیں یا نہیں؟ اگر نکلتی ہیں تو پھر وہ یہ فرمائیں کہ آخر قرآن کن لفظوں میں خاندانی منصوبہ بندی کی حرمت بیان کرتا تب وہ مانتے ہ قرآن نے اس کی ممانعت کی ہے۔ جو باتیں آدمیوں کے سمجھنے کے لیے کہی جاتی ہیں وہ تو اسی طرح کہی جاتی ہیں!

آیت کے آخر میں وَقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُمْ (اور اپنے لیے آگے بڑھاؤ) کے الفاظ کا اضافہ کر کے یہ بات بھی واضح فرما دی کہ جس طرح ایک کسان اپنی کھیتی سے اپنے معاشی مستقبل کو محفوظ کرتے

کی تدبیر کرتا ہے اسی طرح ایک مرد اپنی بیوی سے ازدواجی تعلق قائم کرکے نسل انسانی کے اندر اپنے مستقبل کو محفوظ کرتا ہے۔ اسی راہ سے اس کی اور اس کے خاندان کی ہستی، اس کی روایات اور اس کے مأثر کا اندوختہ اور قومی و ملی زندگی کی تعمیر و توسیع میں اس کا تعاون آگے بڑھتا ہے اور اس کی زندگی کو دوام و تسلسل حاصل ہوتا ہے۔ اسوجہ سے کسی مرد کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ عورت سے اسکا تعلق محض لذت اندوزی کے حدتک محدود رہے بلکہ یہ تعلق اپنی نسل کو آگے بڑھانے کے لئے ہونا چاہئیے۔

۳۔ اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ معاشی تنگ حالی سے مجبور ہو کر جو لوگ زمانہ جاہلیت میں اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے قرآن نے ان کے اس سنگدلانہ فعل سے شدت سے روکا اور اس ممانعت کی دلیل یہ دی کہ کوئی شخص نہ تو اپنی روزی پیدا کرنے پر اختیار رکھتا ہے نہ اپنے آل و اولاد کی، جس کو بھی روزی نصیب ہوتی ہے خدا ہی کے خزانہ جود سے نصیب ہوتی ہے، وہی اس کے اسباب فراہم کرتا ہے اور وہی جس کے لئے چاہتا ہے رزق کو کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔ اس وجہ سے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے آپ کو روزی رساں سمجھ کر یہ فیصلہ کرنے بیٹھ جائے کہ کس کو زندہ رہنا چاہیے اور کس کو نہیں زندہ رہنا چاہیئے اور کتنے افراد کو اس دنیا میں آنا چاہیئے اور کن کو نہیں آنا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرنا صرف اللہ ہی کا کام ہے جو سب کا روزی رساں ہے ان لوگوں کا کام نہیں ہے جو خود خدا ہی کے محتاج ہیں اور دنیا میں آئے تھے تو خدا ہی کی رزاقیت کے سہارے پر آئے تھے، اپنی روزی اپنے ساتھ باندھ کر نہیں لائے تھے۔ ارشاد ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۱۵۱۔ انعام	اور تم اپنی اولاد کو فقر کے سبب سے قتل نہ کرو ہم ہی تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی روزی دیتے ہیں۔
وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ۔ (۳۱۔ اسرا)	اور تم اپنی اولاد کو اندیشہ فقر سے قتل نہ کرو، ہم ہی روزی دیتے ہیں اور تم کو بھی۔

اس آیت پر غور کیجئے تو اس سے دو اہم حقیقتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ جب واقعی اور حقیقی فقر کی بنا پر قرآن نے عربوں جیسی غریب قوم کو یہ اجازت نہ دی کہ

وہ اپنی اولاد کو قتل کریں تو وہ محض معیارِ زندگی اونچا کرنے کے مقصد سے اس بات کی اجازت کس طرح دے سکتا ہے کہ لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے اسلحہ سے کام لے کر اپنی اولاد کی تقلیل کی کوشش کریں۔

دوسری یہ کہ قرآن نے ان دونوں ہی آیتوں میں یہ بات صاف کر دی ہے کہ انسان کا کام اپنے حدودِ کار کے اندر رہ کر اپنے حقوق و فرائض ادا کرنا اور سعی و عمل کے تقاضے پورے کرنا ہے اس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ روزی رساں کے مقام پر کھڑا ہو کر یہ فیصلہ کرے کہ کہ اس دنیا میں کتنے لوگوں کو آنا چاہیے اور کتنے لوگوں کو رہنا چاہیئے۔

ڈاکٹر صاحب ان آیتوں میں "نحن نرزقکم وایاہم" کا کیا مطلب سمجھتے ہیں اگر ہم نے اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی "بچکانہ حرکت" کی ہے تو وہ براہِ کرم اس کا بزرگانہ مطلب ارشاد فرمائیں آخر قرآن میں یہ الفاظ موجود تو ہیں! ۔ اگر ڈاکٹر صاحب کے دل پر یہ الفاظ گراں گزر رہے ہیں تو انہیں آزادی حاصل ہے کہ وہ یہ کہیں کہ قرآن کے یہ الفاظ بھی نعوذ باللہ "بچکانہ" ہیں ۔لیکن ان لوگوں کو وہ قصوروار کس طرح ٹھہرا سکتے ہیں جو قرآن کے الفاظ کا وہی مطلب لیتے ہیں جو اس کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کہتے ہیں کہ ضبطِ ولادت کی اسکیم قتلِ اولاد کے تحت نہیں آتی لیکن ہمارا سوال یہ نہیں ہے کہ یہ اسکیم قتلِ اولاد کے تحت آتی ہے یا نہیں؟ ہمارا سوال یہ ہے کہ جو لوگ آج یہ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں کہ ملک کے پاس جو غذائی سامان ہے اسی کے لحاظ سے آدمی اس ملک میں پیدا ہونے چاہئیں انہوں نے دانستہ یا نادانستہ خدائی کا منصب سنبھال لیا ہے یا نہیں؟ جب خدا خود فرماتا ہے کہ "یہ ہم ہیں جو تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی روزی دیتے ہیں" تو یہ کون ہیں جو خدا کے خزانے کے کلید بردار بن بیٹھے ہیں۔

پھر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ حضرات کس طرح فرماتے ہیں کہ خاندانی منصوبہ بندی کی یہ اسکیم قتلِ اولاد سے پاک ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ منصوبہ بندی اسی بین الاقوامی منصوبہ بندی کا ایک جزو ہے جو اس وقت اشتراکی ممالک اور پچھلی جنگ کے بعض زخم خوردہ ممالک کے سوا تقریباً اکثر ممالک میں چل رہی ہے۔ اس میں تو قتلِ اولادِ جلی اور قتلِ اولادِ خفی کی ساری ہی قسمیں

شامل ہیں بلکہ مردوں کو نامرد بنانا اور عورتوں کو بانجھ بنانا بھی اس مہم کے پروگرام کا ایک حصہ ہے۔ ابھی چند دن ہوتے ہیں میں نے بھارت کے ایک اخبار میں خاندانی منصوبہ بندی کے کارفرماؤں کے کارنامے پڑھے تھے کہ انہوں نے کم و بیش ۷ لاکھ مردوں اور عورتوں کو اولاد پیدا کرنے کے ناقابل بنا لیا ہے اور اب وہ اسقاط حمل کو قانونی شکل دلانے کے مسئلہ پر غور کر رہے ہیں[1]۔ ظاہر ہے کہ اس اسکیم کے تدریجی مراحل یہی ہیں۔ اس وجہ سے جہاں بھی یہ چل رہی ہے اپنے تمام مراحل سے گزر کے رہیگی۔ آج نہیں گزریگی تو کل گزریگی۔ اس وجہ سے یہ کہنا صریح جھوٹ ہے کہ قتل اولاد اس اسکیم میں شامل نہیں ہے۔ ہم تو جب اس آیت کی روشنی میں اس اسکیم کے مضمرات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ یہ شرک اور قتل اولاد دونوں ہی چیزوں کا مجموعہ ہے اور یہ دونوں چیزیں اسلام میں جس درجے کا جرم ہیں اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۴۔ اس کے خلاف قرآن ہونے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قرآن نے زنا اور زنا کے تمام محرکات کو حرام ٹھہرایا ہے۔ عقاید کے باب میں جو درجہ شرک کا ہے اخلاق کے باب میں وہی درجہ زنا کا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان تمام رخنوں کو بڑی احتیاط اور بڑی شدت سے بند کیا ہے جو کسی پہلو سے بھی زنا کی جرات دلانے والے ہیں لیکن موجودہ تہذیب چونکہ خالص شیطانی تہذیب ہے اس وجہ سے اس نے زنا کے تمام دروازے چوپٹ کھول دیئے ہیں اور اگر اس میں کچھ کسر رہ گئی تھی تو وہ اس خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم نے پوری کر دی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ زنا کے راستے میں قدرت نے جو سب سے بڑی رکاوٹ رکھی ہے وہ ناجائز حمل کا خوف ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ انسانوں کی عظیم تعداد کو زنا سے جو چیز بچاتی ہے وہ خدا کا خوف نہیں بلکہ سماج کا خوف ہوتا ہے۔ خدا سے

---

[1] ممکن ہے کہ تعداد کے بیان کرنے میں مجھ سے کچھ تسامح ہو رہا ہو اس لیے کہ مذکورہ اخبار کا تراشہ میرے میز سے کہیں کاغذات میں ادھر ادھر ہو گیا ہے لیکن نفس واقعہ میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں

ڈرنے والے خوش قسمت تو تھوڑے ہوتے ہیں۔ زیادہ لوگ وہ ہوتے ہیں (مردوں اور عورتوں دونوں میں) جو سماج کے سامنے ناجائز حمل کی جوابدہی کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتے۔ آگے مزید ترقی کے بعد یہ صورت حال بدل کر یورپ یا امریکہ کے معیار پر آجائیگی لیکن اسوقت تک ہمارے معاشرے کا حال یہی ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ خوف دلوں سے نکل جائے یا اس کے نکل جانے کے اسباب و وسائل لوگوں کو میسر آجائیں تو پھر ان لوگوں کے سوا جو خدا سے ڈرنے والے ہیں (اور ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے) شاید ہی کوئی شخص اپنے آپ کو اس برائی سے بچا سکے اور اس سے ہمارے معاشرے پر جو تباہی آسکتی ہے اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک خاندانی منصوبہ بندی سے جو سب سے بڑا نقصان پہنچ رہا ہے وہ یہی ہے کہ اس نے خوف خدا سے خالی لوگوں کو زنا کے لئے گویا لائسنس دے دیا ہے۔ ایک دیہات میں مجھ سے کچھ نوجوان ملے اور انہوں نے مجھے بعض وہ اسلحہ دکھائے جو نسل انسانی کے خلاف اس خاندانی منصوبہ بندی کی جنگ صلیبی میں استعمال ہو رہے ہیں۔ ان نوجوانوں نے مجھے بتایا کہ یہ میگزین ان کو خاندانی منصوبہ بندی کے کارفرما ڈاکٹر صاحب کے ذریعہ سے بالکل مفت فراہم کی گئی ہے۔ یہ نوجوان دل دل میں تو اس مانگی مراد کے ملنے پر شاید خوش رہے ہوں گے لیکن میرے سامنے انہوں نے یہی کہا کہ "ابھی تو ہماری شادیاں بھی نہیں ہوئی ہیں، بھلا یہ چیزیں ہمارے کس کام آنے والی ہیں!" میں نے ان سے کہا، بھولے بچو! تم نے ڈاکٹر صاحب کی بات سمجھی نہیں، تمہارے گاؤں میں ناجائز حمل کی وارداتیں بہت بڑھ گئی تھیں، مہربان ڈاکٹر نے یہ تمہارے لئے اس قسم کے خطرات سے تحفظ کا سامان کیا ہے۔ اس پر ایک نوجوان نے یہ چبھتا ہوا فقرہ کہا کہ "آخر کسی کو ہم غریبوں کا بھی تو خیال کرنا ہی تھا نا"۔

سو واقعہ یہی ہے کہ پہلے جو جسارتیں صرف زور آوروں تک محدود تھیں اور وہ بھی کچھ نہ کچھ جھجک محسوس کیا کرتے تھے اب ان کے خواب عام آدمی بھی دیکھنے لگے ہیں اور کیوں نہ دیکھیں جب ہماری تعلیم و تربیت نے ایک طرف تو لوگوں کے دلوں کو خوف خدا سے خالی کر دیا اور دوسری طرف فیملی پلاننگ کے اسلحہ نے ان کو سماج کی طرف سے بھی بے خوف کر دیا تو اب ڈر کس کا رہا کہ وہ کھل کھیلنے میں کوئی شرم محسوس کریں۔ پچھلے دنوں اخبارات میں امریکہ کے متعلق یہ خبر آئی تھی کہ وہاں کسی اسکول کے اتنے فیصد لڑکیوں کے بستوں سے مانع حمل گولیاں نکلیں۔ سوال یہ ہے کہ اسکولوں کی لڑکیاں ان گولیوں سے کونسا کھیل کھیلتی ہیں اور جب لڑکیوں کے کھیل کیلئے یہ کچھ اہتمام ہے تو لڑکے کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے۔ اب

ہمارے ڈاکٹر صاحب کی دماغ سے یہی دن ہمارے یہاں بھی آنے والے ہیں اور کیوں نہ آئیں جب قرآن میں کوئی چیز ڈاکٹر صاحب کو ایسی نہیں مل رہی ہے جس سے صریح طور پر یہ ثابت ہوتا ہو کہ قرآن نے ان چیزوں کی ممانعت کی ہے۔ (باقی آئندہ)

تقریظ و تنقید

تحقیقِ قربانی

تالیف : قاضی عبدالنبی کوکب | قیمت : درج نہیں۔
ناشر: مکتبۂ ابناء الاسلام ۱۹ اچیمبرلین روڈ لاہور | صفحات : ۱۹۲

شریعتِ اسلامی کے جن احکام کو ہمارے مغرب زدہ طبقہ نے ہدفِ تنقید بنایا ہے ان میں سے ایک قربانی کا حکم بھی ہے۔ قربانی کے وجوب پر اگرچہ اُمت کا اجماع ہے لیکن یہ طبقہ اس کو صرف حجاج کے لئے مخصوص قرار دینے کی کوشش میں ہے بلکہ مادیت پرستی کی رو میں بہہ کر بعض لوگوں نے تو یہ فلسفہ بھی ایجاد کر لیا ہے کہ جانور کی قربانی کا بدل اس کی قیمت کے برابر خیرات کرنے سے ہو سکتا ہے فاضل مصنّف نے زیرِ نظر کتاب میں قربانی سے متعلق تمام نصوص جمع کر کے دین میں اس کی اہمیت اور مقام کو متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اس سلسلہ میں وہ ان تمام اعتراضات کو زیرِ بحث لائے ہیں جو قربانی کے خلاف اُٹھائے جاتے ہیں۔

فاضل مصنّف نے مسئلہ کا عقلی پہلو سے بھی جائزہ لیا ہے۔ یہ بحثیں بہت مفید لیکن تشنہ معلوم ہوتی ہیں۔ جہاں کہیں معاشی نقطہ نظر سے بحث کی گئی ہے وہاں مصنّف کا بیشتر انحصار کالجوں کے نصاب کی کتب پر رہا ہے۔ حالانکہ کتاب کے معیار کو برقرار رکھنے کے لئے زیادہ مستند ذرائع پر اعتماد کرنا چاہیئے تھا۔

کتاب مجلّد ہے اس کا کاغذ اور کتابت و طباعت ناقص ہے۔ (خ - م)

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر "دفتر میثاق" رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا

اکتوبر ۱۹۵۹ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۱۰ | جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ | شمارہ ۱۰

فہرست مضامین

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:-

منیجر ماہنامہ میثاق ○ رحمانپورہ ۔ اچھرہ ۔ لاہور ۱۴

ہندوستانی خریداروں کیلئے ترسیلِ زر کا پتہ:- منیجر دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ۔ اعظم گڑھ (یو ۔ پی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اس وقت ہمارے سامنے جماعت اسلامی کا وہ دو ورقہ ہے جس میں اس نے اس اضطرار اور مجبوری کی وضاحت کی ہے جس کے تحت اس کو عورت کی امارت و صدارت از روئے شریعت حرام سمجھنے کے باوجود، محترمہ مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حمایت میں "تن، من، دھن" تینوں کے ساتھ میدانِ جہاد میں خود اترنے اور قوم کو اتارنے پر مجبور ہونا پڑا ہے۔ جماعت کے فقہائے کرام کے فتوے کے اصل الفاظ ملاحظہ ہوں:

"جب صدارت کے لئے حزبِ اختلاف کی طرف سے ایک متفقہ (؟) علیہ امیدوار کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو ہم اس پیچیدہ صورت حال سے دوچار ہو گئے کہ چار جماعتوں نے محترمہ فاطمہ جناح کو منتخب کرنے پر اتفاق کر لیا جسے قبول کرنا ان شرعی احکام کی موجودگی میں ہمارے لئے مشکل تھا جن کی رو سے کوئی عورت مسلمانوں کی امیر نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر ہم نے صدارت کے مسئلہ میں حزبِ اختلاف کے ساتھ اتفاق یا ان سے علیحدگی کا کوئی اعلان نہیں کیا تاکہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لینے اور اہل علم سے مشورہ کر لینے کے بعد کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ اب کافی غور اور مشورہ کے بعد جماعت جس نتیجے پر پہنچی وہ یہ ہے کہ شریعت میں جو چیزیں حرام ٹھہرائی گئی ہیں ان میں سے بعض کی حرمت تو ابدی اور قطعی ہے جو کسی حالت میں حلت سے تبدیل نہیں ہو سکتی اور بعض کی حرمت ایسی ہے جو شدید ضرورت

(؟) یہ متفق علیہ کی جگہ "متفقہ علیہ" بشکل تانیث محترمہ مس فاطمہ جناح کی رعایت سے ہے۔ البتہ "علیہ" کی جگہ "علیہا" ہونا تھا، یہ غالباً سہو کتابت ہے۔

کے موقع پر ضرورت کی حد تک جواز میں تبدیل ہو سکتی ہے۔ اب یہ واضح ہے کہ عورت کو امیر بنانے کی حرمت ان حرمتوں میں سے نہیں ہے جو ابدی اور قطعی ہیں بلکہ دوسری ہی قسم کی حرمتوں میں اس کا شمار ہو سکتا ہے۔"

نفس اس فتوے پر تو ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے، ہمیں جو کچھ کہنا تھا ہم بہت پہلے ہی کہہ چکے ہیں، پھر ہم اہل فتویٰ میں سے ہیں بھی نہیں، البتہ ادب کے ساتھ اتنی گذارش ہم ضرور ان حضرات سے کریں گے کہ جماعت کی طرف سے جو لٹریچر برسہا برس سے اس ملک میں فروخت ہو رہا ہے اس میں سے شاید ہی کوئی چیز ایسی ہو جس میں کسی چیز کی حلت یا حرمت پورے زور و قوت کے ساتھ زیر بحث نہ آئی ہو لیکن کسی کتاب پر بھی یہ ہدایت درج نہیں ہوتی ہے کہ اس میں بیان کردہ حلت و حرمت ابدی و قطعی ہے یا عارضی اور موقت۔ اس ابہام کے سبب سے لوگوں کو الجھنیں پیش آتی ہیں۔ ابھی کل ہی ایک صاحب ہم سے ملے اور انھوں نے ہمیں جماعت کے امیر صاحب کی تصنیف کردہ ایک کتاب دکھائی جس میں اسی مسئلہ پر بحث کی گئی ہے جس پر اس وقت جماعت کو "کافی غور و بحث اور مشورے" کے بعد ایک نتیجے پر پہنچنا پڑا ہے۔ اس میں عورت کی امارت و صدارت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں حرام ٹھہرایا گیا ہے، یہاں تک کہ حضرت عائشہؓ کے اس اقدام پر بھی تنقید کی گئی ہے جو طلب صدارت و خلافت کے لئے نہیں بلکہ صرف قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص کے لئے تھا۔ ہم نے ان دوست کو بہتیرا سمجھانے کی کوشش کی کہ ہو سکتا ہے کہ یہ ان حرمتوں میں سے ہو جو ابدی و قطعی نہ ہوں مگر ہمارے جواب سے ان کا کسی طرح اطمینان نہ ہوا۔ اس قسم کی الجھن دوسروں کو بھی پیش آسکتی ہے اس وجہ سے اگر ہمارا کوئی مشورہ یہ حضرات درخور اعتنا سمجھیں تو یہ کریں کہ اپنی تمام کتابوں پر سرخ رنگ سے یہ ہدایات لکھوا دیں کہ فلاں کتاب کس تاریخ تک قابلِ استناد رہے گی اور کس تاریخ کے بعد منسوخ سمجھی جائیگی۔ باہر کے ملکوں سے جو دوائیں اور کھانے پینے کی چیزیں شیشیوں اور بند ڈبوں میں آتی ہیں ان پر اس قسم کی ہدایات درج ہوتی ہیں جن سے لوگوں کی بڑی رہنمائی ہوتی ہے۔ اگر جماعت نے اس طریقے کو اپنا لیا تو اس سے لوگ غلط فہمیوں سے بھی محفوظ رہیں گے اور یہ اپنی ندرت اور طرفگی کے اعتبار سے بھی لٹریچر خصوصاً مذہبی لٹریچر کی تاریخ میں ایسی چیز ہوگی کہ ہماری آئندہ نسلیں اس کو جماعت اسلامی کی اولیات میں شمار کریں گی۔ اب دیکھیئے نا، جماعت کے لٹریچر میں

"پردہ" نامی ایک کتاب بھی ہے جس کو آج بھی جماعت کے سادہ لوح ارکان پڑھتے اور سر دھنتے ہوں گے حالانکہ مس فاطمہ جناح کی صدارت کے بعد وہ خاصی زائد المیعاد ہو چکی ہے ایسی طرح کی اور بھی چیزیں ہوں گی جن سے بلاوجہ لوگ الجھنوں میں پڑیں گے اور جماعت کو روزانہ روزان کے اعتراضات سے سابقہ پیش آئے گا

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ آخر یہ کیا مجبوری ہوئی کہ چار جماعتوں نے ایک حرام بات پر اتفاق کر لیا تو جماعت بھی ان میں جا شامل ہوئی ، آخر یہ راہ بھی تو جماعت کے لئے کھلی ہوئی تھی کہ اپنے موقف پر اصرار کرتی ، اگر اس میں کامیابی نہ ہوتی تو اپنے نظریہ کے مطابق کسی کو صدارت کے لئے نامزد کرتی اور اگر یہ بھی ممکن نہ تھا تو کم از کم صدارت کے قضیہ سے اپنے کو الگ ہی کر لیتی۔ لیکن یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ جماعت شامل ہوئی تھی متحدہ محاذ میں اسلام قائم کرنے اور محاذ کو اسلام کے لئے استعمال کرنے کے دعوے سے اور اس کو انگوٹھا لگانا پڑا پہلے ہی قدم پر ایک ایسی بات پر جو اس کے نزدیک حرام ہے !

ہم ایسے سوال اٹھانے والوں کو بھلا کیا جواب دے سکتے ہیں اور اصل نکتہ کس طرح سمجھا سکتے ہیں ! یہ لوگ نہ " طعنہ نایافت " کے زخم سے واقف اور نہ " اس کو نہ پا کر اپنے کو کھوانے کی لذت " سے آشنا ۔ ایسے لوگ بھلا اس " پیچیدہ صورت حال " کا اندازہ کیا کر سکتے ہیں جس سے غریب جماعت کو " دوچار ہونا پڑا " ! آخر مرزا صاحب نے کچھ سوچ کر تو کہا ہے ؏

ہاں اہل طلب کون سنے طعنہ نایافت   دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

پھر اس ایک ذرا سی بات سے آخر اس بدگمانی کے لئے جواز کہاں سے پیدا ہو گیا کہ جماعت متحدہ محاذ کی محض ایک تابع مہمل ہے ۔ دین میں " حکمت عملی " کے فنون سے لوگ واقف کہاں ہیں ۔ یہاں نفی سے اثبات نزاوش کرتا ہے اور کفر سے اسلام پیدا ہوتا ہے ۔ اس ایک حرام پر ہزاروں لاکھوں حلال تصدق کیجئے جس سے اسلام کے لئے فتوحات کے دروازے کھل جائیں ۔ لوگ سمجھیں تو درحقیقت یہ پہلی " فتح مبین " ہے جو جماعت کو حاصل ہوئی ہے اور اگر اور ذرا گہرے اتر کر دیکھیں تو اس کے جلو

ں ایک اور "فتح قریب" چھپی ہوتی ہے جو اس وقت ظاہر ہوگی جب جماعت اسلامی موجودہ قیادت
ے سب سے بڑے کفر یعنی عائلی قوانین کو توڑے گی اور اسی متحدہ محاذ کے ہاتھوں۔ ان عائلی
انین کے متعلق جو تیز و تند جذبات مولانا ہزاروی، محمود الحق عثمانی، محمود علی قصوری رکھتے ہیں۔
ں سے زمانہ واقف ہے۔ اور اس کے متعلق جو گہرے جذبات چوہدری محمد علی صاحب رکھتے ہیں
ں نظر ان سے بھی بے خبر نہیں۔ اب تو بس مس فاطمہ جناح کے صدارت پر فائز ہونے کی دیر ہے۔
ں کے صدر منتخب ہوتے ہی اس فاسقانہ قانون کی دھجیاں فضائے آسمانی میں بکھری ہوئی نظر آئیں گی،
بلاوہ اس فاسقانہ قانون کو ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا کرنے والی ہیں!

پھر اعتراض کرنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ آخر ایک " عارضی حرام " کو اختیار کر کے جماعت
نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟ اگر کچھ بگاڑا ہے تو شریعت کا بگاڑا ہے اور وہ بھی شریعت ہی کی خاطر۔
ر کیا شریعت میں سارے تصرفات کرنے کا اختیار صرف ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب اور پرویز
احب ہی کو حاصل ہے؟ جماعت اور اس کے امیر کا شریعت پر کوئی حق ہی نہیں! ابھی کل
لٹر فضل الرحمٰن صاحب نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے انگریزی پرچے "اُمّہ" میں
اسلام میں عورت کا مقام" کے عنوان سے مضمون لکھا جس میں یہ ثابت کیا ہے کہ قرآن میں جو
یں عورت کے مقابل میں مرد کی بالاتری ثابت کرنے والی ہیں ان کا تعلق صرف اس زمانے کی سوسائٹی
ے تھا جب قرآن نازل ہوا۔ گویا ان کے نزدیک بھی عورت کی صدارت و امارت کی حرمت ابدی نہیں
نت ہے۔ یہی باتیں پرویز صاحب کہتے ہیں۔ سب لوگ سنتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ اب
ر یہی بات جماعت نے کہہ دی تو آخر کیا قیامت ٹوٹ پڑی اور ارباب اقتدار سے لے کر علماء تک
ب کو پتنگے کیوں چڑھ گئے؟

عورت اور عورت میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام میں عورت کی امارت و
مدارت جائز نہیں لیکن کیا وہی قانون قائد اعظم کی بہن پر بھی لاگو ہوگا جو عام عورتوں کے لئے ہے۔
سلام میں خلیفہ اور امیر کے لئے جو شرطیں ہیں وہ تمام شرطیں ان میں موجود ہیں بس اگر کوئی کسر ہے

توبہ کہ وہ ایک عورت ہیں۔ سوانئی بسی کسر بھی کوئی کسر ہے۔ ہمارے نزدیک جماعت کا یہ فیصلہ انتہائی اطمینان بخش اور شریعت میں بصیرت پیدا کرنے والا ہے لیکن ممکن ہے بعض لوگ یہ اعتراض اٹھائیں کہ جماعت کے دستور کی روشنی میں تو محترمہ فاطمہ جناح جماعت کے شرائط رکنیت کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتیں چہ جائیکہ امارت وخلافت۔ اس کا سیدھا سادا جواب ہمارے نزدیک تو یہ ہے کہ دستور لکھنے کے لئے ہوتا ہے نہ کہ حجت کرنے کے لئے۔ لیکن ممکن ہے بعض شکی لوگوں کے لئے یہ جواب تشفی بخش نہ ہو تو یہ مناسب رہے گا کہ جماعت ایک اور دو ورقے یا چھ ورقے میں وضاحت کردے کہ اس کے دستور کی جلتوں اور حرمتوں میں سے کون کون سی ابدی ہیں اور کون کون سی عارضی!

ہمیں اس دو ورقے کا سب سے زیادہ اطمینان بخش جملہ وہ محسوس ہوا ہے جس میں جماعت نے قوم کو یہ تنبیہ کی ہے کہ :-

> "جماعت یہ امر پوری طرح واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اصل شرعی قاعدہ علی حالہ قائم ہے اور موجودہ غیر معمولی حالات میں اس طرح کا کوئی فیصلہ آئندہ کے لئے نظیر نہیں بن سکتا۔"

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک ہی فقرہ فقہی معارف کا گنجینہ ہے۔ قربان ان ہستیوں کے جن کے دماغ احتیاط فی الشریعۃ کے اس مقام تک پہنچے۔

ایک تو اس سے یہ اطمینان ہوا کہ ہر ایرے غیرے یہ دروازہ نہ کھول سکے گا۔ صرف جماعت ہی عندالضرورت اس کو کھولے گی اور وہی بند کرے گی اس لئے کہ وہی جان سکتی ہے کہ کب حالات غیر معمولی ہیں اور کب معمولی۔

دوسرے یہ کہ اس میں عورتوں کو بھی ذرا چشم نمائی ہے کہ وہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ بس اب ان کو امارت اور صدارت کیلئے چھوٹ حاصل ہو گئی۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے مردوں کے دوش بدوش پھرنے اور ان کے مقابلہ کے لئے آزاد ہو گئیں۔ جی نہیں " اصل شرعی قاعدہ علی حالہ قائم ہے" جماعت حسب محسوس کرے گی کہ اب حالات معمول پہ آگئے ہیں یا ایسے غیر معمولی نہیں رہ گئے ہیں کہ عورتوں کی سربراہی کے بغیر مسائل حل نہ ہو سکیں تو پھر وہ سب کو ہانک کر گھروں کے اندر بند کر کے رہے گی!

یہ نکتہ بھی اسی دو ورقے سے ہم پر کھلا کہ اگر مشکلات میں پھنس جانے کی وجہ سے آدمی کسی رام چیز کے اختیار کرنے پر مجبور ہو جائے تو پھر بے دلی یا نیم دلی کے ساتھ اس کو اختیار نہ کرے س کا نتیجہ نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ ایسے حالات کے لئے صحیح طریقہ ہے کہ اس کے پیچھے اپنا تن، من، دھن سب قربان کر دے اور اسی قربانی کی دعوت دوسروں بھی دے۔ غور کیجئے کہ یہ رہنمائی دے کہ جماعت نے امت کو کیسے مخمصے سے نکالا ہے۔ اوّل لوگ نہ جانے کتنی عارضی حرمتوں کو ابدی حرمتوں کا درجہ دیئے بیٹھے تھے پھر کبھی ذرا دیر کو کسی حرمت اروازہ کھولتے بھی تھے تو سامنے "غیر باغ ولا عاد" کا نوٹس لگا ہوا نظر آتا تھا کہ "نہ دل سے اہو، نہ ضرورت کی حد سے آگے بڑھو" ع

ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را!

جب یہی پابندی لگائی تھی تو آخر حرام کے جائز کرنے کا فائدہ ہی کیا ہوا؟ خنزیر و خمر سے آلودہ ی ہوتے اور بھوکے بھی اُٹھے۔ آخر اس گناہِ بے لذت کا حاصل! نیکی کیجئے یا گناہ، جو کیجئے سو ہو کر کیجئے اور اس کے لئے تن، من، دھن سب قربان کر دیجئے اور اسی قربانی کے لئے وسروں کو بھی للکاریئے۔ یہ کیا کہ

منہ پھیر کر اِدھر کو، اُدھر کو بڑھا کے ہاتھ!

بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ جماعت کو یہ افتاد جو پیش آئی اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے بیک وقت ہوریت اور اسلام دو دو رقیبوں کو امید دلا رکھی تھی۔ جمہوریت عورت کو حکومت کے ہر منصب ا حقدار قرار دیتی ہے برعکس اس کے اسلام اس کو گھر در کا بنانا چاہتا ہے۔ بالآخر اس سوال نے جماعت و اس موڑ پر پہنچا دیا جہاں اس کو فیصلہ کرنا پڑا کہ اب وہ جمہوریت کا ساتھ دے یا اسلام کا اور اس رح مجبور ہو کر اُسے قوی حریف کے پیچھے جانا پڑا۔ لوگ یہ بات جماعت کو مجرم ٹھہرانے کے لئے کہتے ہیں لیکن ہمیں اس میں جماعت کا کوئی قصور نظر نہیں آتا۔ اگر جماعت نے بیک وقت سلام اور جمہوریت دونوں کو پیار کیا تو کیا یہ کوئی گناہ ہوا؟ چپڑی اور دو دو کون نہیں چاہتا! اگر اسلام سے ذرا اسے تغافل برتنا پڑا تو اس سے بھی کیا بگڑ گیا؟ اسلام اس کے آگے نہ سہی اس نے اس کو اپنے

پیچھے تو اب بھی لگا رکھا ہے! آخر جماعت کو کیا پتہ تھا کہ پاکستان میں جمہوریت اتنی ترقی کر چکی ہے کہ مس فاطمہ جناح اتنی جلدی صدارت کے لئے حوصلہ کر لیں گی اور جماعت کی دوہری عشقبازی کا کھیل بگڑ جائے گا۔ لیکن اگر کھیل بگڑ گیا تو اس پر ہنسیئے کیوں؟ اگر اسلام اور جمہوریت دونوں کی بہاریں بیک وقت ہمارے خزاں دیدہ چمن میں آجائیں تو کیا اس کے سارے مزے تنہا جماعت ہی لوٹتی، آخر ہم اور آپ بھی تو ان کی برکات میں سے کچھ نہ کچھ حصہ پاتے ہی!!

بعض لوگ جماعت کے خلاف یہ دلیل بھی لا رہے ہیں کہ قرآن اور حدیث اور فقہ کے تمام ائمہ یہاں تک کہ شیعہ بھی عورت کی امامت و امارت کے خلاف ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دنیا جہان خلاف ہے تو ہوا کرے، آخر جماعت کے پاس بھی تو کچھ علما ہیں جن سے اس نے مشورہ کیا ہے۔ آپ ان کے نام پوچھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ آپ کو پیڑ گننے سے مطلب ہے یا پھل کھانے سے۔ ہم نے تو سنا ہے کہ جماعت کو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا بھی کوئی فتویٰ ہاتھ لگا ہے اور جماعت کے اس تازہ فیصلے کی بنیاد اُسی فتوے پر ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو ہم اس پر جماعت کو مبارک باد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس بات پر مبارک باد نہیں کہ اس کو ایک نظیر حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی بلکہ جماعت کی حق کوشی، حق طلبی اور حق پرستی پر کہ باوجودیکہ جماعت کے پاس اس کے اپنے امیر کی لکھی ہوئی درجنوں کتابیں اور رسالے عورت کی صدارت کی حرمت پر موجود ہیں اور جماعت ان کو عین دین سمجھ کر فروخت بھی کرتی ہے لیکن مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حرمت کے معاملے میں اس نے کسی پر اعتماد نہیں کیا۔ اعتماد کیا تو مولانا ابوالکلام آزاد پر۔ مومن کی شان حق کے معاملے میں یہی ہونی چاہیئے۔ جہاں سے حق ملے اس کو لے۔ لوگ جماعت کو طعنہ دیتے تھے کہ اس جماعت کے افراد اپنے امیر کے سوا کسی کو دین میں کوئی درجہ نہیں دیتے۔ کیا اب بھی اس شبہے کے لئے گنجائش باقی رہی! ان بیچاروں کی ہدایت طلبی کا عالم تو یہ ہے کہ اپنے گھر کے گیس کے ہنڈوں اور بجلی کے قمقموں کو چھوڑ کر مولانا آزاد کے مزار تک پہنچ گئے اور اس کے چراغِ کُشتہ سے بھی استفادہ سے دریغ نہ کیا۔

ایک دوست نے خوب بات کہی۔ انہوں نے کہا، لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مس فاطمہ جناح کی

صدارت کی حمایت کا فتویٰ قرآن کی تحریف ہے لیکن کیا صدر ایوب نے عائلی قوانین نافذ کر کے قرآن کی تحریف نہیں کی؟ تو پھر اگر مس فاطمہ جناح کی صدارت ناجائز ہے تو ایوب صاحب کی صدارت کہاں سے جائز ہوئی؟ ہم نے کہا آپ کا موقف درست ہے۔ تحریف کا توڑ تحریف ہی سے ہو سکتا ہے، آہن با آہن تو ان کرو نرم۔ آخر دوسرے کے باطل کے مقابل میں خواہ مخواہ آپ اپنا حق کیوں ضائع کریں؟ آپ اعلان کر دیں کہ ہم باطل کے مقابل میں حق کے استعمال کا تجربہ برسوں کر چکے اس سے کچھ نہیں بنا بنایا، اب ہم ہر اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ یہ زمانہ نیکی کا نہیں ہے۔ آپ بدی کا جواب نیکی سے اور باطل کا ابطال حق سے کرتے رہے تو لوگ دلیر ہوں گے۔ بُروں سے سابقہ ہو تو مجبوراً کپڑے اتارنے ہی پڑتے ہیں۔ انبیاء کے اسوہ میں اس کی نظیر نہ ملے تو اس کا بھی غم نہ کیجئے۔ صدر ایوب کون سے اسوہ انبیا کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور جب قرآن و حدیث کی حرمت ابدی نہیں تو آخر اسوہ انبیا کو کیا ایسے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ بدل نہ سکے!

اس دو ورقے میں جماعت نے وہ ارضی و سماوی آفتیں بھی گنائی ہیں جو صدر ایوب کے ہاتھوں، مذہب، ملک، معاش، معیشت، تہذیب اور تمدن پر نازل ہوئی ہیں اور ساتھ ہی قوم کو یقین دلایا ہے کہ ان سب کا مداوا اگر کوئی ہے تو متحدہ محاذ اور محترمہ مس فاطمہ جناح کی کامیابی میں ہے۔ یہ حصہ اس کا غایت درجہ اہم ہے۔ اس لئے کہ اسی کے اندر جماعت اسلامی کی وہ "موعودہ آسمانی بادشاہت" پوشیدہ ہے جس کی وہ ربع صدی سے منادی کر رہی ہے۔ چونکہ اس کے ظہور کے آثار اب شروع ہو گئے ہیں اس وجہ سے ضرورت ہے کہ لوگ اس کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ انشاء اللہ اگلے شمارے میں اس آسمانی بادشاہت کا تذکرہ ہو گا۔

(۲)

پچھلے شمارے میں جگہ نہ نکلنے کے باعث حلقہ تدبر قرآن، تفسیر اور میثاق کی رفتار ترقی سے متعلق کوئی اطلاع نہ دی جا سکی۔ بعض مخلصین چاہتے ہیں کہ ان تینوں ہی چیزوں سے متعلق انہیں برابر آگاہ رکھا جائے۔

حلقہ تدبر قرآن کے پہلے گروپ نے الحمدللہ مسلم شریف ختم کر لی اور اب وہ فقہ پر کام شروع

کر رہا ہے۔ ہزار ہا احادیث رسولؐ کے اس مجموعے کو سبقاً سبقاً پڑھ کر جو فائدہ رفقاء کو پہنچا ہے اس کا صحیح اندازہ تو رفقاء کو ہوگا، اس عظیم کتاب کو پڑھا کر اس گنہگار کو جو نفع پہنچا ہے وہ اتنا ہے کہ میں کبھی اس نعمت کے شکر کے حق سے فارغ نہ ہو سکوں گا۔ میری خواہش تھی کہ اس کے ختم کے موقع پر اپنے بعض مخدوم اور بعض دوست علماء کو دعوت دوں گا تاکہ رفقاء ان کی دعاؤں اور نصیحتوں سے بھی فائدہ اٹھا سکیں اور ان کی موجودگی میں اس طریقہ کار کی افادیت کا بھی جائزہ لیا جا سکے۔ لیکن بعض وجوہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔ لیکن یہ چیز میرے ذہن سے نکلی نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو حجۃ اللہ البالغہ کے ختم ہونے پر، جو اس سلسلے کا آخری کام ہوگا، اس تقریب کی نوبت آئے گی۔ اس وقت اس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی ہو سکے گا اور میں اپنے تجربات بھی زیادہ وضاحت اور زیادہ اعتماد کے ساتھ پیش کر سکوں گا۔

ہمارے مخلصین میں سے سردار محمد اجمل خاں صاحب لغاری اور بشیر احمد صاحب (لائلپور) حلقہ کے مستقل معاونین میں شامل ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

تفسیر تدبر قرآن کی پہلی جلد بفضل خدا تکمیل کو پہنچی، صفحات آٹھ نو سو کے درمیان ہوں گے۔ ابھی طباعت کا معاملہ زیر غور ہے۔ عام معیار کی طباعت پر بھی آٹھ نو ہزار کی لاگت کا اندازہ ہے جس کی ہمت بہر حال ہر شخص نہیں کر سکتا لیکن اس وقت تو آفسیٹ کی چھپائی کی مقبولیت نے مسئلے کو اور بھی پیچیدہ کر دیا ہے۔ میرے ذاتی حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں اس کی ہمت کر سکوں۔ دیکھئے کارفرمائے غیب اس کے لئے کیا سامان پیدا کرتا ہے۔ میں اس کے لئے بہت اعلیٰ معیار طباعت کا تو خواہشمند نہیں ہوں لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ کتاب دیکھنے میں بے وقعت نظر آئے۔ بعض لوگوں نے رائے دی ہے کہ پارے پارے کی الگ الگ چھاپ دی جائے لیکن یہ صورت مجھے منظور نہیں اس کی اصلی خوبی اس کے نظام ہی میں ہے اور اس کو الگ الگ پاروں کی شکل میں قائم رکھنا ممکن نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے رائے دی ہے کہ اس کے قدر دانوں سے پیشگی ہدیے بھیجنے کا اعلان کر دیا جائے لیکن یہ بھی مجھے پسند نہیں ہے۔ زندگی اور موت پر کسے اختیار ہے؟ میں کسی کی امانت کا بوجھ اپنے سر پر لادنا نہیں چاہتا۔ جن دوستوں نے اس کی طباعت کا ارادہ ظاہر کیا تھا ان کے آخری فیصلے کا انتظار ہے۔ اگر انہوں نے زحمت کا احساس کیا تو پھر جو شکل رب کو منظور ہوگی وہ

اختیار کی جائے گی۔

بعض دوستوں کی خواہش ہے کہ تفسیر سے متعلق اہل علم کی جو رائیں وقتاً فوقتاً موصول ہوتی ہیں وہ میثاق میں چھاپ دی جائیں لیکن ابھی میرا دل اس بات پر مطمئن نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ اس ناچیز خدمت کے متعلق جو رائے بھی قائم کریں خود کتاب کے مغز و مواد کو سامنے رکھ کر قائم کریں۔ ویسے میں نے بعض مخدوم بزرگوں سے ان کے گرامی ناموں کی اشاعت کی اجازت لے لی ہے۔ پچھلے دنوں ایک والا نامہ مخدومی مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی مدظلہ کا بھی اس تفسیر کے متعلق موصول ہوا ہے جس کی اشاعت کی بھی اجازت انہوں نے مرحمت فرما دی ہے۔ مولانا کا گرامی نامہ دو پہلوؤں سے میرے لئے باعثِ سرافرازی و حوصلہ افزائی ہوا۔ ایک تو اس پہلو سے کہ ان کی محبت اور شفقت میں نے اپنے مرحوم استاذ و مربی مولانا عبدالرحمٰن نگرامی سے وراثت میں پائی ہے اس وجہ سے ان کی ہر تحسین میرا حوصلہ بڑھاتی اور ہر تنقید میری رہنمائی کرتی ہے۔ دوسرے اس پہلو سے کہ اس وقت وہ پاک و ہند دونوں میں قرآن کے سب سے بڑے خادم ہیں۔ انہوں نے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں قرآن کی مکمل تفسیر لکھی ہے۔

میثاق کی صورتِ حال یہ ہے کہ اس کی توسیع اشاعت کے لئے جو اپیل کی گئی تھی اس کا کچھ خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔ البتہ اس کے بعض مستقل معاونین اور بعض نئے معاونین نے اپنی معاونت سے رکی ہوئی گاڑی کو پھر چلا دیا۔ اس سلسلے میں ہم سردار محمد اجمل خاں صاحب، بشیر احمد صاحب، چوہدری نیاز علی خاں صاحب، میاں محمد اسلم صاحب اور عزیزی نثار فاطمہ سلمہا کے شکر گزار ہیں کہ بعض نے نقد سے، بعض نے خریداروں سے، بعض نے ہنگامی اور بعض نے مستقل اعانت سے حوصلہ افزائی کی لیکن یہ وہی مشکل ہے جو شروع سے چل رہی ہے۔ اور اس سے میں کچھ گھبرا سا گیا ہوں۔ میں پھر توجہ دلاتا ہوں کہ اس کے قدرداں حضرات دین دوست اور علم دوست حلقوں میں اس کے خریدار پیدا کریں یہ رسالہ میرا خاصا وقت لے لیتا ہے۔ اب اسی شمارے کو دیکھئے اس میں تقریباً سارے ہی مضامین میرے ہیں۔ میں یہ دردِ سر اسی لئے خریدتا ہوں کہ یہ خیالات لوگوں تک پہنچ سکیں۔ اگر یہ چیز پیش نظر نہ ہو تو میری علمی دلچسپی کے لئے تو تفسیر اور حلقہ تدبر قرآن کافی ہے۔

(۴۲)

تفسیر سورہ بقرہ

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَا أَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ ۝ ۲۶۳

یہاں اگرچہ صرف "اذی" (دل آزاری) کا ذکر ہوا احسان جتانے کا ذکر نہیں ہوا لیکن ظاہر ہے کہ مراد دونوں ہی باتیں ہیں۔ ایک کے حذف کر دینے کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ یہ درحقیقت ایک ہی کردار کے دو پہلو ہیں۔ جہاں احسان جتانا ہے وہاں ایذا ہے، جہاں ایذا ہے وہاں احسان جتانا بھی ہے۔

فرمایا کہ دلداری کا ایک کلمہ اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ سائلوں اور محتاجوں سے اچھے انداز میں بات کرنے اور ان کے غلط رویہ سے درگزر کرنے کی ہدایت قرآن میں بار بار ہوئی ہے۔ اس کے وجوہ پر ہم اسی سورہ کی آیت ۸۳ کے تحت تفصیل کے ساتھ نظائر قرآن کی روشنی میں بحث کر چکے ہیں۔ آدمی میں اگر غنا کے ساتھ حلم نہ ہو تو وہ انفاق کا حق ادا نہیں کر سکتا اگر وہ انفاق کرتا بھی ہے تو بسا اوقات ثواب کمانے کے بجائے الٹا اس سے گناہ کما لیتا ہے جن کے پاس مال ہوتا ہے ان کے اندر عموماً ایک احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اس وجہ سے وہ محتاجوں اور سائلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اکثر مانگنے والوں کو جھڑک دیتے ہیں۔ بعض اوقات سائلوں کا رویہ بھی کچھ ناگوار ہوتا ہے جو تنگ مزاج مالداروں کے پارے کو اور بھی گرم کر دیتا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ اصلی مستحقین کو اس لئے نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کسی صحیح یا غلط بنیاد پر ان کو ان سے شکایت ہوتی ہے۔ یہ تمام خرابیاں اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ اکثر مالداروں کے پاس

مال تو ہوتا ہے لیکن ان کے مال کی نسبت سے ان کے اندر عفو و درگزر کی صفت نہیں ہوتی۔ قرآن نے اسی بنیاد پر جہاں انفاق کی تاکید کی ہے وہاں اس صفت کی بھی تاکید کی ہے۔ اس کے بغیر کوئی انفاق احسان کا درجہ حاصل نہیں کرتا۔ آل عمران کی ایک آیت ملاحظہ ہو

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۱۳۴ آل عمران (جو خرچ کرتے ہیں خوش حالی اور تنگ دستی میں اور غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگذر کرنے والے ہیں۔ یہی لوگ خوب کار ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے)

یہاں غنی وحلیم کی صفات کے حوالے میں ایک پہلو تو یہ ہے کہ اللہ چونکہ غنی کے ساتھ ساتھ حلیم بھی ہے اس وجہ سے اپنے بندوں کی تمام کوتاہیوں اور نافرمانیوں کے باوجود ان کو اپنے جود و کرم سے نوازتا رہتا ہے۔ اگر وہ بندوں کی کوتاہیوں پر ان کو اپنے فضل سے محروم کر دیا کرے تو کون ہے جو کسی فضل کا مستحق قرار پا سکے۔ یہ اس غنی کا حلم ہی ہے جس کی بدولت نیکوکار اور گنہگار سب اس کے خزانے سے رزق پا رہے ہیں۔ جب اس کی صفات یہ ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ انہی صفات کا عکس اس کے بندوں کے اندر بھی نمایاں ہو۔ یعنی جن کو اس نے غنی بنایا ہے، ان کے اندر ان کے غنا کے بقدر بردباری بھی ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ غریبوں کی آستینوں کے اندر سے جو ہاتھ مالداروں کے سامنے پھیلتا ہے وہ، جیسا کہ مشہور حدیث قدسی میں وارد ہے، درحقیقت خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اس وجہ سے اس ہاتھ کی تحقیر کرنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ وہ جس ہاتھ کو رد کر رہے ہیں یہ درپردہ اسی غنی کا ہاتھ ہے جس کے ہاتھ سے انہوں نے سب کچھ پایا ہے۔ اگر ان کی طرف سے اس طرز عمل کے باوجود بھی وہ ان سے درگزر فرماتا ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حلیم ہے۔ ورنہ حق تو یہ تھا کہ ایسے ناشکرے لوگ خدا کی ہر نعمت سے محروم کر دیئے جاتے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُہٗ کَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْہِ تُرَابٌ فَاَصَابَہٗ وَابِلٌ فَتَرَکَہٗ صَلْدًا لَا یَقْدِرُوْنَ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ

الْكَافِرِيْنَ۝۲۶۴ـ

صفوان: 'صفوان' کے معنی چکنے پتھر یا چکنی چٹان کے ہیں۔

وابل: وابل کے معنی ہیں زور کی بارش۔ زور کا دو نگڑا۔

صلد: 'صلد' کے معنی سخت اور چکنی چیز کے ہیں۔ 'ارض صلد یا مکان صلد' اس زمین کو کہیں گے جہاں کوئی چیز اُگتی نہ ہو۔ راس صلد ایسے سر کو کہیں گے جس پر بال نہ اگتے ہوں۔

تمثیل کی نوعیت اور صورت: پہاڑوں پر بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی بڑی چٹان پر ادھر ادھر سے مٹی آکر جم جاتی ہے جس سے ایک موٹی تہ بن جاتی ہے۔ کسان بعض اوقات اس کو زرخیز پاکر اس پر کھیتی شروع کر دیتے۔ اس قسم کی زمینوں کو کبھی کبھی یہ خطرناک صورت پیش آتی ہے کہ پہاڑ کے بالائی حصے میں زور کی بارش ہوئی اور اس کا ریلا جو آیا تو اس نے ساری مٹی والی سطح وادی کی طرف پھسلا دی اور نیچے صرف سخت چٹان رہ گئی۔ پہاڑی علاقوں سے اس قسم کے حوادث کی اطلاعات اخبارات میں وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں۔ اس کو (LANDSLIDE) کہتے ہیں۔ یہاں تمثیل میں یہی صورت مدنظر ہے۔

فرمایا کہ جو لوگ انفاق کر کے احسان جتاتے یا دل آزاری کرتے ہیں ان کی خیرات بالکل اکارت جاتی ہے، آخرت میں ان کو اس کا کوئی اجر و ثواب نہیں ملے گا۔ ایمان پر ہونے کے باوجود ان کا یہ عمل اسی طرح ضائع ہو جائے گا جس طرح اس شخص کا عمل ضائع ہو جائے گا جو محض دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس سے احسان جتانے اور ایذا دینے کی غایت درجہ سنگینی واضح ہوتی ہے کہ آدمی کے انفاق کو برباد کر دینے کے معاملے میں یہ باتیں بالکل کفر کے برابر ہیں۔

ایسے شخص کی تمثیل اس کسان سے دی ہے جس نے اپنی فصل ایک ایسی زمین پر بوئی جس کے نیچے سخت اور چکنی چٹان تھی۔ بارش کا جو ایک زور کا دو نگڑا پڑا تو اوپر کی ساری مٹی فصل سمیت وادی میں بہ گئی اور نیچے سے گنجے سر کے مانند چٹان نکل آئی۔ فرمایا کہ جس طرح اس محروم القسمت کسان کی ساری محنت رائگاں چلی جاتی ہے اسی طرح اس خیرات کرنے والے کی خیرات برباد ہو کر رہ جاتی ہے جو خیرات کرنے کے بعد احسان جتاتا یا دل آزاری کرتا ہے۔ فرمایا کہ ایسے لوگ اپنی ساری خیر خیرات ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اس کا کوئی حصہ بھی وہ بچا نہیں پاتے۔

ہدایت کی مختلف قسمیں

"وَاللّٰہُ لَا یَہْدِیْ الآیۃ" میں جس ہدایت کا ذکر ہے وہ غایت و مقصود کی ہدایت ہے۔ ہم کہیں بیان کر آئے ہیں کہ ہدایت کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک ہدایت جبلت و فطرت ہے کی ہدایت جو سب حیوانات اور اور انسانوں کو عطا ہوتی ہے۔ ایک ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ بندوں کو ان کی تدبیروں اور کوششوں میں بخشتا ہے جس سے وہ کسی کوشش میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایک ہدایت وہ ہے جو انبیاء اور شرائع کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے اور جس سے بندہ قبول حق کی توفیق پاتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک وہ ہدایت ہے جو آخرت میں حاصل ہوگی جس سے بندے اپنی کوششوں کے آخری ثمرات و نتائج کی طرف رہنمائی حاصل کریں گے۔ ہدایت کا لفظ قرآن میں ان تمام مقاصد کے لئے استعمال ہوا ہے۔ آیت زیر بحث میں یہ لفظ ہمارے نزدیک اسی آخری معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو کافر اور ناشکرے لوگ ہیں وہ اپنے اعمال میں بامراد نہ ہوں گے بلکہ ان کے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

تثبیت کا مفہوم

"تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِہِمْ" تثبیت کے معنی مضبوط کرنے، جمانے اور مستحکم کرنے کے ہیں۔ یعنی وہ اپنے مال خدا کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اس مقصد سے بھی خرچ کرتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے نفس کی تربیت کریں کہ وہ دین کے احکام کی تعمیل میں اچھی طرح پختہ ہو جائے۔ مِنْ یہاں گویا تَثْبِیْتًا کے مفعول پر داخل ہے۔

انفاق تربیت نفس کا ذریعہ ہے

جس طرح روزے سے مقصود نفس کی تربیت ہے کہ آدمی تقویٰ کے مطالبات پورے کرنے کے لئے اچھی طرح مضبوط ہو جائے اسی طرح انفاق بھی ایک ریاضت ہے جس سے انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے اور خدا کے قرب کی راہ اس کے لئے آسان ہوتی ہے۔ اس لئے ایک طرف تو یہ بات نکلی کہ تمام دوسری عبادات کی طرح انفاق کا حقیقی فائدہ بھی خدا کی طرف نہیں بلکہ بندے ہی کی طرف لوٹتا ہے۔ دوسری طرف یہ کہ سب سے اعلیٰ انفاق وہ ہے جو قحط کے زمانے میں ہو، جو غربت کے باوجود ہو، جو اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے ہو، جو عزیز و محبوب مال میں سے ہو اور خاص طور پر ان لوگوں کے لئے ہو جن سے آدمی کا دل خوش نہ ہو۔

ربوۃ کی تحقیق

تمثیل اس انفاق کی جو رضائے الٰہی کے لئے ہو

اس لئے کہ یہی انفاق ہے جس سے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کی حقیقی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو خواہشاتِ نفس کے خلاف چلانے میں جتنا مشاق ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے لئے خدا کا قرب حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ شاید اسی پہلو سے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "تو اپنا مال اپنے خداوند کے پاس رکھ اس لئے کہ جہاں تیرا مال رہے گا وہیں تیرا دل بھی رہیگا"

'ربوۃ' کے معنی بلند و مرتفع زمین کے ہیں۔ استعمالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرتفع ہونے کے ساتھ ساتھ مسطح اور ہموار ہونا بھی اس کی خصوصیات میں سے ہے۔ قرآن میں اس کی صفت ایک دوسرے مقام میں ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ (۵۰ مومنون) آئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بلندی کے ساتھ ہمواری بھی اس کے لوازم میں سے ہے۔ بلند اور ہموار زمین کے لئے آب و ہوا کی خوشگواری ایک مسلم شے ہے۔ اگر ایسی زمین پر باغ ہو تو اس کی بلندی ایک طرف تو اس کی خوش منظری کا باعث ہوتی ہے، دوسری طرف اس کو سیلاب وغیرہ سے محفوظ کرتی ہے۔ نیز ہموار زمین پر ہونے کے سبب سے اس کے لئے اس طرح پھسل کر فنا ہو جانے کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا جو ڈھلوان زمینوں کے باغوں اور فصلوں کے لئے ہوتا ہے پھر آب و ہوا کی خوبی اسکی بارآوری کی ضامن ہوتی ہے۔ اگر موسم سازگار رہا تو پوچھنا ہی کیا ہے، اگر سازگار نہ ہوا جب بھی وہ پھل دے جاتا ہے۔

یہ اوپر والے گروہ کے بالمقابل ان لوگوں کے انفاق کی تمثیل ہے جو اپنے مال اللہ کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لئے خرچ کرتے ہیں۔ فرمایا یہ لوگ بلاشبہ اپنے انفاق کا اجر پائیں گے۔ انہوں نے بہ جانے والی زمین پر باغ لگانے کے بجائے ایسی بلند، مسطح اور اچھی آب و ہوا والی زمین پر اپنا باغ لگایا ہے کہ بارش ہو تو اس کو برباد کرنے کے بجائے اس کی بارآوری کو دوگنا کر دیتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو ہلکی پھوار بھی آب و ہوا کی خوبی کی وجہ سے اس کے لئے کفایت کر جاتی ہے۔

'وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ' تسکین و تسلی کے لئے ہے۔ یعنی اللہ کے نیک بندے اس کی رضا جوئی اور اپنے نفس کی تربیت کے لئے جو ریاض کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے بے خبر نہیں ہے وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنے ہر بندے کو اس کی محنت اور اس کے ایثار کا پورا پورا بدلہ دیگا۔

اَیَوَدُّ اَحَدُکُمْ اَنْ تَکُوْنَ لَہٗ جَنَّۃٌ مِّنْ نَّخِیْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْہٰرُ لَہٗ

فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاۤءُ ۖ فَاَصَابَهَاۤ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ ۲۶۶

جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ، یہ عرب کے تصور کے مطابق ایک اچھے باغ کی تصویر ہے۔ ان کے ہاں اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ اس کے کنارے کنارے کھجوروں کے درخت ہوں، بیچ میں انگور کی بیلیں ہوں، مناسب مواقع سے مختلف فصلوں کی کاشت کے لئے قطعات ہوں، باغ بلندی پر ہو، اس کے نیچے نہر بہ رہی ہو جس کی نالیاں باغ کے اندر دوڑا دی گئی ہوں۔ قرآن نے دوسری جگہ ایک باغ کی تصویر اس طرح کھینچی ہے جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۳۳۔ (ان میں سے ایک کے لئے ہم نے انگور کے دو باغ بنائے، اور ان کو گھیر دیا کھجوروں سے اور ان کے درمیان کھیتی بھی رکھی، دونوں باغ خوب پھل لائے، ذرا کمی نہ کی، اور ہم نے ان کے درمیان ایک نہر جاری کی)۔ اس سے معلوم ہوا کہ باغ کے کناروں پر کھجوروں کے درخت ہوتے تھے تاکہ ان سے پھل بھی حاصل ہو سکے، گرمی، لو، باد تند اور تمازت آفتاب سے باغ محفوظ بھی رہ سکے اور باغ کی رونق میں بھی اضافہ ہو سکے۔ پھر بیچ بیچ میں انگور اور دوسرے پھل دار درخت بھی لگائے جاتے اور مناسب ٹکڑوں میں مختلف فصلوں کی کاشت بھی ہوتی۔ زیر بحث آیت میں لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ سے اسی آخری چیز کی طرف اشارہ ہے۔ ہم ایک دوسرے مقام میں یہ بات وضاحت سے بیان کر چکے ہیں کہ عربی میں ثمرات کا لفظ صرف میوہ جات کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ غلہ جات بھی اس میں شامل ہیں۔

"اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ" اعصار کے معنی بادگرد اور بگولے کے ہیں۔ اس کے ساتھ جس آگ کا ذکر ہے وہ ہماری معروف آگ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد سموم اور لو ہے جو بسا اوقات بادگرد کے اندر پائی جاتی ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جو باغ اس کی زد میں آجاتا ہے وہ بالکل جھلس کے رہ جاتا ہے۔

اوپر ریاکاری، احسان داری اور ایذا رسانی کی آفتوں سے اپنے انفاق کو برباد کر لینے والوں

کی تمثیل سے متعلق ہے یہ تمثیل اس کی مزید وضاحت ہے۔ اس میں یہ دکھایا ہے کہ اس طرح انفاق کرنے والے عین اس وقت اپنی امیدوں کے باغ کی بربادی کا حسرت انگیز منظر دیکھیں گے جب وہ اس کے سب سے زیادہ محتاج ہوں گے اس لئے کہ اس وقت ان کے لئے سعی و عمل کے دروازے بند ہو چکیں گے۔

یہ تمثیل ایک ایسے شخص کی ہے جس نے انگور اور کھجوروں کا باغ لگایا، اس باغ کے نیچے نہر جاری تھی جو اس کی شادابی کی ضامن تھی۔ باغ میں دوسرے مختلف قسم کے پھل بھی تھے اور اس سے ہر قسم کی اجناس بھی حاصل ہوتی تھیں۔ باغ کا مالک بوڑھا ہو گیا اور اس کے بچے سب چھوٹے چھوٹے تھے۔ اسی دوران میں ایک روز سموم کا ایک بگولا اس باغ پر گزرا اور سارا باغ تباہ ہو کر رہ گیا۔ فرمایا کہ یہی حال آخرت میں ان لوگوں کا ہو گا جو اپنے انفاق کو برباد کرنے والی آفتوں سے نہیں بچاتے۔ ان کے خرمن کے لئے بجلی خود ان کی آستینوں میں چھپی ہوئی ہوتی ہے اور وہ ٹھیک اس وقت ظاہر ہو گی جب ان کے لئے کھو کر پھر پانے کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ ۝٢٦٧

"مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ" (اپنی کمائی کے پاکیزہ حصے میں سے) میں طیبات کا لفظ بیک وقت دو باتوں کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اپنی کمائی میں سے وہی مال خرچ کرو جو پاکیزہ طریقے سے آیا ہو، غلط یا مشتبہ طریقہ سے نہ آیا ہو۔ دوسری یہ کہ مال بجائے خود اچھا ہو، بے وقعت، گھٹیا اور نکما نہ ہو۔ غلط طریقہ سے آئے ہوئے یا نکمے مال سے نہ تو خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی اور نہ نفس کی وہ تربیت ہو سکتی جس کا ذکر اوپر تثبیت کے لفظ سے ہوا ہے۔

"وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ" کا علیحدہ ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ "مَا كَسَبْتُمْ" والے ٹکڑے سے مراد وہ مال ہے جو تجارت وغیرہ کے طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ زمین کی پیداوار کے علیحدہ ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پیداوار پر زکوٰۃ کا نظام دوسرے اموال سے

بالکل مختلف ہے۔

"وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ" یعنی ناپاک اور گھٹیا مال سے بچنے کی غایت درجہ تاکید ہے۔ جس طرح "لَا تَقْرَبُوا" کا لفظ ہے کہ فلاں چیز کے پاس بھی نہ پھٹکو، اسی طرح "لَا تَيَمَّمُوا" کا مفہوم یہ ہے کہ برے مال کے دینے کا ارادہ بھی نہ کرو۔ پھر برے مال کی وضاحت بھی فرما دی کہ اس سے مراد اس طرح کا مال ہے جو خدا کی راہ میں دینے کے لئے تو تیار ہو جاؤ لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو آنکھیں میچے اور دل پر جبر کئے بغیر نہ لے سکو۔ جس چیز کو آدمی اپنے لئے پسند نہ کر سکے وہ خدا کو پیش کرنا، درآں حالیکہ سب کچھ اسی کا بخشا ہوا ہے، انتہائی دنائت کی بات ہے اور اس سے خدا کی خوشنودی یا نفس کی تربیت حاصل ہونا تو الگ رہا اس کے لئے اس سے مزید دوری و محجوری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔

خدا "غنی و حمید" ہے، یعنی اللہ کسی کے مال اور کسی کی خیرات کا محتاج نہیں، وہ اگر لوگوں سے یہ چاہتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کریں تو اس لئے نہیں کہ اس کے خزانے میں کمی ہے بلکہ اس سے لوگوں کی وفاداری کا امتحان مقصود ہے کہ دیکھے کہ لوگ اس کے بخشے ہوئے مال کو جب خود اس کو دینے کا وقت آتا ہے تو کس طرح دیتے ہیں۔ پھر "غنی" کے ساتھ "حمید" کی صفت لگائی ہے حمید کے معنی ہیں وہ ذات جو سزاوار حمد و تعریف کاموں کا منبع ہے۔ یعنی سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ اس کی ذات ستودہ صفات ہے، اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور سب اس سے فیضیاب ہوتے ہیں، نیک بھی اور بد بھی۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ۲۶۸

"فحشاء" کے معنی کھلی ہوئی بے حیائی اور بدکاری کے ہیں قرآن میں اس سے زنا، لواطت اور عریانی وغیرہ جیسے کھلے جرائم کو تعبیر کیا گیا ہے۔ "امر" کا لفظ جس طرح حکم دینے کے معنی میں آتا ہے اسی طرح مشورہ دینے اور سمجھانے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ تحقیق اس کی ہم دوسری جگہ بیان کر چکے ہیں۔

یہ ان وسوسوں کی طرف اشارہ ہے جو شیطان اور اس کی ذریات کی طرف سے انفاق کی راہ

میں پیش آتی ہیں۔ آدمی جب کسی نیک کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کو دو طرح سے اس کے ارادے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات سے اس کو ڈراتے ہیں کہ فلاں اور فلاں مشکل کام اس کے آگے پڑے ہیں اس وجہ سے وہ اپنے ہاتھ روکے رکھے، ورنہ سخت دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ دوسرے اس کو عیاشی، مے نوشی، سینما بینی اور اسراف و تبذیر کی دوسری لتوں میں پھنساتے ہیں تاکہ کسی اعلیٰ مقصد میں خرچ کرنے کے لئے کوئی گنجائش اس کے پاس باقی ہی نہ رہ جائے۔ شیطان کا فتنہ بڑا ہی سخت و شدید ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی بدمستیوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں میں سے کسی کا حق ادا کرنے کے قابل رہ ہی نہیں جاتے۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں جہاں انفاق کا حکم دیا ہے وہاں شیطان کے اس ہتھکنڈے سے بچتے رہنے کی خاص طور پر تاکید فرمائی ہے۔

وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ ۖ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا ۝	قرابت مند اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دو اور اپنے مال کو عیاشیوں میں نہ اڑاؤ، بے شک اس طرح اپنے مال کو اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔
	(۲۶-۲۷ بنی اسرائیل)

بعینہٖ یہی مضمون اسی طرح کے سیاق و سباق کے ساتھ آلِ عمران کی آیات ۱۳۴-۱۳۵، میں بیان ہوا ہے۔

"وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً وَفَضْلًا وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ" ۔ 'مغفرت' یہاں 'فحشاء' کے مقابل میں ہے اور 'فضل' کا لفظ 'فقر' کے مقابل میں ہے۔ یعنی شیطان تو تمہیں اللہ کی راہ میں انفاق کے بجائے نفس کی راہ میں فضول خرچی اور عیاشی کی راہ سجھاتا ہے تاکہ تمہیں سیدھے جہنم میں لے جائے لیکن اللہ اپنی راہ میں خرچ کی دعوت دے کر تمہیں مغفرت اور جنت کی طرف بلاتا ہے۔ اسی طرح شیطان تمہیں فقر کے ہوّے سے ڈرا کر تمہارے دل بٹھاتا ہے لیکن اللہ تم سے اس انفاق کے عوض میں دنیا اور آخرت دونوں میں اپنے بے پایاں فضل و انعام کا وعدہ

فرماتا ہے۔ اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور تمہارے ایک ایک عمل سے واقف ہے ۔ نہ اس کے پاس دینے کے لئے کمی ہے اور نہ وہ تمہارے راہِ خدا کے دیئے ہوئے کسی پیسے دھیلے سے بے خبر ہے۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

ایمان و حکمت کے خزانہ کی حیثیت

لفظ "حکمت" کی تشریح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۵۱ کے تحت کر چکے ہیں۔ یہاں اس کا دہرانا باعث طوالت ہوگا۔ البتہ اتنی بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس کی اصل روح ایمان اور عمل کی وہ پختگی ہے جس کی بنیاد گہری بصیرت پر ہو۔ جس کو یہ چیز حاصل ہوتی ہے وہ اپنا خزانہ اس دنیائے فانی ہی نہیں جمع کرتا بلکہ اپنے خدا کے پاس جمع کرتا ہے ، وہ شیطان کے ڈراوں سے نہیں ڈرتا بلکہ اپنے پروردگار کے وعدوں پر اعتماد کرتا ہے اور اس دنیا کے خزف ریزے نہیں جمع کرتا بلکہ ان کے بدلے حکمت کے خزانہ کا طالب بنتا ہے۔ اور یہ حکمت کا خزانہ بہت بڑی چیز ہے ، اتنی بڑی کہ دنیا کا کوئی خزانہ بھی اس کے آگے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ یہ خزانہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ یعنی اس کو دیتا ہے جو اس خزانے کے پانے کا استحقاق پیدا کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کا کوئی چاہنا بھی حکمت سے خالی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس کی سنت یہ ہے کہ جو اس دنیائے فانی کی لذتوں پر فریفتہ ہونے کے بجائے خدا کی مغفرت اور اس کے فضل کے حصول کے لئے اپنے مال لٹاتے ہیں وہ اس کے صلے میں اپنے دل کے خزانے حکمت کے لعل و گہر سے بھرتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ یہ بات ہر ایک کے سمجھنے کی نہیں ہے۔ اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ یعنی جن کی عقل حکمت کے نور سے منور ہے ۔ اس دنیا کی نقد لذتوں کو چھوڑ کر ایک نادیدہ عالم کی کامرانیوں کے لئے اپنی کمائی کو لٹانا انہی لوگوں کا حوصلہ ہو سکتا ہے جن کو حکمت سے بہرہ وافر ملا ہو۔

وَمَا أَنفَقْتُم مِّن نَّفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُم مِّن نَّذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُهُ ۗ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنصَارٍ ﴿٢٧٠﴾

نذر کا مفہوم

"نذر" کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی منت مانے کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہو گئی تو میں فلاں عبادت

یا ریاضت یا اتنا صدقہ کروں گا ۔ اسلام میں ، جیسا کہ احادیث سے واضح ہے ، منت ماننے کو مستحسن نہیں قرار دیا گیا ہے لیکن کوئی شخص اگر اس طرح کی منت مان بیٹھے اور اس میں کسی شرعی قباحت کا کوئی پہلو نہ ہو تو اس کو پورا کرنا ضروری قرار دیا گیا ہے ۔ اس کی وجہ ہے کہ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو منت ماننے والا اپنے رب سے کر رہا ہے اور عہد چھوٹا ہو یا بڑا اگر خلافِ شریعت نہیں ہے تو اس کو پورا کرنا ضروری ہے اس لئے کہ خدا کے ہاں ہر عہد سے متعلق ، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ، پرسش ہوتی ہے ۔ ہم سورہ مائدہ میں بتائیں گے کہ تمام شریعت اور تمام اخلاق کی بنیاد عہد ہی پر ہے اس وجہ سے اسلام نے اس پہلو میں کسی ڈھیل کو گوارا نہیں کیا ہے ۔

'فَاِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُهٗ' یہ ٹکڑا شرط کے جواب کی حیثیت رکھتا ہے ۔ یعنی جو شخص خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتا ہے یا اس کے لئے کوئی منت مانتا ہے تو وہ یہ اطمینان رکھے کہ خدا اس کی خیرات اور اس کی نذر ہر چیز کو اچھی طرح جانتا ہے ۔ 'جانتا ہے' سے مقصود اس کا لازم ہے یعنی جب وہ جانتا ہے تو لازماً وہ اس کا اپنے وعدے کے مطابق صلہ بھی دے گا ۔ زبان کا یہ اسلوب عربی زبان اور قرآن میں بہت عام ہے ۔

'وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ' ظالم سے مراد یہاں خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں ، وہ لوگ جو یا تو دولت دنیا ہی کو معبود بنائے بیٹھے ہیں ، خدا کی راہ میں سرے سے خرچ ہی نہ کرتے ، یا خرچ کرتے ہیں تو ریا ، احسان داری اور دل آزاری سے اس کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں ، فرمایا کہ ایسے لوگ بدقسمت ہیں ، ان کا سارا اعتماد انفاق و ایثار اور خدا کے فضل و رحمت کے بجائے اپنے مال اور اپنے جھوٹے معبودوں پر ہے ، یہ ان پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں حالانکہ خدا کے ہاں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا ۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ وَیُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ۲۷۱

یہاں چونکہ زیرِ بحث عام صدقات و خیرات ہیں ، صدقاتِ واجبہ نہیں ہیں جو علانیہ دیئے جاتے ہیں ، اس وجہ سے ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے یا علانیہ ؟ قرآن نے یہ اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اگر ظاہر کر کے دو تو یہ بھی اچھا ہے ، اس لئے کہ

کے بھی بعض پہلو مفید ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس سے دوسروں کو بھی انفاق کی ترغیب ہوتی ہے خاص طور پر ان مواقع میں جب کسی اجتماعی مہم کے لئے لوگوں کو ابھارنا اور شوق دلانا ہو۔ لیکن جب اس طرح کے حالات نہ ہوں تو زیادہ بہتر یہی ہے کہ پوشیدہ طور پر غریبوں کو دے دو تاکہ ریا و نمائش کے فتنے سے بھی محفوظ رہ سکو اور خوددار حاجتمندوں کی خودداری کی لاج بھی قائم رہ سکے۔ یہاں یکفر عنکم کا عطف فھو خیر لکم کے مفہوم پر ہے۔ یعنی اس پوشیدہ انفاق کا اجر بھی سوا ملے گا اور یہ تمہارے دامن سے گناہوں کو جھاڑنے میں بھی زیادہ کارگر ہوگا۔ پھر فرمایا کہ پوشیدہ اور علانیہ کا مسئلہ تمہارے لحاظ سے ہے۔ خدا کے لئے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں، تم جو کچھ بھی کرو گے جہاں بھی کرو گے جس جگہ بھی کرو گے، خدا ہر چیز سے باخبر ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۲۷۲

اس آیت میں کوئی خاص لفظ تحقیق طلب نہیں ہے۔ صرف وَمَا تُنْفِقُوْنَ الآیہ کے اسلوب کے باب میں کچھ تردد سا ہے۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ یہ خبر کے اسلوب میں انشائیہ جملہ ہے۔ عربی زبان میں یہ طریقہ معروف ہے۔ قرآن میں اس کی بہت سی نظیریں موجود ہیں کہ امر یا نہی کے مضمون کو ان مواقع میں خبریہ اسلوب میں کر دیتے ہیں جب مخاطب کو کوئی بات شفقت اور التفات خاص کے ساتھ سمجھانی ہو۔ میں نے ترجمہ میں اس کا لحاظ کیا ہے۔ پچھلوں میں سے بھی بعض لوگوں نے اس کو اختیار کیا ہے لیکن مجھے اس پر پورا پورا جزم نہیں ہے۔ اہل علم اس کو نگاہ میں رکھیں۔

پوری آیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس میں بیک وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بطریق التفات مخاطب فرمایا ہے اور عام مسلمانوں کو بھی۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے اس سنت اللہ کی یاد دہانی کی گئی ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہے اور جس کا ذکر اس سورہ میں بھی ایک سے زیادہ مقامات میں ہوا ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی مختلف اسلوبوں اور شکلوں میں ہوا ہے۔ وہ سنت اللہ یہ ہے کہ نبی کی ذمہ داری لوگوں کی ہدایت کے معاملے میں صرف یہ ہے کہ وہ اُن کو اللہ

کی تعلیمات و ہدایات سے اچھی طرح آگاہ کر دے۔ اگر یہ کام اس نے کر دیا تو اس کا فرض پورا ہو گیا۔ یہ ذمہ داری اس پر نہیں ہے کہ لوگ ان تعلیمات و ہدایات کو قبول بھی کر لیں۔ ان کو قبول کرنے کی توفیق دینا اللہ کا کام ہے اور وہ یہ توفیق ان کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس 'چاہنے' کے لئے خود اس کا مقرر کیا ہوا ایک ضابطہ ہے جس کی وضاحت ہم آیات ۲۵۶-۲۶۰ کے تحت کر چکے ہیں۔

مقصود اس سنت اللہ کی طرف اشارہ کرنے سے یہ ہے کہ در باب انفاق جو باتیں بتانی تھیں وہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بتا دیں۔ آپ کا فرض ادا ہو گیا۔ اب یہ لوگوں کا کام ہے کہ ان کو قبول کریں یا رد کریں۔ آپ اس چیز کے لئے پریشان نہ ہوں۔ اگر لوگ ان کی قدر نہ کریں گے تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتیں گے۔

مسلمانوں کو خطاب کر کے آخری تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ جو مال بھی تم خدا کی راہ میں خرچ کرو گے یہ نہ سمجھو کہ یہ کسی دوسرے کو دے رہے ہو بلکہ یہ تم اپنے ہی لئے جمع کر رہے ہو جو تمہیں سات سو گنے تک بڑھ کر ایک دن واپس ملنا ہے۔ بس یہ شرط ہے کہ تمہارا یہ خرچ کرنا اللہ کی خوشنودی کے سوا کسی اور مقصد سے نہ ہو۔ اللہ کی خوشنودی کے لئے جو کچھ خرچ کرو گے سب تمہارا پورا کر دیا جائے گا، اس میں ذرا بھی کمی نہ کی جائے گی۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۲۷۳

مستحقینِ انفاق کی صفات

'لِلْفُقَرَآءِ' سے پہلے مبتدا محذوف ہے۔ یعنی یہ صدقہ و انفاق جس کی دعوت دی جا رہی ہے ان فقراء کے لئے ہے جن کی صفات یہ ہیں۔ مبتدا کے حذف کر دینے کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ قرینہ خود اس پر دلیل ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے صدقے کے اخفا کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہو رہا ہے۔ گویا آیت نے انگلی اٹھا کر محتاجوں کی طرف تو اشارہ کر دیا لیکن یہ بات کہ کس کام کے لئے اشارہ کیا گیا ہے مخاطب کے فہم پر چھوڑ دی ہے۔ اس طرح صدقہ کے اخفا کے ساتھ ساتھ محتاجوں کی اس خودداری کی بھی آن محفوظ رہ گئی جس کی طرف آیت میں اشارہ ہوا ہے۔

'اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ' یعنی ایک دینی مقصد نے ان کو کسب معاش کی جدوجہد سے روک رکھا ہے۔ یہ لوگ تجارت وغیرہ کے لئے اِدھر اُدھر سفر نہیں کر سکتے۔ 'ضرب فی الارض' کے معنی سفر کرنے کے ہیں، مثلاً فرمایا ہے وَاٰخَرُوْنَ یَضْرِبُوْنَ فِی الْاَرْضِ یَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ، مزمل (اور کچھ دوسرے ایسے بھی ہوں گے جو فضلِ الٰہی کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے)

'یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ' جاہل کے معنی یہاں بے خبر کے ہیں اور تعفف کے معنی خودداری کے ہیں۔ یعنی یہ لوگ خودداری کے سبب سے کسی کے آگے نہ تو دستِ سوال دراز کرتے نہ اپنے فقر و فاقہ کا اظہار کرتے، اس وجہ سے جو شخص ان کے حالات سے بے خبر ہے ان کو مستغنی خیال کرتا ہے۔

'تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا' سیما کے معنی علامت اور ہیئت کے ہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔ سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کی پہچان، ان کے چہروں پر سجدوں کا نشان ہے)

(لا یسئلون الناس الحافا)

'الحاف' کے معنی لپٹ کر سوال کرنے کے ہیں۔ لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے) میں اصل مقصود سوال کرنے کی نفی ہے 'الحافا' کی قید اس کے ساتھ صرف سوال کرنے والوں کی عام حالت کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لئے لگائی ہے۔ مثلاً فرمایا ہے کہ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ مِنْ خَشْیَةِ اِمْلَاقٍ (اپنی اولاد کو فقر کے اندیشے سے قتل نہ کرو) اس میں ممانعت درحقیقت قتل کی ہے، 'مِنْ خَشْیَةِ اِمْلَاقٍ' کی قید محض اس کے گھنونے پن کو واضح تر کرنے کے لئے ہے۔ یا فرمایا ہے کہ لاتاکلوا الربوا اضعافاً مضاعفۃ (اور سود نہ کھاؤ دوگنا چوگنا کر کے) اس میں ممانعت دراصل سود کھانے کی ہے۔ اضعافاً مضاعفۃ کی قید محض اس کی کراہت کو نمایاں کرنے کے لئے ہے، یا فرمایا ہے۔ لاتکرھوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا (اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ قید نکاح میں آنا چاہتی ہیں) اس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے، ان اردن تحصنا کی قید محض اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لئے ہے۔

اسی طرح 'لَا یَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا' میں مقصود ان کے سوال کرنے کی نفی ہے 'الحافا'

کی قید محض سوال کرنے والوں کی عام حالت کے اظہار کے لئے ہے کہ بھلا جو لوگ اتنے خوددار ہیں کہ جو ان کے حال سے بے خبر ہو وہ ان کو غنی سمجھتا ہے، وہ گداگروں اور بھک منگوں کی طرح کی حرکت کس طرح کر سکتے ہیں؟ چنانچہ ان کی اسی خودداری اور پردہ داری کی وجہ سے قرآن نے اہل انفاق کو ان کا سراغ دینے کے لئے ان کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ان کو صرف چہرے بشرے سے پہچان کر ڈھونڈنے کی کوشش کرو اور ان کے پاس خود پہنچو، یہ توقع نہ رکھو کہ عام گداگروں کی طرح یہ لوگ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگیں گے۔

قرآن کے زمانہ نزول میں اس آیت کے بہترین مصداق اہل صفہ تھے اور اس میں شبہ نہیں کہ احادیث میں ان کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں وہ ٹھیک ٹھیک قرآن کے ان اشارات کے مطابق ہیں۔ قرآن نے ان آیات میں وہ نمونہ بھی دکھا دیا ہے جو باایمان فقراء کا ہونا چاہیئے اور اس طریقے کی طرف بھی رہنمائی کر دی ہے جو ان فقراء کے معاملے میں باایمان اغنیا کو اختیار کرنا چاہیئے۔ کاش آج کے فقراء اور آج کے اغنیا اس آئینہ میں اپنی شکلیں دیکھیں۔

آخر میں فرمایا کہ "جو تم خرچ کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہے" یعنی ایسے خوددار سائلوں کو تلاش کر کے چپ چپاتے اُن کی حاجت روائی کرنا خلق سے چھپا رہے گا لیکن خالق سے چھپا نہیں رہے گا، وہ تمہارے ہر انفاق سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ۲۷۴

اس آیت میں رات اور دن، پوشیدہ اور علانیہ میں جو مناسبت اور تقابل ہے وہ ملحوظ رہے۔ اوقات بھی سب احاطہ میں آگئے ہیں، اور حالتیں بھی دونوں اس میں جمع ہو گئی ہیں۔ نیز اہل ایمان کے اندر انفاق کے لئے جو جوش ہونا چاہیئے اسلوب کلام سے وہ خود بخود ابلا پڑ رہا ہے۔ علاوہ بریں انفاق کا جو خدا کے ہاں صلہ ہے وہ بھی پورا پورا بیان ہو گیا ہے۔ یہ آیت انفاق کے سلسلہ میں خاتمۂ باب کی حیثیت رکھتی ہے ◆

۸۸۔ آگے کا مضمون آیات ۲۷۵ - ۲۸۳

انفاق کے مضمون کے بعد اب آگے سود کی حرمت کا بیان ہوا۔ سود کا تعلق چونکہ قرض سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرض کے لین دین سے متعلق جو ضروری ہدایات ہیں اسی سلسلہ میں وہ بھی دی گئیں۔ رہن بھی اسی سے تعلق رکھنے والی چیز ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ اس کا حکم بھی بیان ہوا۔

سود کے متعلق یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ یہ انفاق کا بالکل ضد ہے۔ انفاق کی محرک بلند ہمتی ہمدردی، فیاضی، ایثار، رحم دلی ہے اور سود کی محرک بزدلی، خود غرضی، سنگدلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ انفاق ضرورتمندوں کو سہارا دینا چاہتا ہے اور سود گرے ہوؤں کا خون چوسنا چاہتا ہے۔ دونوں میں نسبت ضدین کی ہے اور فطرت کا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی حقیقت اس وقت تک اچھی طرح واضح نہیں ہوتی جب تک اس کے ساتھ اس کے ضد کا بیان نہ ہو۔ اسی اصول کی بنا پر قرآن نے اکثر چیزوں کے بیان میں یہ طریقہ ملحوظ رکھا ہے کہ ضدین کا ذکر ساتھ ساتھ کیا ہے۔ مثلاً اہلِ ایمان کا بیان ہے تو اس کے ساتھ اہلِ کفر کا بھی بیان ہوا ہے۔ جنت کا ذکر آیا ہے تو اکثر اس کے ساتھ دوزخ کا بھی ذکر ہوا ہے۔ یہاں تک کہ یہ چیز قرآن کے نظم کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ اسی اصول پر قرآن نے انفاق کے ساتھ اکثر یا تو بخل کا ذکر کیا ہے یا سودخواری کا۔ یہاں اس کا ذکر انفاق کے بعد آیا ہے۔ سورہ آلِ عمران آیت ۱۲۷ میں انفاق کے بیان سے پہلے ہے۔ لیکن مقصود دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ ایک کی تاریکی دوسرے کی روشنی کو اور ایک کا جمال دوسرے کی بدصورتی کو بے نقاب کر سکے۔ اس نظمِ کلام سے حکمت کے بعض ایسے گوشے آشکارا ہو جاتے ہیں جو کسی اور طریقے سے آشکارا نہیں ہو سکتے۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ
بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ
مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۷۵ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ یُرْبِی الصَّدَقٰتِ ؕ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِیْمٍ ۲۷۶

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَأَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَآتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يٰأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا
بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ ۝ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَ
إِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ أَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝ وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ
فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا
تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ يٰأَيُّهَا
الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلٰى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۚ وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ
كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ
عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ۚ فَإِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ
سَفِيْهًا أَوْ ضَعِيْفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ أَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۚ وَ
اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدٰىهُمَا الْأُخْرٰى ۚ
وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوْا ۚ وَلَا تَسْـَٔمُوْا أَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا أَوْ كَبِيْرًا إِلٰى أَجَلِهٖ ۚ
ذٰلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَأَدْنٰى أَلَّا تَرْتَابُوْا إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً
حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۚ وَأَشْهِدُوْا إِذَا
تَبَايَعْتُمْ ۚ وَلَا يُضَارَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ۚ وَإِنْ تَفْعَلُوْا فَإِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ
وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۚ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ
مَّقْبُوْضَةٌ ۚ فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ۚ
وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَإِنَّهٗ آثِمٌ قَلْبُهٗ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ ۲۸۳

ترجمہ :- جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کے مانند جس کو شیطان
نے اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی
مانند ہے اور حال یہ ہے کہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا اور سود کو حرام۔ تو جس کو اللہ کی تنبیہ پہنچی
اور وہ باز آگیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لئے ہے۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔

اور جواب اس کے مرتکب ہوں تو وہی لوگ دوزخی ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔ اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا، اور اللہ ناشکروں اور حق تلفوں کو پسند نہیں کرتا ۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے بھلے کام کئے، نماز کا اہتمام کیا، زکوٰۃ ادا کی، ان کے لئے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے ۔ نہ ان کے لئے کوئی اندیشہ ہوگا نہ ان کو کوئی غم لاحق ہوگا ۔ ۲۷۵ - ۲۷۷

اے ایمان والو، اگر تم سچے مومن ہو تو اللہ سے ڈرو اور جو سود تمہارا باقی رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو ۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لئے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم توبہ کر لو تو اصل رقم کا تمہیں حق ہے ۔ نہ تم کسی کا حق مارو، نہ تمہارا حق مارا جائے اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو فراخی تک اس کو مہلت دو اور بخش دو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم سمجھو ۔ اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو جو اس نے کمائی کی ہے پوری پوری مل جائے گی اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا ۔ ۲۷۸ - ۲۸۱

اے ایمان والو، جب تم کسی معین مدت کے لئے ادھار کا لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو ۔ اور اس کو لکھے تمہارے مابین کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ ۔ اور جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ جس طرح اللہ نے اس کو سکھایا اسی طرح وہ دوسروں کے لئے لکھنے کے کام آئے ۔ اور یہ دستاویز لکھوائے وہ جس پر حق عاید ہوتا ہے ۔ اور وہ اللہ سے، جو اس کا رب ہے، ڈرے اور اس میں کوئی کمی نہ کرے ۔ اور اگر وہ، جس پر حق عاید ہوتا ہے، نادان یا ضعیف ہو یا لکھوا نہ سکتا ہو تو جو اس کا ولی ہو وہ انصاف کے ساتھ لکھوا دے ۔ اور اس پر اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ ٹھہرا لو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں سہی ۔ یہ گواہ تمہارے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوں ۔ دو عورتیں اس لئے کہ ایک بھول جائے گی تو دوسری یاد دلا دے گی ۔ اور گواہ جب بلائے جائیں تو آنے سے انکار نہ کریں ۔ اور قرض چھوٹا ہو یا بڑا، اس کی مدت تک کے لئے اس کو لکھنے میں تساہل نہ برتو ۔ یہ ہدایات اللہ کے نزدیک زیادہ قرینِ عدل، گواہی کو زیادہ ٹھیک رکھنے والی اور اس امر کے زیادہ قرینِ قیاس ہیں کہ تم شبہات میں نہ پڑو ۔ ہاں اگر معاملہ دست بدست لین دین اور دست گرداں نوعیت کا ہو تب اس کے نہ لکھنے میں کوئی حرج نہیں ۔ اور تم کوئی معاملہ خرید و فروخت

کا کرو تو اس صورت میں بھی گواہ بنا لیا کرو۔ اور کاتب یا گواہ کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہاری بڑی پائدار نافرمانی ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ۲۸۲

اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ مل سکے تو رہن قبضہ میں کرا دو، پس اگر ایک دوسرے پر اعتماد کی صورت نکل آئے تو جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ اس کی امانت ادا کر دے اور اللہ سے جو اس کا رب ہے ڈرے۔ اور شہادت کو چھپاؤ مت۔ جو اس کو چھپائے گا تو وہ یاد رکھے کہ اس کا دل گنہگار ہے، اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس کو جاننے والا ہے۔ ۲۸۳

بحث و نظر

امین احسن اصلاحی

خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب

(۲)

قرآن کا جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر صاحب آگے قدم بڑھاتے ہیں اور بیک گردش قلم فیصلہ صادر فرما دیتے ہیں کہ کتاب و سنت میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو تحدید آبادی کے خلاف پڑتی ہو پھر مزید کامیابی ڈاکٹر صاحب کو اس میدان تحقیق میں یہ حاصل ہو جاتی ہے کہ امام غزالیؒ اور حنفی فقہا نے صاف فرما گئے ہیں کہ ضبط تولید کے عدم جواز کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

"تاہم اس بات کا سب سے بین ثبوت کہ قرآن و سنت میں کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو تحدید آبادی کے خلاف پڑتی ہو یہ ہے کہ اس مسئلے میں خود فقہائے اسلام کے مابین قابل لحاظ اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر امام غزالی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ ضبط تولید کے عدم جواز کا کوئی ثبوت نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کے ان الفاظ کو پڑھ کر ہر شخص کے ذہن پر یہ اثر پڑے گا کہ فقہا کے دور میں خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ بڑے شد و مد سے زیر بحث آیا ہے پھر ان کے درمیان اس مسئلے میں "قابل لحاظ" اختلاف پیدا ہوا ہے اور اس بحث و اختلاف کے نتیجے میں امام غزالیؒ اور حنفی فقہا نے یہ نقطہ نظر اختیار فرمایا ہے کہ ضبط تولید کے عدم جواز کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

ہمیں ڈاکٹر صاحب کی یہ سطریں پڑھ کر سخت تعجب ہوا ہے کہ آخر امام غزالیؒ اور فقہا نے کب

خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں فتویٰ دے ڈالا اور ہم اُس سے بے خبر رہ گئے - ہمیں امام غزالیؒ کی کتابیں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے اور فقہ کی کتابوں پر بھی تھوڑی سی بہت نظر ہے - یہ بات تو ہمارے علم میں تھی کہ عزل کے باب میں کچھ اختلاف ہے اور یہ بھی ہم جانتے تھے کہ امام غزالیؒ عزل کی کراہت کو ایک تنزیہی کراہت سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ گمان نہیں کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اسی "قابلِ لحاظ اختلاف" کا سہارا لے کر خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب پر ایک مقالہ لکھ ڈالیں گے اور یہ دعوے کر بیٹھیں گے کہ ضبط تولید کے عدم جواز کا کوئی ثبوت نہیں ہے -

عزل اور خاندانی منصوبہ بندی کا فرق

اوّل تو اس امر پر غور کیجئے کہ کیا عزل اور کیا خاندانی منصوبہ بندی کی اسکیم - عزل تو یہ ہے کہ کوئی شخص بیوی سے مواصلت کرے لیکن استقرارِ حمل سے بچنے کے لئے انزال کے وقت اپنے کو علیحدہ کر لے - اس کے متعلق شریعت کا کیا حکم ہے اس پر ہم تفصیلی بحث آگے کریں گے - یہاں ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کئے لیتے ہیں کہ عزل جائز ہے لیکن عزل کے جواز سے خاندانی منصوبہ بندی کے جواز کا ثبوت کس طرح نکل آیا ؟ عزل پیدائش اولاد کو روکنے کی ایک نہایت اوچھی اور بالکل بے جان تدبیر ہے - جو صاحب دریا میں گرنے سے اپنے کو نہ بچا سکیں گے وہ اس میں گر کر اپنا دامن تر ہونے سے بھلا کیا بچا سکیں گے ! ہمارا تو خیال ہے کہ اس عزل کے جواز (باکراہت یا بے کراہت) کو بہت سے لوگ جانتے بھی ہیں لیکن اگر ڈاکٹر صاحب اس کو جائز ہی نہیں بلکہ ثواب بھی ثابت کر دیں جب بھی ہمارے ملک کی آٹھ دس کروڑ آبادی میں شاید آٹھ دس میاں بیوی بھی ایسے مشکل سے نکل سکیں گے جنہیں ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی اور گھٹتی ہوئی غذا کا اتنا احساس ہوگا کہ وہ جذبات کے طوفان میں بھی یہ یاد رکھ سکیں گے کہ عزل ایک بڑے ثواب کا کام ہے اور ہمارا ملک غذا کی قلت اور آبادی کی کثرت کے خطرے سے دوچار ہے - اس وجہ سے عزل کو ہم، جیسا کہ آگے واضح کریں گے، اگرچہ ایک اوچھی، ایک لایعنی ایک خلافِ فطرت اور ایک غیر مردانہ اور غیر مومنانہ حرکت سمجھتے ہیں لیکن اس سے نسلِ انسانی پر کسی ایسے اثر کے مترتب ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے جس کی بنا پر اس کی مخالفت کو ہم ضروری سمجھیں -

لیکن عزل کے جواز کی آڑ لے کر خاندانی منصوبہ بندی کو کس طرح جائز قرار دیا جا سکتا ہے درانحالیکہ

یہ منصوبہ بندی منظم نسل کشی کے ہم معنی ہے۔ اور اس کی زد عقائد و اخلاق ہر چیز پر پڑتی ہے ۔ عقیدے کے لحاظ سے اس اسکیم کی بنیاد مشرکانہ ہے اس لئے کہ اس ساری اسکیم میں یہ فاسد تصور گھسا ہوا ہے کہ انسان انسان کا رزّاق ہے اور وہ نسل انسانی کو گھٹانے اور بڑھانے کا مجاز ہے۔ جذبات کے لحاظ سے یہ اسکیم سنگدلانہ ہے اس لئے کہ یہ اولاد کو رحمت سمجھنے کے بجائے اس کو لعنت سمجھنے پر مبنی ہے۔ اخلاق کے نقطہ نظر سے یہ فاسقانہ ہے اس لئے کہ یہ عیاشی اور زنا کے، جیسا کہ ہم اوپر اشارے کر آئے ہیں، نہایت وسیع دروازے کھولتی ہے ۔ اس کے لئے جو گولیاں، جو ٹیوب، جو غلاف، جو رنگ اور جو آلات و اسلحہ استعمال ہو رہے ہیں وہ سب آلاتِ نسل کشی ہیں۔ مزید برآں مردوں کو ناقابل اولاد بنانا، عورتوں کو بانجھ بنانا اور اسقاط حمل کو قانونی اور شرعی حیثیت دینا، جو اس اسکیم کی کامیابی کے لازمی آخری مراحل ہیں، ایسی باتیں ہیں کہ ایک قوم ان باتوں کی وجہ سے خدا کی لعنت کی مستحق ہو سکتی ہے ؟ کیا ڈاکٹر صاحب انصاف کے ساتھ فرما سکتے ہیں کہ غزالیؒ اگر عزل کے قائل ہیں تو ان باتوں کے بھی قائل ہیں اور کیا عزل کے تحت یہ چیزیں بھی داخل ہیں؟ پھر ایک کے جواز کو دوسرے کے جواز کی دلیل ڈاکٹر صاحب نے کس طرح بنا لیا؟

عزل کے باب میں امام غزالیؒ کا مذہب

ڈاکٹر صاحب نے عزل کے مسئلے سے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں استدلال کرنے ہی میں سنتغربانہ چابک دستی نہیں دکھائی ہے بلکہ امام غزالیؒ کا مذہب نقل کرنے میں بھی نہایت سخت بددیانتی کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ نے خاندانی منصوبہ بندی کی حمایت میں کوئی مقالہ لکھا ہے حالانکہ خاندانی منصوبہ بندی تو درکنار وہ عزل کے بھی مخالف ہیں۔ بس زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس کی حرمت کے قائل نہیں ہیں بلکہ کراہت کے قائل ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی تصریح کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص معاشی اندیشوں سے اس قسم کی حرکت کرے تو اس کا یہ فعل توکل اور اعتماد علی اللہ کے منافی ہے اس لئے کہ خدا نے 'وان من دابۃ الا علی اللہ رزقھا' فرما کر ہر مخلوق کے رزق کی ضمانت دی ہے۔

ہم یہاں اسی باب سے جس سے ایک اختطاف کر کے ڈاکٹر صاحب نے ایک پورا مقالہ

لکھ ڈالا ہے ذیل میں کچھ اقتباسات درج کرتے ہیں جس سے عزل کے بارے میں امام غزالیؒ کے اصل مسلک کی وضاحت ہوگی۔

امام صاحب نے احیاء العلوم کے باب اداب النکاح میں پہلے یہ واضح کیا ہے کہ جو شخص طلب اولاد میں سرگرم ہوتا ہے اس کو مندرجہ ذیل چار پہلوؤں سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

ایک تو یہ کہ طلب اولاد کی سعی کر کے بندہ اللہ تعالیٰ کی اس محبت سے موافقت کا اظہار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو نوع انسانی کے بقا سے ہے۔

دوسرا یہ کہ اس سعی سے وہ رسولؐ کی محبت کا بھی اظہار کرتا ہے اس لئے کہ وہ اس چیز کے زیادہ کرنے میں حصہ لیتا ہے جس کی کثرت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت میں فخر کرنے والے ہیں۔

تیسرا یہ کہ اس میں اس شفاعت کی طلب بھی ہے جو اولاد کی کمسنی کی حالت میں مرجانے کی صورت میں اس اولاد کے ذریعہ سے اس کو حاصل ہوگی۔

چوتھا یہ کہ اسمیں اس برکت کی طلب بھی ہے جو آدمی کو اولاد صالح کی دعا سے حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب غور فرمائیں کہ جو امام غزالیؒ اولاد کی طلب اور اس کے لئے سعی و سرگرمی کو اتنے گوناگوں پہلوؤں سے اللہ تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ قرار دیتے ہیں اور اس کی تکثیر کو محبت رسولؐ کے حصول کا واسطہ ٹھہراتے ہیں وہ عزل کے حامی کس طرح ہو سکتے ہیں اور اگر بالفرض وہ کسی درجے میں عزل کے جواز کے قائل ہوں بھی تو وہ اس خاندانی منصوبہ بندی کے حامی کس طرح ہو سکتے ہیں جو طلبِ اولاد کو قربتِ الٰہی کا ذریعہ قرار دینا تو الگ رہا اسکو ملک کے لئے ٹڈی دل کا عذاب قرار دیتی ہے۔ پھر امام غزالیؒ اتنے ہی پر بس نہیں کرتے ہیں بلکہ وہ مذکورہ بالا امور قربتِ الٰہی میں سے پہلے امر کی وضاحت کرتے ہوئے زوردار لفظوں میں عزل اور خاندانی منصوبہ بندی کے تار پود بکھیرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:-

"مسئلے کا سب سے زیادہ دقیق پہلو یہی ہے۔ عوام کی فہم سے تو یہ بالاتر ہے لیکن جن کی نگاہیں اللہ تعالیٰ کے عجائب قدرت اور اس کے رموز حکمت تک پہنچنے والی ہیں ان کے لئے سب سے زیادہ جاذب نظر اور قوی پہلو یہی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ایک آقا اپنے کسی غلام کو بیج، کاشتکاری کے آلات اور قابلِ کاشت اراضی سپرد کرے، غلام کھیتی پر قادر بھی ہو اور اس پر آقا کی طرف سے کھیتی کا مطالبہ

کرنے والے کارندے بھی مامور ہوں لیکن ان سب باتوں کے باوجود غلام سست بیٹھا رہے، آلاتِ کشاورزی کو بیکار ڈالے رکھے، بیج کو ضائع ہونے اور سڑ جانے کے لئے چھوڑ دے اور مامور کارندوں کو حیلوں حوالوں سے ٹالتا رہے تو ایسا غلام بلا شبہ اپنے آقا کے غصہ و غضب کا سزاوار ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے میاں اور بیوی کو پیدا کیا۔ ان کو تناسل کے آلات دیئے۔ انثیین بنائے۔ پیٹھ کی ہڈیوں میں نطفہ کی تخلیق کی۔ اس کے لئے انثیین کے اندر رگیں اور نالیاں بنائیں۔ پھر رحم کو نطفہ کے استقرار کے لئے سازگار بنایا۔ عورت اور مرد دونوں پر شہوت کے تقاضے مسلط کر دیئے۔ یہ تمام آلات و افعال نہایت بلیغ زبان میں شہادت دے رہے ہیں کہ ان کے پیدا کرنے سے ان کے تناسل کا منشا کیا ہے اور تمام اہل عقل کو پکار پکار کر بتا رہے ہیں کہ ان کے وجود میں لانے کی غایت کیا ہے۔ یہ بات ایسی واضح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے نہ بھی واضح کی ہوتی جب بھی سورج کی طرح روشن ہے چہ جائیکہ خود رسول نے بھی اس کو برملا واضح کر دیا کہ تناکحوا تناسلوا۔ (نکاح کرو، اپنی نسل بڑھاؤ) پس ہر وہ شخص جو نکاح سے رکتا ہے وہ کھیتی سے اعراض کرنے والا، بیج کو ضائع کرنے والا، آلات کو معطل رکھنے والا، فطرت کے اس مقصد اور اس کی اس مصلحت کو برباد کرنے والا ہے جو ان آلات پر حروف و الفاظ کی صورت میں نہیں بلکہ نوشتۂ الٰہی کی شکل میں مرقوم ہے اور اس کو ہر وہ شخص پڑھ سکتا ہے جس کو ربانی بصیرت اور ازلی حکمت کی باریکیوں تک پہنچنے والی نگاہ عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر شریعت میں قتل اولاد اور وأد (اولاد کو زندہ درگور کرنا) کو نہایت سنگین جرم قرار دیا گیا ہے اس لئے کہ یہ منشائے الٰہی کے بالکل خلاف تکمیلِ وجود کی راہ میں ایک مزاحمت ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کیا ہے جس نے کہا ہے کہ عزل بھی زندہ درگور کرنے کی ایک قسم ہے[1]۔"

ڈاکٹر صاحب سے التماس ہے کہ وہ اس پوری عبارت کو پڑھیں اور خاص طور پر اس کے خط کشیدہ الفاظ پر غور فرمائیں کہ جن امام غزالیؒ کے نظریات یہ ہیں، جو صاف طور پر عزل کو بھی زندہ درگور

[1] احیاء العلوم ج ۲ - ص ۱۲-۱۳ - مطبوعہ نول کشور۔

کرنے کی ایک قسم قرار دیتے ، وہ اس خاندانی منصوبہ بندی کے حامی کس طرح ہو سکتے ہیں جو صریح طور پر ایک منظم نسل کشی ہے ؟ امام غزالیؒ نے اوپر آقا اور غلام کی جو مثیں دی ہے اس کی روشنی میں ڈاکٹر صاحب انصاف کے ساتھ بتائیں کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کو ان تمام آلات و تدابیر سمیت ، جو آج خاندانی منصوبہ بندی کی مہم میں استعمال ہو رہے ہیں امام غزالیؒ کی خدمت میں پیش کر کے یہ استفتا کیا جا سکتا کہ از روئے شرع شریف اس "ڈاکٹر" کے بارے میں فرمائیے جس نے آپ کے حوالے سے یہ مضمون لکھا ہے تو ان کا جواب کیا ہوتا ؟

آگے اسی بحث میں امام صاحب اس سوال کو لیتے ہیں کہ نکاح کا اصل محرک صرف قضائے شہوت ہے یا اولاد ؟ یہ سطریں بھی ڈاکٹر صاحب کے لئے موجب بصیرت ہو سکتی ہیں - اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کی خاندانی منصوبہ بندی کی محبوب اسکیم کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہے کہ وہ نکاح کے اصل مقصد کی تو بیخ کنی کر رہی ہے اور اس کے ضمنی مقصد لذت کو اس کے اصل مقصد کی جگہ دے رہی ہے - اس بارے میں امام غزالیؒ کی رائے ملاحظہ ہو۔

"اگر نکاح کا محرک محض قضائے شہوت ہوتا تو حضرت معاذؓ طاعون کی حالت میں یہ نہ کہتے کہ میرا نکاح کر دو ، میں خدا سے رنڈوے ہونے کی حالت میں نہیں ملنا چاہتا - اگر کوئی یہ سوال اٹھائے کہ اس حالت میں تو معاذؓ کو اولاد کی بھی توقع نہیں ہو سکتی تھی تو پھر انہوں نے نکاح کی خواہش کیوں کی ؟ میری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اولاد مباشرت کا ثمرہ ہے اور مباشرت کی خواہش شہوت سے ہوتی ہے جو اختیاری شئے نہیں ہے - بندے کے اختیار میں جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ وہ محرک شہوت کا اہتمام کرے اور یہ چیز ہر حالت میں متوقع ہے - پس جس نے نکاح کیا ، اس نے وہ فرض ادا کر دیا جو اس پر عاید ہوتا تھا ، اس سے آگے جو کچھ ہے وہ اس کے حدودِ اختیار سے باہر ہے اس وجہ سے ایک نامرد کے لئے بھی نکاح مستحب ہے اس لئے کہ بعض حالات میں شہوت کے رجحانات دبے ہوئے ہوتے ہیں جن کی آدمی کو خبر نہیں ہوتی[1]"

آگے اسی بحث میں امام صاحب مذکورہ بالا چار موجبات قربت الٰہی میں سے دوسرے پہلو کی وضاحت فرماتے ہوئے لکھتے ہیں :-

---

[1] احیاء العلوم حوالہ مذکور

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور آپ کی خوشنودی کی طلب کا پہلو اس میں یہ ہے کہ آدمی نکاح کے ذریعے سے اس چیز کی تکثیر کی کوشش کرتا ہے جس کی کثرت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن فخر فرمائیں گے۔ اس بات کی تصریح خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور وہ بات بھی جملہ پہلوؤں سے اولاد کی اہمیت پر دلیل ہے جو حضرت عمرؓ کے متعلق منقول ہے کہ انہوں نے زیادہ نکاح کئے اور فرماتے تھے کہ میں نکاح اولاد کی کثرت کے لئے کرتا ہوں۔ اس طرح وہ روایات بھی قابل لحاظ ہیں جن سے بانجھ عورتوں کی مذمت نکلتی ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ گھر کے کونے میں پڑی ہوئی چٹائی اس عورت سے بہتر ہے جو بچے نہیں جنتی۔ نیز فرمایا، تمہاری عورتوں میں سے بہتر وہ ہیں جو بچے جننے والی اور بچوں سے پیار کرنے والی ہوں۔ اور فرمایا کہ ایک کالی کلوٹی بچے جننے والی عورت اس حسینہ سے کہیں بہتر ہے جو بچے جننے والی نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نکاح کے مقاصد میں تقضائے شہوت کے مقابل میں اولاد کی طلب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اگر تقضائے شہوت کو زیادہ اہمیت ہوتی تو اس پہلو سے بچے جننے کے مقابل میں حسن کو ترجیح حاصل ہوتی کیونکہ اخلاق کی حفاظت، نگاہ کی احتیاط اور نفس کی تسکین اس سے زیادہ حاصل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس عبارت کو بھی، خاص طور پر اس کے خط کشیدہ الفاظ کو، غور سے ملاحظہ فرمائیں اور پھر انصاف کریں کہ انہوں نے امام غزالیؒ کو خاندانی منصوبہ بندی کا حامی ثابت کر کے ان کے اوپر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔

پھر امام غزالیؒ نے صرف نکاح کا یہ فلسفہ اور اس کی ضرورت ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا ہے بلکہ صاف الفاظ میں عزل کی مخالفت بھی کی ہے۔ خاص عزل کے مسئلے پر جہاں وہ بحث شروع کرتے ہیں، اس کی تمہید وہ یوں اُٹھاتے ہیں۔

ومن الاداب ان لا یعزل بل یسرح الماء الی محل الحرث وھوالرحم فما من نسمۃ قدر اللہ کونھا الا وھی کائنۃ ھکذا	اور نکاح کے اداب میں سے یہ بات بھی ہے کہ آدمی عزل نہ کرے بلکہ نطفے کو تخم ریزی کی جگہ یعنی رحم میں پہنچنے دے۔ جس جان کا پیدا ہونا اللہ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1] نے لکھ رکھا ہے وہ پیدا ہو کے رہے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا ہے۔

یہ ہے عزل سے متعلق امام غزالیؒ کا مذہب۔ اور غور کیجئے تو نکاح کے اس فلسفے کی روشنی میں جو امام صاحب نے پیش کیا ہے اس کے سوا ان کا کوئی اور مذہب ہو ہی نہیں سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوا کہ عزل ہے تو فطرت اور شریعت کے منشا اور نکاح کے مقصد کے خلاف لیکن اگر کوئی شخص اس کا مرتکب ہو تو اس کا یہ فعل کس درجے کا جرم ہے، یہ حرام ہے یا مکروہ؟ اس سوال کا جواب امام صاحب یہ دیتے ہیں کہ یہ مکروہ ہے اور اس کی کراہت تنزیہی نوعیت کی ہے لیکن یہ انہوں نے جیسا کہ ہم نے اوپر ان کے قول کا حوالہ دیا ہے، صاف لکھ دیا ہے کہ جو لوگ معاشی وجوہ کی بنا پر یہ حرکت کریں گے ان کا ایسا کرنا توکل اور اعتماد علی اللہ کے خلاف ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس بات کی ضمانت دی ہے کہ ہر جان کے رزق کی ذمہ داری اللہ ہی پر ہے۔

بس اتنی سی بات تھی جس کو ڈاکٹر صاحب نے یہ رنگ دینے کی کوشش کی ہے کہ امام غزالی خاندانی منصوبہ بندی کے پرجوش علم برداروں میں ہیں۔ اوّل تو یہ دیکھئے کہ کجا عزل اور کجا خاندانی منصوبہ بندی کا فتنہ، پھر یہ دیکھیے کہ کجا امام غزالیؒ کا درباب عزل یہ مسلک اور کجا ڈاکٹر صاحب کا وہ بیان۔ ٹڈے کی ٹانگ پر ہاتھی کا خول چڑھانا اسی کو کہتے ہیں۔ اور یہ ہمارے ان مستغربین کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے!۔

احادیث ممانعت عزل

امام غزالیؒ ہوں یا فقہا یہ لوگ کوئی بات نہ اپنے جی سے کہتے اور نہ دین کے معاملے میں انہیں اپنے جی سے کہنے کا کوئی حق ہے اس وجہ سے کسی صاحب علم کے لئے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ وہ مجرد ان کے کسی قول پر اپنے کسی فتوے یا اجتہاد کی بنیاد رکھ دے۔ بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ کتاب و سنت کی کسوٹی پر، جو دین میں حق و باطل کے امتیاز کی کسوٹی ہے، پرکھ کے دیکھے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں اس کے اندر کتنا وزن ہے۔ لیکن ہمارے ان ڈاکٹر صاحبان نے یہ عجیب وتیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ اگر بات ان کی خواہشوں کے خلاف ہو تب تو یہ قرآن، حدیث کسی چیز کی بھی پروا نہیں کرتے،

بڑی بے دردی سے سب پر ہاتھ صاف کر جاتے ہیں لیکن کسی کی کوئی بات اگر ان کی خواہش کے مطابق مل جائے تو اس کو فوراً دین میں حجت مان لیتے ہیں۔ ان حضرات کی اس فتنہ جویانہ روش کی وجہ سے اگرچہ ان سے کوئی بات کرنا بالکل اپنا وقت برباد کرنا ہے لیکن جب یہ سوال چھڑ گیا ہے تو ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ عزل سے متعلق تمام احادیث باب پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان سے عزل کی اجازت نکلتی ہے یا نہیں، اگر نکلتی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ چنانچہ اب ہم اس بحث کو لیتے ہیں۔ پہلے ان روایات پر ایک نظر ڈالئے جن سے صاف صاف اس فعل کی ممانعت نکلتی ہے۔ اس کے بعد ہم ان روایات سے بھی بحث کریں گے جن سے بعض لوگوں نے اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ عن ابی محیریز انہ قال دخلت انا وابو الصرمۃ علی ابی سعید الخدری، فسألہ ابو الصرمۃ فقال یا ابا سعید ھل سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر العزل فقال نعم غزونا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غزوۃ بالمصطلق فسبینا کرائم العرب فطالت علینا العزبۃ ورغبنا فی الفداء فاردنا ان نستمتع و نعزل فقلنا نفعل ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بین اظھرنا لا نسئلہ فسالنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال لا علیکم ان لا تفعلوا، ما کتب اللہ خلق نسمۃ	ابو محیریز سے روایت ہے کہ میں اور ابو صرمہ ابو سعید خدری کے پاس گئے۔ ابو صرمہ نے ان سے پوچھا، ابو سعید! آپ نے کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ ابو سعید نے جواب دیا ہاں۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک غزوہ مصطلق میں کیا، وہاں ہم نے عرب کی شریف زادیوں کو گرفتار کیا۔ صورت حال یہ تھی کہ ہمیں عورتوں سے ملے ہوئے بھی زیادہ دن ہو گئے تھے اور ہم یہ بھی چاہتے تھے کہ فدیہ لے کر قیدیوں کو چھوڑ بھی دیں۔ تو ہم نے یہ ارادہ کیا کہ ہم ان عورتوں سے متمتع ہوں اور عزل کریں لیکن ہم نے سوچا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے ساتھ موجود ہیں تو ان سے پوچھے بغیر ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے چنانچہ

هی کائنة الی یوم القیمة الا ستکون | ہم نے اس کے بارے میں رسول اللہ سے سوال کیا آپ نے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہ کرو، جس جان کا پیدا کرنا اللہ تعالیٰ نے قیامت تک لکھ دیا ہے وہ آکر رہے گی۔

(مسلم باب عزل)

اس حدیث میں 'لاعلیکم ان لا تفعلوا' میں 'لا' کو اگر اُن کے سوال کا جواب قرار دیا جائے اور 'علیکم ان لا تفعلوا' کو اس سے الگ مانا جائے تب تو یہ نہی بڑی زوردار ہو جاتی ہے لیکن اگر 'لا' کو بعد کے الفاظ ہی سے جوڑا جائے جب بھی نفس ممانعت کے پہلو سے جملے کے مفہوم میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔ البتہ یہ ہوگا کہ حتمی نہی کے بجائے یہ نہی تعلیم وارشاد کی نوعیت کی ہو جائے گی۔ یعنی حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو کیا بگڑتا ہے، بات تو وہیں رہے گی جہاں ہے، جس جان کو آنا ہے وہ آ کے رہے گی، تمہاری ان تدبیروں سے خدا کی اسکیم پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس دنیا کی آبادی کے لئے اس کے خالق نے جو اسکیم بنائی ہے وہ بندوں کی اس قسم کی مداخلتوں سے متاثر ہونے والی نہیں ہے اس وجہ سے بندوں کو چاہئے کہ وہ سعی و عمل کے ان حدود کے اندر رہیں جو خدا نے ان کے لئے ٹھہرا دیئے ہیں۔ ان حدود کو لانگنے کی کوشش نہ کریں۔

اگر کوئی شخص اس سے عزل کی اجازت نکالنا چاہیے تو اس کی گنجائش اس میں بالکل نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں دوسرے 'لا' کو لازماً حذف کرنا پڑے گا اور اس طرح بے دلیل حذف کی راہ کھول دی جائے تو پھر تو ہر نہی کو اثبات کے معنی میں لیا جا سکتا ہے۔

۲- یہی حدیث ایک دوسرے واسطے سے یوں روایت ہوئی ہے جس سے یہ ممانعت اور زیادہ مؤکد ہو جاتی ہے۔

عن ابی محیریز عن ابی سعید الخدری انه اخبره انه قال اصبنا سبایا فکنا نعزل ثم سألنا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم عن ذلك | ابو محیریز ابو سعید خدری سے روایت کرتے ہیں کہ جنگ میں کچھ عورتیں ہمارے ہاتھ آئیں تو ہم ان سے متمتع ہوتے اور عزل کرتے۔ پھر ہم نے رسول اللہ صلعم سے اس کے بابت دریافت

فقال لنا وانكم لتفعلون، وانكم لتفعلون، وانكم لتفعلون، ما من نسمة كائنة الى يوم القيمة الا هي كائنة - (مسلم)

کیا تو آپ نے فرمایا، اچھا تم ایسا کرتے ہو؟ تم ایسا کرتے ہو؟ تم ایسا کرتے ہو؟ جو جان قیامت تک آنے والی ہے وہ آ کے رہے گی۔

اس حدیث میں لوگوں کے اس فعل پر حضورؐ کے اظہار تعجب کا انداز ملاحظہ ہو۔ آپ ایک بار نہیں بلکہ مسلسل تین مرتبہ اس پر نہایت تیکھے انداز میں فرماتے ہیں کہ اچھا تم لوگ ایسی حرکت کرتے ہو! ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یہ انداز پسندیدگی کا نہیں بلکہ اظہار ملامت و کراہت ہی کا ہو سکتا ہے۔ پھر آپ نے وہی بات فرمائی جو اوپر والی حدیث میں گزری کہ تم خانہ ذاتی منصوبہ بندی کے خبط میں نہ پھنسو، اپنی فطرت اور اپنے حدود کار کے اندر رہتے ہوئے کام کرو، جس خدا نے نسل آدم کا یہ گھرانا بسایا ہے اس نے روز ازل سے لے کر قیامت تک کے لئے اس کی منصوبہ بندی خود کر رکھی ہے۔ یہ کام اس نے تمہاری منصوبہ بندی پر نہیں چھوڑا ہے۔

٣- قال ذكر العزل عند النبي صلى الله عليه وسلم فقال وما ذاكم قالوا الرجل تكون له المرأة ترضع فيصيب منها ويكره ان تحمل منه والرجل تكون له الامة فيصيب منها ويكره ان تحمل منه قال فلا عليكم ان لا تفعلوا فانما هو القدر قال ابن عون فحدثت به الحسن فقال والله لكان هذا زجر (مسلم)

راوی کہتے ہیں کہ نبی صلعم کے سامنے عزل کا ذکر ہوا تو آپ نے پوچھا، یہ کیا چیز ہے؟ لوگوں نے کہا ایک شخص کی بیوی ہے جو بچے کو دودھ پلا رہی ہوتی ہے، وہ شخص اس سے مباشرت کرتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ حاملہ نہ ہو۔ اسی طرح ایک شخص کی لونڈی ہے، وہ اس سے مباشرت کرتا ہے لیکن یہ نہیں چاہتا کہ وہ حاملہ ہو جائے۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ نہیں، تم ایسا نہ کرو، اس چیز کا تعلق تقدیر سے ہے۔ ابن عون کہتے ہیں میں نے یہ حدیث حسن سے بیان کی تو وہ بولے کہ بخدا ان الفاظ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کی ممانعت ہوئی۔

اس حدیث سے ایک تو وہی بات واضح ہوئی جس کا ذکر اوپر والی حدیثوں میں گزرا ہے کہ دنیا میں پیدائش و اموات کا تعلق خدائی پلاننگ سے ہے، بندوں کو چاہیئے کہ وہ اپنے سعی و عمل کے دائرہ کے اندر رہ کر کام کریں۔ خدا کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کی کوشش نہ کریں۔

دوسری بات جو اس حدیث کے آخری جملے سے نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ سلف صالحین اس حدیث سے عزل کی ممانعت ہی سمجھتے تھے چنانچہ ابن عون کہتے ہیں کہ میں نے حسن سے یہ روایت بیان کی تو انھوں نے کہا کہ یہ تو صاف ممانعت ہے۔ یہاں 'زجر' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معنی جھڑکنے کے ہیں۔ یعنی کسی فعل سے سختی کے ساتھ روکنا۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ممانعت کا تعلق صرف عزل کے قسم کی "بچکانہ" حرکتوں ہی سے ہے، جو باتیں فطرت اور اصول صحت سے تعلق رکھنے والی ہیں ان کی نفی اس سے نہیں ہوتی۔ اگر ایک شخص کی بیوی بچے کو دودھ پلا رہی ہے، بچہ چھوٹا ہے، بیوی نے ابھی پچھلے وضع حمل کے بعد پوری طرح اپنی صحت بحال نہیں کی ہے تو یہ فطرت اور اصول صحت کا تقاضا ہے کہ مرد ایسی حالت میں ضبط نفس کی راہ اختیار کرے، بیوی پر نئے حمل کی ذمہ داریاں لادنے کی کوشش نہ کرے۔ فطرت کے اصول اور تقاضے اسلامی شریعت کے اجزا ہیں، اس لئے کہ اسلامی شریعت فطرت ہی پر مبنی ہے۔ یہ اجزا شریعت میں اس لئے بیان نہیں ہوتے کہ اپنی غایت درجہ وضاحت کی وجہ سے بیان کے محتاج نہیں تھے۔ اس حقیقت پر ہم نے تفصیل کے ساتھ اپنی تفسیر تدبر قرآن میں بحث کی ہے۔ شریعت کا منشا یہ ہے کہ آدمی فطرت اور شریعت کے اصولوں کی پیروی کرے، چھچھوری حرکتیں نہ کرے۔ اگر حالات کا تقاضا یہ ہے کہ جماع سے احتراز کرے تو اس طرح اپنے نفس کو ضبط میں رکھے جس طرح ایک شہسوار اپنے سرکش گھوڑے کو قابو میں رکھتا ہے اور اگر کوئی چیز مانع نہیں ہے تو پھر اس انشراح صدر کے ساتھ یہ کام کرے جس انشراح کے ساتھ ایک مرد کو کرنا چاہیئے۔

۴- عن ابی سعید قال، قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی العزل، انت تخلقہ انت ترزقہ اقرہ قرارہ

ابو سعید سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عزل کے بارے میں فرمایا کہ بھلا تم بچے کو پیدا کرتے ہو، تم اس کو روزی بہم پہنچاتے

فانما ذلك القدر۔ ہو؟ معاملے کو اس کے حال پر چھوڑ دو اس کا

(رواہ احمد) تعلق تقدیر سے ہے۔

''انما ذلك القدر'' کا مطلب جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کرچکے ہیں، یہ ہے کہ اس کا تعلق قدرت کی پلاننگ سے ہے جس نے یہ دُنیا بنائی ہے اس نے قیامت تک کے لئے اس کی پلاننگ بھی کی ہے۔ اسلامی اصطلاح میں اسی پلاننگ کو قدر یا تقدیر کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔

اس حدیث میں اس بات کی بھی وضاحت کی ہے کہ جس کے ہم خالق نہیں، جس کے روزی رساں نہیں، اس کے دنیا میں آنے نہ آنے کا مسئلہ ہم سے کس طرح متعلق ہو گیا کہ ہم یہ فیصلہ کرنے بیٹھ جائیں کہ اسے آنا چاہیئے یا نہیں۔ اوپر قرآن کی روشنی میں، اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے ہم اس پہلو کو سامنے لاچکے ہیں جس بنا پر قرآن نے قتل اولاد کو جرم قرار دیا اسی بنیاد پر نبی صلعم نے بھی اس کی ممانعت فرمائی۔

۵۔ ...... ثم سالوہ عن العزل فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ذلك الواد الخفی و اذا الموءدۃ سئلت ....

...... پھر لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عزل کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ بھی ایک مخفی قسم کا اولاد کو زندہ در گور کرنا ہے اور آپ نے یہ آیت پڑھی۔

(رواہ احمد و مسلم) واذا الموءودۃ الایۃ۔

اس حدیث میں عزل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ''واد خفی'' یعنی اولاد کو زندہ درگور کرنے کی ایک مخفی قسم قرار دیا ہے۔ غور فرمائیے کہ جب عزل کو حضورؐ نے 'واد خفی' قرار دیا درآنحالیکہ خاندانی منصوبہ بندی کی تمام تدبیروں میں سب سے زیادہ غیر مؤثر تدبیر یہی ہے تو پھر خاندانی منصوبہ بندی کے متعلق اس روشنی میں کیا فتویٰ دیا جائے جو فی الواقع نسل کشی کی نہایت موثر اور کارگر اسکیم ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کسی جرم کے خفی یا جلی ہونے سے اس کی نوعیت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔ فرق جو کچھ ہوتا ہے وہ اس پہلو سے ہوتا ہے کہ ایک جلی گناہ سب کو نظر آسکتا ہے اور ایک خفی جرم کو صرف اہل نظر ہی دیکھ سکتے ہیں۔

احادیث جواز عزل کی حقیقت

مذکورہ بالا حدیثیں صاف صاف عزل کے جواز کی نفی کر رہی ہیں۔ اس امر میں تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ اس نفی کا لب و لہجہ سخت ہے یا نرم لیکن نفی میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ اب ذرا ایک نظر ان روایات پر بھی ڈال لیجئے جن سے بعض لوگوں نے اس کا جواز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ عن جابر ان رجلاً اتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ ان لی جاریۃ ھی خادمنا وسانیتنا وانا اطوف علیھا وانا اکرہ ان تحمل فقال اعزل عنھا ان شئت فانہ سیاتیھا ما قدر لھا فلبث الرجل ثم اتاہ فقال ان الجاریۃ قد حملت فقال قد اخبرتک انہ سیاتیھا ما قدر لھا۔

(مسلم)

جابر سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ میری ایک لونڈی ہے، وہی گھر کے کام کاج کرتی اور پانی وغیرہ بھی لاتی ہے اور میں اس سے ملاقات بھی کرتا ہوں لیکن یہ نہیں پسند کرتا کہ وہ حاملہ ہو، آپ نے فرمایا اگر تم عزل کرتے ہو تو کرو لیکن یاد رکھو کہ اس کے لئے جو مقدر ہے وہ ہو کے رہے گا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ شخص پھر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بتایا کہ لونڈی تو حاملہ ہو گئی آپ نے فرمایا، میں نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ جو ہونا ہے وہ ہو کے رہے گا۔

اس حدیث کے انداز سے صاف واضح ہے کہ آنحضرتؐ کا یہ فرمانا کہ "اگر تم عزل کرتے ہو تو کرو لیکن جو بات مقدر ہے وہ ہو کے رہے گی" عزل کی اجازت دینے کے ہم معنی نہیں ہے بلکہ آپ نے اس طریقے کے اوچھے پن اور اس کے خلاف تقدیر الٰہی ہونے کی طرف اشارہ کر کے سائل کو صحیح راہ کی طرف تعلیم و ارشاد کے انداز میں رہنمائی فرمائی۔

یہی روایت امام مسلم دوسرے طریقے سے بھی لاتے ہیں جس میں واقعہ بالکل ٹھیک طریقہ سے بیان ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

عن جابر بن عبد الله قال سأل رجل النبي صلی الله علیه وسلم فقال ان عندی جاریة لی وانا اعزل عنها فقال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان ذلك لن یمنع شیئاً اراده الله قال فجاء الرجل الحدیث (مسلم)

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی صلعم سے سوال کیا کہ میرے پاس ایک لونڈی ہے جس سے میں عزل کرتا ہوں، حضور نے فرمایا یہ چیز اللہ کی تقدیر کو ذرا بھی نہ روک سکے گی ...

واقعہ وہی ہے لیکن اس میں وہ الفاظ نہیں ہیں جو اوپر والی روایت میں ہیں کہ " اگر تو چاہے " بلکہ آپ نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ " یہ چیز ارادہ الٰہی کو نہیں بدل سکے گی " اسی بات کو راوی نے پہلی روایت میں ذرا مختلف انداز سے بیان کر دیا ہے جس سے بعض لوگوں کو شبہ پیدا ہوا۔ لیکن اس شبے کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ ممانعت کے انداز مختلف ہوتے ہیں اور ہر انداز خاص طرح کے حالات کے لئے موزوں ہوا کرتا ہے ۔ احادیث پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جو خرابیاں اور کمزوریاں نجی زندگی سے تعلق رکھنے والی ہیں ان سے روکنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بالعموم حتمی نہی کا انداز اختیار کرنے کے بجائے تعلیمی و تادیبی نہی کا انداز اختیار فرمایا ہے۔ اور انداز کلام حکم کے بجائے ارشاد کا ہے ۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ نہاں خانوں کے معاملات میں، جہاں قانون ظاہری کی دسترس مشکل ہی سے ہو سکتی ہے ارشاد اور رہنمائی ہی کا رول زیادہ مؤثر ہو سکتا ہے ۔ اس وجہ سے الفاظ اور لب و لہجہ کی نرمی سے ہر جگہ یہ نتیجہ نکال لینا کہ فلاں بات معمولی درجے کی ہے ، ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے ۔ بسا اوقات ایک سخت بیماری سے متعلق بھی طبیب کا لب و لہجہ نرم ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ مرض کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس سے نرم لہجہ ہی میں روکنا زیادہ نتیجہ خیز ہو سکتا ہے ۔

۲۔ عن جابر بن عبد الله قال کنا نعزل والقرآن ینزل۔ (مسلم)

جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ہم عزل کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا ۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ کوئی رسول کی حدیث نہیں ہے بلکہ جابرؓ کا ایک اپنا اندازہ ہے ۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب قرآن کے زمانہ نزول میں ہم یہ فعل کر رہے تھے تو اگر یہ کوئی ایسا فعل ہوتا جس کا روکا

جانا ضروری ہوتا تو قرآن کی کوئی آیت نازل ہو کر اس سے ہمیں روک دیتی۔ لیکن جابرؓ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اگر یہ کوئی روکی جانے والی چیز ہوتی تو لازماً اس کے متعلق قرآن کی کوئی آیت ہی اترتی۔ کتنی چیزیں ہیں جن سے اسلام میں روکا گیا ہے، حالانکہ قرآن میں ان کے بارے میں کوئی آیت نہیں اتری۔ قرآن کا یہ طریقہ نہیں رہا ہے کہ جہاں گھروں میں کوئی قابلِ گرفت بات ہوئی جھٹ اس پر کوئی آیت اتر آئی۔ واقعات تو درکنار خود قرآن سے معلوم ہے کہ لوگوں نے سوالات کئے ہیں اور قرآن نے ان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کا تعلق اصولی اور بنیادی مسائل سے رہا ہے، جو باتیں قرآن کے کلیات میں موجود تھیں جن کو اہل علم اخذ کر سکتے تھے، یا جو باتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت وتربیت سے لوگوں کے سامنے آجانے والی تھیں ان چیزوں کے لئے قرآن نے الگ الگ آیتیں اتارنے کا اہتمام نہیں کیا۔ رہی یہ بات کہ اس چیز کی ممانعت قرآن کی اصولی تعلیمات میں موجود تھی یا نہیں اور آنحضرت صلعم نے اس کے بارے میں رہنمائی دی یا نہیں تو ان دونوں سوالوں کا جواب پچھلے صفحات میں گذر چکا کہ قرآن نے بھی اس سے روکا ہے اور پیغمبر صلعم نے بھی۔ اس وجہ سے جابرؓ کے اس خیال کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔

۳۔ عن جابر قال کنا نعزل علی عھد نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبلغ ذلک نبی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم ینھنا۔	جابر سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نبی صلعم کے زمانے میں عزل کرتے تھے اور یہ بات نبی صلعم کو پہنچی لیکن آپ نے اس سے ہمیں روکا نہیں۔ (مسلم)

حضرت جابرؓ کے اس خیال کی بنیاد ایک تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان کو ممانعت کی وہ حدیثیں نہیں پہنچیں جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں، اگر وہ حدیثیں ان کو پہنچی ہوتیں تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں جب جب یہ بات آئی ہے آپؐ نے اس سے روکا ہے۔

دوسری بنیاد یہ ہو سکتی ہے کہ جابرؓ نہی قطعی کی نفی کر رہے ہوں۔ یعنی ان کا مطلب یہ ہو کہ آنحضرتؐ نے اس چیز سے قطعی طور پر نہیں روکا ہے۔ اس توجیہ کی طرف ذہن اس وجہ سے جاتا ہے کہ اوپر والی روایت جس میں ایک شخص کا اپنی لونڈی سے متعلق سوال مذکور ہے، جابر ہی سے مروی ہے اس روایت کی موجودگی میں جابرؓ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ آنحضرتؐ نے اس چیز سے سرے سے روکا ہی نہیں

البتہ اس کی گنجائش اس سے نکلتی ہے کہ آنحضرت صلعم نے قطعی الفاظ میں اس کی ممانعت نہیں فرمائی بلکہ تعلیم و ارشاد کے انداز میں اس سے روکا۔

اس سلسلہ میں احمد اور ابن ماجہ کی ایک روایت کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے کہ "شریف زادی سے اس کے اذن کے بغیر عزل نہ کیا جائے"۔ لیکن یہ روایت چونکہ مسلم طور پر ضعیف ہے اس وجہ سے اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

عزل سے متعلق مخالف اور موافق یہ روایات ہیں جو ہم نے نقل کر دی ہیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہر صاحب نظر اندازہ کر سکتا ہے کہ ان سے عزل کا جواز نکلتا ہے یا عدم جواز جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود واضح فرما دیا کہ خالق اور رزاق خدا ہے نہ کہ تم، ولادت اور موت کی منصوبہ بندی کرنے والا خالق کائنات ہے نہ کہ انسان اور حضورؐ نے یہ بھی بتا دیا کہ عزل بھی اولاد کو زندہ درگور کرنے کی ایک مخفی قسم ہے تو اس میں کسی "قابل لحاظ" اختلاف کی تو درکنار کسی ناقابل لحاظ اختلاف کی بھی گنجائش کہاں باقی رہی؟ حکمت دین کے لحاظ سے غور کیجیے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ حضورؐ نے اس فعل کو عقیدہ توحید کے خلاف ٹھہرایا ہے۔ لیکن ہمارے فقہا کا دین کے معاملات میں احتیاط کے سبب بالعموم طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ جب تک کسی چیز کی حرمت واضح اور قطعی طور پر قرآن و حدیث میں نہیں پاتے اس کو مکروہ ہی کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے متقدمین کے اقوال سے کتنی مثالیں ایسی پیش کی ہیں جو صریح ثبوت اس بات کا بہم پہنچاتی ہیں کہ یہ لوگ لفظ کراہت کا استعمال کرتے ہیں اور مراد اس سے حرمت ہوتی ہے۔ لیکن اس چیز کو نظر انداز کر کے بھی مذکورہ احادیث کی روشنی میں کوئی فقیہہ یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ عزل اسلام میں کوئی پسندیدہ فعل ہے۔ پھر جب عزل کا بھی کوئی پسندیدہ فعل ہونا ثابت نہیں ہو سکتا تو اس کو بنیاد قرار دے کر تحدید آبادی کی اس اسکیم کو وجوب کا درجہ کس طرح دیا جا سکتا ہے جبکہ ان دونوں میں نسبت بھی، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں، ذرہ اور پہاڑ کی ہے۔

(باقی آئندہ)

تقریظ وتنقید

لِسَانُ القُرآن

تالیف:- عزیزؔ دانش

صفحات:- ۱۰۴

قیمت ایک روپیہ

شائع کردہ:- پاکیزہ دار الکتب : نزد ٹاور جیل روڈ۔ حیدرآباد (مغربی پاکستان)

نصف صدی سے پاک وہند میں قرآن حکیم کی زبان کی تحصیل کو سہل سے سہل تر بنانے کی جو کوششیں جاری ہیں، ان میں بعض قابل صد ستائش ہیں۔ "لسان القرآن" بھی اسی اہم سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں فاضل مؤلف نے فرمایا ہے کہ ان کے پیشِ نظر نہ محض جدت وسہولت ہے، نہ محض زبان اور نہ محض قواعد بلکہ ان سب کا ایک معتدل اور حسین امتزاج ہے۔ اس اصول کو انھوں نے حقیقتاً سامنے رکھا ہے اور آخر تک بڑی کامیابی سے نباہا ہے۔

یہ کتاب پانچ مختلف حصوں میں تکمیل کو پہنچے گی۔ اس وقت ہمارے پیش نظر اس کا پہلا حصہ ہے جو مبتدی کے لئے خاصا مفید ہے۔ اس کتاب کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں زبان کے ساتھ ساتھ قاری کو قرآن وحدیث کی تعلیمات ذہن نشین کرانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔

ہم عربی زبان کے شائقین کو اس اہم کتاب سے استفادہ کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ کتاب سفید کاغذ پر شائع ہوئی ہے اور اس کا معیار کتابت وطباعت اعلیٰ ہے۔

(م۔خ)

محمد علاء الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانیہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

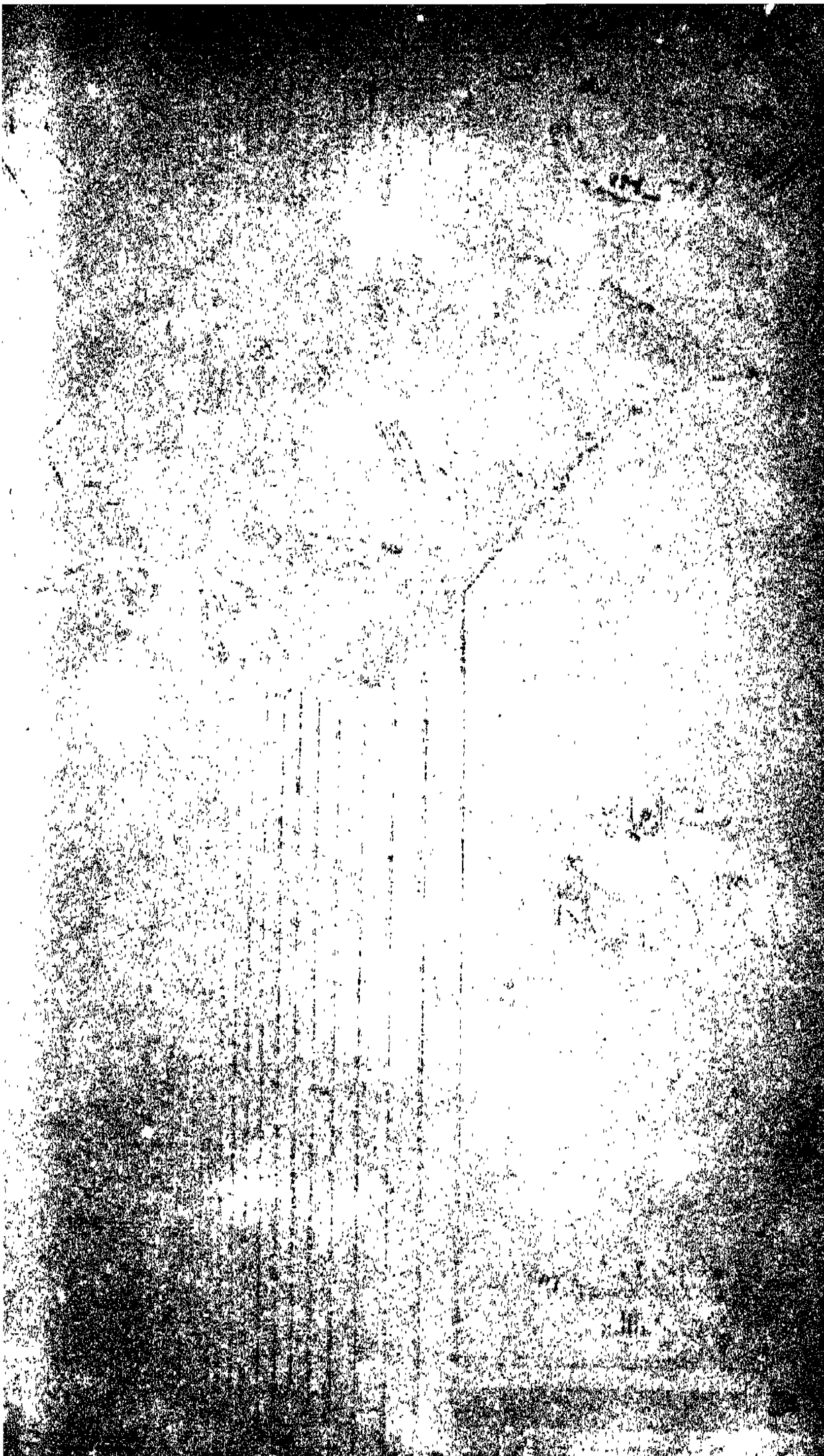
ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت
امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے
سالانہ چھ روپے [illegible]



ماہنامہ

میثاق

لاہور

جلد ۱۰ | رجب المرجب سنہ ۱۳۸۴ھ | شمارہ ۱۱

فہرست مضامین

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ:-

منیجر ماہنامہ میثاق ۰ رحمانپورہ اچھرہ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیلِ زر کا پتہ:-

منیجر دائرہ حمیدیہ ، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر۔ اعظم گڑھ (یوپی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ہمارے ملک میں اسلام کا حلیہ بگاڑنے والوں کا ایک گروہ تو جدید تعلیم کی بدولت بہت پہلے سے پیدا ہو چکا ہے اور اس کی کوششوں سے مذہب کے خلاف آئے دن نت نئے فتنے اٹھتے ہی رہتے تھے۔ لیکن جب سے جماعت اسلامی نے سیاست بازی کے میدان میں قدم رکھا ہے اس نے تحریفِ مذہب کے لیسے ایسے اصول ایجاد کرنے شروع کر دیے ہیں کہ اس میدان کے دوسرے تمام شاطروں کو اس نے مات دے دی ہے۔ مغرب زدہ طبقہ جو تحریف کرتا ہے اس کے لئے وہ یہ طریقہ اختیار کرتا ہے کہ جس چیز کو ماننا نہیں چاہتا اس کا سرے سے مذہب ہونا ہی تسلیم نہیں کرتا۔ اگر قرآن کی کوئی آیت اس کی مزاحم ہوتی ہے تو اس کی الٹی سیدھی کوئی تاویل کر دیتا ہے، اگر کوئی حدیث سامنے آتی ہے تو اس کو عجمی سازش قرار دے دیتا ہے۔ یہ شرارت بھی اگرچہ مذہب کے خلاف ایک بہت بڑی شرارت ہے لیکن ایک پہلو اس کا غنیمت ہے کہ اس سے تحریف کے لئے کسی مستقل فتنے کی بنیاد نہیں پڑتی لیکن جماعت اسلامی نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تحریف بھی کرتی ہے اور اس تحریف کے ساتھ تحریف کے لئے ایک مستقل اصول بھی وضع کر دیتی ہے تاکہ اس سے برابر انڈے بچے پیدا ہوتے رہیں۔

اس جماعت نے پہلے تو اسلام کے مختلف پہلوؤں پر بے شمار کتابیں لکھ لکھ کر چھاپیں۔ ملک کے کونے کونے میں ان کو پھیلایا۔ اس کے کارکنوں نے لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر وہ کتابیں پڑھوائیں، لیکن اب جبکہ اس کا اپنا ہی پھیلایا ہوا لٹریچر اس کے سیاسی اغراض کی راہ میں مزاحم

ہو رہا ہے، اور اسے ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنی ہی حرام ٹھہرائی ہوئی بعض چیزوں کو جائز قرار دے تو اس کے لئے اس نے جھٹ ایک اصول گھڑ دیا کہ دین میں جو چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں وہ دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جن کی حرمت ابدی اور قطعی ہے، ان کی حرمت کسی حالت میں حلت سے نہیں بدل سکتی۔ دوسری وہ ہیں جن کی حرمت شدید ضرورت کی حالت میں حلت سے تبدیل ہو جایا کرتی ہے۔ اس اصول کے تحت جماعت کے لئے یہ بات بالکل جائز ہے کہ جب اس کو شدید ضرورت پیش آ جائے، وہ دین کی حرام کی ہوئی چیزوں میں سے (جس کی حرمت اسے خود بھی تسلیم ہے) کسی چیز کو جائز قرار دے لیا کرے۔

یہ اصول ان حضرات کو مس فاطمہ جناح کی صدارت کے لئے ایجاد کرنا پڑا ہے۔ اس سے پہلے بہت سی حرمتوں کو حلت میں تبدیل کرنے کے لئے ان کو حکمت عملی کے نام سے ایک اصول وضع کرنا پڑا تھا جس کی تردید میں ہمیں انہی صفحات میں ایک سلسلہ مضامین لکھنا پڑا تھا۔ اب کے اگرچہ حکمت عملی کی اصطلاح استعمال کرنے کی جسارت تو نہیں کی گئی ہے لیکن بات وہی کہی گئی ہے جو پہلے کہی گئی تھی، صرف الفاظ ذرا سے بدلے ہوئے ہیں اس وجہ سے ہمیں مجبوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح ان حضرات کا "حکمت عملی" والا اصول ایک بدعتِ ضلالت تھا اسی طرح ان کا یہ نیا اصول بھی ایک بدعتِ ضلالت ہے، بلکہ بوجوہ یہ نیا اصول ضلالت ہونے کے اعتبار سے پہلے سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

شریعت نے حرمتوں کے درمیان نہ تو ابدی اور غیر ابدی، قطعی اور غیر قطعی کے قسم کی کوئی تفریق کی ہے نہ "شدید ضرورت" کے تحت کسی حرمت کے حلت میں تبدیل ہو جانے کا فتویٰ دیا ہے۔ یہ دونوں باتیں ان حضرات کے اپنے ذہن کی ایجاد ہیں اور مقصود ان کی ایجاد سے شریعت کی ان پابندیوں سے پیچھا چھڑانا ہے جن کو کتابوں میں لکھ کر فروخت کرنا تو آسان تھا لیکن سیاسی حوصلوں کے ساتھ اب عملاً ان کو نباہنا ان کے لئے ممکن نہیں رہا۔ شریعت میں جو بات کہی گئی ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر حرام سے بچو، البتہ اگر اکراہ یا اضطرار کی حالت پیش آ جائے تو اس صورت میں آدمی کو اس بات کی رخصت ہے کہ کسی حرام سے فائدہ اٹھا لے بشرطیکہ نہ اس حرام کا خواہش مند ہو نہ اس حد سے آگے بڑھے جو ضرورت

ضرورت کے لئے ناگزیر ہے۔

شریعت کا بہر علم رکھنے والا اس بات کو جانتا ہے کہ اکراہ یا اضطرار کے معنی "شدید ضرورت" کے نہیں ہیں۔ شدید ضرورت تو آدمی کو سردیوں میں گرم چادر کی، گرمیوں میں برف کی، غریب کو روپے کی اور خوشحال کو کوٹھی اور کار کی پیش آتی ہی رہتی ہے لیکن یہ ضرورتیں اس اضطرار میں داخل نہیں ہیں جس میں شریعت نے کسی حرام سے فائدہ اٹھا لینے کی اجازت دی ہے۔ اکراہ یا اضطرار کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی کو بے بسی کی ایسی حالت پیش آجائے کہ دو حرام چیزوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے کے سوا کوئی اور مفر باقی ہی نہ رہ جائے۔ اس صورت میں شریعت بلاشبہ اس بات کی رخصت دیتی ہے کہ آدمی دونوں حراموں میں سے اس حرام سے فائدہ اٹھالے جو نسبتاً اور مقابلتاً اہون ہے۔ حرام اور حرام کے درمیان یہ امتیاز ابدی اور غیر ابدی، یا قطعی اور غیر قطعی کی تقسیم کی بنا پر نہیں ہے۔ بلکہ پیش آمدہ صورت حال میں ایک کے اشد اور دوسرے کے شدید ہونے کی بنا پر ہے۔ فرض کیجئے ایک شخص کی گردن پر تلوار رکھ دی جاتی ہے کہ وہ اگر کلمۂ کفر نہیں کہتا تو اس کی گردن اڑا دی جائے گی تو اس کو رخصت ہے کہ وہ زبان سے کلمۂ کفر نکال کر اپنی جان بچالے جائے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس صورت میں ایک مومن کی جان کے مقابل میں کلمۂ کفر کہنے کی جو اجازت ہے تو اس وجہ سے نہیں ہے کہ کلمۂ کفر کی حرمت غیر ابدی اور غیر قطعی ہے بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ پیش آمدہ صورت میں اس کا اختیار کرنا نسبتاً اہون ہے ورنہ کلمۂ کفر کی حرمت کی ابدیت اور قطعیت میں کسی کلام کی گنجائش کہاں ہے؟ اسی طرح فرض کیجئے ایک شخص کی گردن پر چھری رکھ دی جاتی ہے کہ وہ کسی بے گناہ کو قتل کرے۔ ورنہ خود اس کو ذبح کر دیا جائے گا تو اس صورت میں چاہیئے کہ وہ اپنا ذبح ہو جانا گوارا کرے لیکن دوسرے کے خونِ ناحق کا بار اپنے سر نہ لے۔ اس کی وجہ بھی یہ نہیں ہے کہ ایک حرمت ابدی ہے اور دوسری غیر ابدی۔ ابدی دونوں ہیں، البتہ پیش آمدہ صورت میں مقابلتاً ایک اہون ہے۔

ان حضرات نے یہ بات سمجھنے میں بھی ٹھوکر کھائی ہے کہ شریعت کی کوئی حرمت "شدید ضرورت" کی حالت میں حلت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ "حرمت حلت میں تبدیل ہو جاتی تو پھر قرآن کو

ـیر باغ ولا عاد" کی شرط لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ حرمت حلت میں تبدیل نہیں ہو
۔ وہ بدستور باقی رہتی ہے البتہ بقدر سدِرمق اس سے جان بچا لینے کی رخصت حاصل ہو جاتی
۔ یہ رخصت، بہرحال رخصت ہے، عزیمت نہیں ہے۔ اس وجہ سے اگر کوئی شخص اضطرار
سی حرام سے فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے تو فائدہ اٹھالے لیکن اس کو یہ حق نہیں حاصل ہو جاتا کہ وہ
حرام کا ایک ہوٹل کھول کر ساری دنیا کو دعوت دینا شروع کر دے کہ آؤ لوگو، اضطرار پیش آگیا
، اس حرام کے لئے اپنے تن، من، دھن قربان کرو۔ اور اس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ نہ اضطرار
ی حالت ہے جو خود اپنے دوٹوں سے اپنے اوپر مسلط کی جائے اور نہ کوئی حرام چیز مسلمانوں
اندر یہ درجہ حاصل کرتی کہ لوگ اس کے لئے تن، من، دھن تینوں کی اکٹھی قربانیاں دینی شروع
یں ——— یہ باتیں ہم نے بالکل پہلی مرتبہ جماعت اسلامی کے ان فقہا ہی کی زبان سے
ہیں!

اضطرار و اکراہ کو "شدید ضرورت" سے تعبیر کرنا اور شرعی حرمتوں کو ابدی اور غیر ابدی یا قطعی
یر قطعی کے دو الگ الگ خانوں میں بانٹ دینا محض تعبیر کی عامیانہ غلطی نہیں ہے۔ بلکہ اسلامی شریعت
خلاف یہ دیدہ و دانستہ ایک ایسی شرارت ہے جس کی اگر بروقت بیخ کنی نہ کی گئی تو یہ فتنہ
ہ بہت جلدی پوری شریعت کو اپنے لپیٹ میں لے لے گی۔ جو شخص بھی چاہے گا بڑی آسانی
ساتھ کسی حرمت کے متعلق یہ کہہ دے گا کہ یہ ابدی اور قطعی حرمتوں میں سے نہیں ہے اور اس
ت اس کی شدید ضرورت لاحق ہو گئی ہے اس وجہ سے یہ حرمت اب حلت میں تبدیل ہو گئی۔
ہمارے ملک میں جتنے کام بھی خلاف شریعت ہو رہے ہیں، ان سب کے جواز کی دلیل اس
ل سے فراہم ہو سکتی ہے اور آئندہ جس حرمت کا بھی دروازہ کھولنا ہو، اس کے لئے یہ کنجی بے خطا
ت ہو گی۔ ہمارے مستغربین اب تک شریعت کو ذبح کرنے کے لئے جو چھری استعمال کر
ہیں وہ نہایت کند ہے لیکن جماعت اسلامی کی پھونکی ہوئی یہ تیز چھری اگر کہیں ان کے
لگ گئی تو پھر سمجھ لیجئے کہ جماعت کے اقتدار تک پہنچنے سے پہلے ہی ساری شریعت کا
یا ہو جائے گا۔ اسلامی فقہ کا وہ پورا باب جو عورتوں سے متعلق تھا وہ تو اس فتوے سے ان

حضرات، نے خود ہی ختم کر دیا ہے۔ بے پردگی، عورتوں اور مردوں کا آزادانہ اختلاط، عورتوں کی اخباری تصاویر، مخلوط تعلیم، عورتوں اور مردوں کے کھیلوں میں مقابلے، دفاتر میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں کی موجودگی اور اس قبیل کے دوسرے مسائل ان حضرات کے نہایت محبوب موضوعات تھے اور جماعت کے مقررین اور محررین ہر مجلس اور ہر تحریر میں ان عنوانات پر اپنی گرم گرم تحریروں اور تقریروں سے ارباب اقتدار کے خلاف حاضرین و قارئین کے ایمان گرمایا کرتے تھے، اب اس فتوے کے بعد یہ داستان تو ختم ہوئی۔ اگر کچھ ابواب فقہ باقی رہ گئے ہیں تو اب ان پر بھی لب کشائی کی جرأت کم از کم یہ حضرات تو نہیں کر سکتے۔ خود انہیں کی دلیل اُن کا منہ بند کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

ہم یہاں تھوڑی دیر کے لئے اس فرق کو نظر انداز کرتے ہیں جو "شدید ضرورت" اور "اکراہ و اضطرار" کے درمیان ہے۔ ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ ان حضرات نے "شدید ضرورت" سے اضطرار اور اکراہ ہی کو مراد لیا ہے۔ یہ فرض کر کے ان سے پوچھتے ہیں کہ آخر وہ کیا اضطرار لاحق ہوا کہ شریعت کی ایک حرمت کو (جس کی حرمت آج بھی آپ حضرات کے نزدیک "علی حالہ" قائم ہے) حلّت میں تبدیل کرنا پڑا؟

کیا یہ اضطرار پیش آیا کہ متحدہ محاذ کے چار شریکوں نے آپ حضرات کی رائے کا لحاظ کئے بغیر ایک عورت کی صدارت کا فیصلہ کر لیا اس وجہ سے آپ کو عورت کی صدارت و امارت کی حرمت کو حلّت میں تبدیل کرنا پڑا؟ اگر یہ اضطرار ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ متحدہ محاذ کی شرکت آپ حضرات کے نزدیک ایک ایسے وجوب شرعی کی حیثیت رکھتی ہے جس سے محروم ہونے کے مقابل میں شریعت کے ایک حرام کو حلّت میں تبدیل کر دینا اہون ہے۔ کیا آپ حضرات کا موقف یہ ہے؟ اگر موقف نہیں ہے تو پھر تو از روئے شرع یہ وہ اضطرار نہیں ہوا جو کسی حرام کو آپ حضرات کے لئے جائز قرار دے دے۔

ایک اضطرار یہ بھی ہو سکتا ہے کہ متحدہ محاذ کے اندر سرے سے کوئی مرد ہو ہی نہیں۔ اس وجہ سے عورت کے انتخاب پر مجبور ہونا پڑا ہو۔ اگر یہ بات تھی تو اس کمی کو باہر سے کوئی مرد تلاش کر کے پورا کیا جا سکتا تھا، آخر مس فاطمہ جناح بھی تو متحدہ محاذ سے باہر ہی کی ہیں۔ اگر باہر بھی کوئی مرد ایسا موجود نہیں تھا جو صدر ایوب کے مقابل میں کھڑا ہو سکے تو اسی اضطرار کے تحت جس کے تحت آپ نے مس فاطمہ جناح کو گوارا کر لیا، صدر ایوب ہی کو گوارا کر لیتے۔ آخر وہ گنہگار ہی ہیں، کافر تو نہیں ہیں؟ اگر کسی کو ایسی مجبوری پیش آ جائے کہ اس کے سوا چارہ نہ ہو کہ ایک عابدہ و زاہدہ عورت کی اقتداء میں نماز ادا کرے یا ایک گنہگار مسلمان مرد کی تو آخر وہ کیا کرے گا؟ عابدہ و زاہدہ عورت کو امام بنائے گا یا گنہگار مرد کو؟ اسلامی شریعت کی رو سے مس فاطمہ جناح تو درکنار حضرت رابعہ بصریہ کے پیچھے بھی ایک مرد کی نماز نہیں ہو سکتی لیکن ایک فاسق مسلمان کے پیچھے ہو سکتی ہے۔ یہی صورتِ حال بلا اختلاف سیاسی امامت کی اسلام میں ہے کہ ایک فاسق مسلمان تو مسلمانوں کا امیر ہو سکتا ہے لیکن ایک عورت ان کی امیر نہیں ہو سکتی اگرچہ وہ کتنی ہی عابدہ و زاہدہ ہو۔

ایک اضطرار جماعت کے امیر صاحب نے اپنی موچی دروازے کی تقریر میں پیش کیا ہے جو یہ ہے کہ "ایک طرف ایک مرد ہے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں ہے اور دوسری طرف ایک عورت ہے جس میں عورت ہونے کے سوا کوئی عیب نہیں" ان کا مطلب یہ ہے کہ اس وجہ سے انہیں اور ان کی جماعت کو مس فاطمہ جناح کو صدر ایوب پر ترجیح دینے پر مجبور ہونا پڑا۔

اگرچہ موچی دروازے میں کہی ہوئی باتیں سنجیدہ تنقید کی سزاوار نہیں ہوا کرتیں اور یہ بات تو خاص طور پر کہنے والے کے ذہنی عدم توازن کی غمازی کر رہی ہے لیکن ہم فی الواقع نہایت سنجیدگی سے ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اگر صدر ایوب میں مرد ہونے کے سوا کوئی اور خوبی نہیں ہے تو کیا آپ لوگوں کے اندر کوئی اتنا مرد بھی نہ تھا جو ایک ایسے مرد کا مقابلہ کر سکے جس میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں ہے؟

جہاں تک مس فاطمہ جناح کے بے عیب ہونے کا تعلق ہے اس میں کسی اختلاف کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ حضرات تو ان کے عورت ہونے کو عیب قرار دیتے ہیں، ہم تو اس چیز کو بھی کوئی عیب نہیں سمجھتے۔ جب مرد کے لئے مرد ہونا کوئی عیب نہیں تو عورت کے لئے عورت ہونا کیوں عیب قرار پائے؟ لیکن اس وقت زیر بحث ان کے عیوب نہیں بلکہ وہ فضائل و کمالات ہیں جو بحیثیت صدر ریاست کے ان کا پلہ بھاری کرنے والے ہیں۔ اس پہلو سے جو شخص بھی ان کے معاملے پر غور کرے گا وہ صرف ایک چیز پیش کر سکے گا کہ وہ قائد اعظم کی بہن ہیں لیکن اس فضیلت کو ظاہر ہے کہ صدارت کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں۔ صدارت کے مسئلہ سے تعلق تو مثلاً جماعت اسلامی کے نقطہ نظر سے اس چیز کو ہو سکتا ہے کہ وہ بڑی متبع کتاب و سنت ہوتیں، دین و دنیا کے معاملات میں ان کو بصیرت ہوتی، حسن تدبیر و سیاست میں ان کو ملکہ ہوتا، انتظام ملک کا ان کو تجربہ ہوتا۔ کیا کوئی شخص ایمان و دیانت کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان چیزوں کے لحاظ سے مس فاطمہ جناح کوئی درجہ و مرتبہ رکھتی ہیں؟ جہاں تک دین کا تعلق ہے عمل تو در کنار وہ اپنی تقریروں میں کبھی زبان سے بھی اس کا نام نہیں لیتی ہیں۔ اس کی شکایت ابھی پچھلے دنوں جماعت اسلامی کے ایک اخبار نے بھی کی ہے کہ وہ باتیں تو اچھی اچھی کہتی ہیں لیکن اسلام کا نام ان کی زبان پر نہیں آتا۔ رہا ملکی معاملات کا تجربہ تو مس فاطمہ جناح کے متعلق اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس میدان کی نہ وہ اہل ہیں اور نہ انہوں نے کبھی اس میدان میں قدم رکھا۔ برعکس اس کے صدر ایوب وہ ہیں کہ ان کے مخالف بھی اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے تدبر و سیاست سے پانچ چھ سال کے اندر اندر ملک کو اتنا مستحکم کر دیا ہے کہ اب پاکستان کے حلیف و حریف دونوں اس کا صحیح وزن محسوس کرنے لگے ہیں۔ مذہبی اعتبار سے اگرچہ ان کا بھی کوئی خاص وزن نہ ہو تاہم کردار کے پختہ ہیں، جری ہیں، صاف گو ہیں، عوام پسند ہیں اور ان کی ہر تقریر اسلامی قومیت کے جوش و جذبہ سے لبریز ضرور ہوتی ہے۔

ایک اضطرار یہ حضرات یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ مس فاطمہ جناح کے سوا کوئی دوسری شخصیت ایسی نہیں تھی جس کو صدارت کے لئے نامزد کیا جاتا تو اس کے منتخب ہونے کی توقع کی جا سکتی۔ یہ عذر ان حضرات کا اپنے نزدیک صحیح ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر کوئی اور صاحب کھڑے ہوتے تو صدر ایوب کے

مقابل میں محض پانچ سات فیصد ووٹ سے زیادہ نہ حاصل کر پاتے لیکن یہ چیز صدر ایوب کے حق میں جاتی ہے نہ کہ ان کے خلاف۔ اس حقیقت کی روشنی میں تو ان حضرات کو مضطر صدر ایوب کو قبول کرنے پر ہونا تھا نہ کہ مس فاطمہ جناح کی نامزدگی پر۔ اس لئے کہ صدر ایوبؒ کو یہ مقبولیت جو اس ملک میں حاصل ہے کہ ان کے مقابل میں متحدہ محاذ کے رجال میں سے کوئی صاحب کھڑے ہونے کی جرأت نہ کر سکے وہ اس بنا پر نہیں ہے کہ وہ قائداعظم کے بھائی ہیں بلکہ اس بنا پر ہے کہ انہوں نے اس ملک کی خدمت کی ہے۔ برعکس اس کے مس فاطمہ جناح کو جو مقبولیت حاصل ہے اس میں ہرگز کوئی دخل نہ تو اس بات کو ہے کہ انہوں نے ملک و قوم کی کوئی خدمت کی ہے اور نہ اس بات کو ہے کہ ان کے اندر ملک کے مسائل کو سمجھنے اور اس کے نظم و نسق کو چلانے کی کوئی خاص صلاحیت و قابلیت ہے بلکہ جو کچھ بھی ہے صرف اس بات کو ہے کہ وہ قائداعظم کی بہن ہیں۔ اگر یہ شرف ان کو حاصل نہ ہوتا تو وہ مجرّد اپنی خدمت و قابلیت کے بل پر شاید پانچ ووٹ بھی حاصل نہ کر پاتیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو اسلام یا ملک یا قوم کا خیر خواہ کس طرح سمجھا جائے جو ملک کی صدارت جیسے اہم مسئلے پر صرف اس پہلو سے غور کرتے ہیں کہ کون شخص صدر ایوب کو شکست دے سکتا ہے اور اس سوال کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں کہ صدر ایوبؒ کو شکست دے کر وہ ملک کو چلا بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ہر ایمان دار شخص اس امر کا اندازہ کر سکتا ہے کہ مس فاطمہ جناح کو جو شخص بھی ووٹ دے گا اس لئے نہیں دے گا کہ ان کے ہاتھوں ملک میں اسلامیّت کو فروغ ہوگا۔ یا ملک کو استحکام حاصل ہوگا، یا بین الاقوامی مجلس میں پاکستان کا وقار بڑھے گا بلکہ زیادہ تر وہ لوگ ان کو ووٹ دیں گے جن کی نگاہ میں ملک ملّت سے زیادہ اہمیّت رکھنے والا مسئلہ ان کے مادرِ ملّت ہونے کا ہے یا وہ لوگ جن کو صدر ایوب سے اللہ واسطے کا بغض ہے یا پھر وہ لوگ جو اپنی سادہ لوحی یا پاکستان دشمنی کی وجہ سے جمہوریت اور انارکی میں امتیاز نہیں کرتے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ جن لوگوں نے اس سب سے زیادہ اہم سیاسی و اجتماعی مسئلے میں قوم کے ایک اندھے بہرے جذبہ عقیدت سے فائدہ اٹھانے کی سوچی، یہاں تک کہ اس کو ثواب ثابت کرنے کے لئے اپنے اوپر اضطرار طاری کر کے شریعت کے حرام کو بھی حلال بنایا، وہ کبھی دین و ملّت کے خیر خواہ ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ اپنے اغراض کے لئے ہر وہ خطرناک کھیل کھیل سکتے ہیں جس سے ان کو اپنی غرض پوری ہوتی نظر آئے اگرچہ

ملک اس سے تباہ ہو جائے۔

یہ حضرات جمہوریت جمہوریت کا وظیفہ بھی اب بہت پڑھتے ہیں اور اس کا عشق بھی منجملہ ان چیزوں کے ہے جن کے سبب سے یہ مس فاطمہ جناح کی حمایت پر مجبور ہوئے۔

ان حضرات کی جمہوریت کی تاریخ یہ ہے کہ پہلے یہ جمہوریت کو ضلالت قرار دیتے تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلام کا اپنا ایک مستقل نظام سیاسی ہے جو ملوکیت، آمریت اور جمہوریت سب سے الگ ہے۔ جمہوریت حاکمیت عوام کے نظریہ پر مبنی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کو یہ شرک قرار دیتے تھے۔ اس فکر کا غلبہ اس وقت تک رہا جب تک یہ حضرات سیاست میں نہیں اترے تھے۔ سیاست کے میدان میں اترنے کے [illegible] میں اترنے [illegible]۔ بعد ان کو جمہوریت کے نعرے کی مقبولیت کا کچھ اندازہ ہوا تو انہوں نے آہستہ آہستہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسلامی نظام کے ساتھ ساتھ جمہوریت کا لفظ بھی استعمال کرنا شروع کیا، لیکن اس کے ساتھ "اسلامی" کا دُم چھلا لگا کر۔ پھر جب سیاست میں ذرا کچھ اور آگے بڑھے تو نری جمہوریت رہ گئی، "اسلامی" کا لفظ غائب ہو گیا اور اب اس وقت یہی حضرات جو انبیاء علیہم السلام کے طریقے پر ساری دنیا میں خالص اسلامی نظام قائم کرنے اٹھے تھے، مس فاطمہ جناح کی قیادت میں امریکی طرز جمہوریت کے مقابل میں برطانوی طرز کے پارلیمانی نظام کے حصول کے لئے تن۔ من۔ دھن تینوں کے ساتھ مصروفِ جہاد ہیں۔ اسلام اور اسلامی سب غائب ہو گئے وہ آغاز تھا یہ انجام ہے!

ہر واقف حال اس بات کو جانتا ہے کہ اس وقت صدر ایوب اور مس فاطمہ جناح میں جو جنگ ہو رہی ہے وہ نہ اسلام کے لئے ہو رہی ہے نہ جمہوریت کے لئے۔ ان دونوں ہی کے نزدیک نہ اسلام زیر بحث ہے، نہ جمہوریت مابہ النزاع - مابہ النزاع جو چیز ہے وہ یہ ہے کہ یہاں امریکی طرز کی جمہوریت چلے یا انگریزی طرز کی؟ ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے قیام سے بھی اسلام کی راہ کھلنے والی نہیں ہے کہ اس کی حمایت کوئی ایسا دینی مسئلہ بن جائے کہ اس کے لئے

اضطرار کی آڑ لے کر شریعت کے ایک حرام کو جائز کیا جائے ۔ جمہوریت اسلام کے لئے تو جب سازگار ہو سکتی ہے جب جمہور کے مزاج میں اسلامیت پیدا کی جائے ۔ اگر جمہور کے مزاج میں اسلامیت نہ ہو تو وہ خواہ انگریزی طرز کی ہو یا امریکی طرز کی ، وہ بڑی آسانی کے ساتھ مشہور مسخرے چارلی چپلن کو سیدنا مسیح علیہ السلام پر ترجیح دے دیتی ہے ۔ آخر متحدہ محاذ کی جمہوریت کا پہلا تجربہ تو ہو ہی چکا کہ باوجودیکہ اس کی شریک پانچ پارٹیوں میں سے تین اسلام کی مدعی تھیں لیکن انہوں نے اسلام کے احکام کے خلاف اپنا سربراہ ایک عورت کو بنایا ۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کی جرأت انہیں اسی وجہ سے ہوئی کہ انہیں اندازہ ہے کہ عوام کے ذہن پر اسلام کے حرام و حلال کا اتنا اثر نہیں ہو سکتا جتنا اس بات کا ہو سکتا ہے کہ صدر ایوب کا مقابلہ کرنے کے لئے قائد اعظم کی بہن اٹھی ہیں ۔ اب فرض کیجئے کہ مس فاطمہ جناح کامیاب ہو جاتی ہیں تو ان کے وعدے کے مطابق صدارتی نظام کے بجائے یہاں پارلیمانی نظام آ جائے گا ۔ لیکن اسلامی نظام کدھر سے آجائے گا "

بہرحال اس وقت ہمارے صدرین میں جو جنگ ہے اس میں اصل مسئلہ پارلیمانی نظام اور صدارتی نظام کا ہے ۔ اس میں سے کسی کے حق میں بھی وحی نہیں اتری ہے کہ اس کے قیام سے اسلام کے قیام کو وابستہ کر دیا جائے ۔ ان پر اگر بحث ہو سکتی ہے تو ان کی صلاحیت کار کے پہلو سے ہو سکتی ہے اور ہمارے نزدیک ان کا حسن و قبح دونوں اضافی نوعیت کا ہے ۔ جس ملک میں وحدتِ فکر ہو ، تعلیم عام ہو ، عوام کے جذبات و رجحانات ہموار ہوں ، سیاسی جماعتوں اور لیڈروں میں جمہوریت کے حقوق کے ساتھ ساتھ اس کی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہو وہاں پارلیمانی نظام کامیاب ہو جاتا ہے لیکن جہاں یہ چیزیں موجود نہ ہوں وہاں اس سے انتشار اور ابتری کے پھیل جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور جمہوریت انارکی میں تبدیل ہو جاتی ہے ۔ صدارتی نظام میں یہ خوبی ہے کہ یہ جمہوریت کے ساتھ ساتھ ملک کے استحکام کا بھی ضامن ہے ۔ اور ملک کا استحکام ایک ایسی چیز ہے جس کے لئے پارلیمانی نظام تو درکنار دین کے سوا دنیا کی ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے ہم پارلیمانی نظام کی بے آبرو دیوں کا نہایت تلخ تجربہ کر چکے ہیں ۔ اور آئندہ اگر اس کا مزید تجربہ کرنے کی کوشش

کی گئی تو اس کا نتیجہ ملک کی تباہی کے سوا کچھ اور نہیں نکل سکتا۔ یہاں عوام کے سیاسی شعور کا عالم یہ ہے کہ بعضوں کے لئے یہ فرق کرنا بھی مشکل ہو رہا ہے کہ اس وقت یہاں ملّت کے لئے ماں کا انتخاب ہو رہا ہے یا ریاست کے لئے صدر کا۔ انگریزی دور کا یہ ذہن ابھی ہمارا بدلا نہیں ہے کہ جو اقتدار پر ہو اس کو شیطان سمجھو اور جو اقتدار سے محروم ہو اور لوگوں سے بے سروپا وعدے کر سکے اس کو فرشتہ قرار دو۔ ملک میں مرکز گریز طاقتیں ہی نہیں بلکہ ملک دشمن عناصر بھی ہر جسے میں مصروف سازش ہیں جو پختونستان قائم کرلے اور مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں سیاسی کردار کی بے اعتباری کا یہ عالم ہے کہ چوہدری محمد علی صاحب جیسے جیسے لوگ حصول اقتدار کی طمع میں عواقب و نتائج سے آنکھیں بند کرکے "مادر ملت" کے نام سے ان تمام عناصر کو صلائے عام دے دیتے ہیں جن کے درمیان ایوب دشمنی کے سوا اور کوئی بھی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کو بھی چوہدری صاحب "مادر ملت" کے جھنڈے کے نیچے جمع کر رہے ہیں جن کی آزردگی کا باعث ون یونٹ قائم کرکے چوہدری صاحب خود ہوئے ہیں۔ مذہبی بے ضمیری کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ کل تک گلی گلی میں لوگوں کو پیغمبرؐ کا یہ قول سناتے پھر رہے تھے کہ عورت کی حکومت میں جینے سے زیرِ زمین دفن ہو جانا بہتر ہے وہ "مادرِ ملت" کا جھنڈا اٹھائے اور ان کا نعرہ لگاتے پھر رہے ہیں اور بے شرمی کا یہ عالم ہے کہ اس کو اقامت دین کا جہاد قرار دے رہے ہیں۔ جس ملک میں ایسے انتشار پسند اور ناقابلِ اعتماد عناصر کارفرما ہوں وہاں جمہوریت کی وہی شکل کامیاب ہو سکتی ہے جو ایک مضبوط مرکز کے نظم و ضبط میں ہو۔

لیکن اس وقت ہمیں مسئلے کے سیاسی پہلو سے بحث نہیں ہے۔ اس پر ضرورت ہوگی تو ہم آئندہ بحث کریں گے اس وقت ہم صرف اس کے اسلامی پہلو سے بحث کرنا چاہتے ہیں کہ آخر مس فاطمہ جناح کی صدارت اور متحدہ محاذ کی حمایت میں اسلام کی بہبود کا پہلو کیا ہے؟ یہ حضرات بڑی جرأت کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بعض علماء نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر اسلام کی مصلحت ہو تو عورت کو حکمراں بنایا جا سکتا ہے؟ چلیے ہم نے مانا کہ بنایا جا سکتا ہے لیکن وہ اسلامی مصلحت کیا ہے جس کے لئے مس فاطمہ جناح کا انتخاب کیا گیا ہے؟ ہم ان کے ذاتی تقویٰ و تدیّن اور ظواہر شریعت

کے احترام سے کوئی بحث نہیں کرتے اس لئے کہ ان چیزوں کو تو اندھے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ ہم صرف یہ پوچھتے ہیں کہ ہے کوئی ثقہ شہادت اس بات کی موجود کہ انھوں نے اپنی ساری زندگی کی کسی تقریر یا بیان میں کبھی اسلام کا بھی نام لیا ہو یا کوئی چھوٹا یا بڑا کام دینی نوعیت کا بھی کیا ہو؟ اس معاملے میں ان کی وضعداری کا تو یہ عالم ہے کہ الیکشن کے زمانے میں بھی جس میں رندان قدح خوار بھی زاہدانِ شب زندہ دار بن جاتے ہیں، کبھی یہ غلطی نہیں کرتیں کہ بھول کر ہی اسلام کا نام لے جائیں اور اس کی شکایت ہم سے زیادہ خود انہی حضرات کو پہلے بھی تھی اور دبی زبان سے اب بھی ہے لیکن اب مادرِ ملت کی وفاداری کا جوش اس زور سے ابھرا ہے کہ اس ملک میں اسلام کا قیام تنہا اب انہی کے دم سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔

اسلامی مصلحت کے زاویہ سے ذرا ایک نظر متحدہ محاذ کے عجائب گھر پر بھی ڈالئے۔ اس میں مولانا بھاشانی ہیں جو شروع سے بے داغ سوشلزم یا کمیونزم کے علمبردار ہیں۔ ان کی شخصیت محاذ میں اس پہلو سے سب سے زیادہ موثر ہے کہ محاذ کو جتنی کچھ بھی کامیابی کی توقع ہے وہ دراصل مشرقی پاکستان ہی سے ہے۔ اس میں محمود علی قصوری صاحب ہیں جو ابتدا سے لادینی نظام کے بڑے زبردست داعی ہیں اور اشتراکیت پسندانہ رجحانات رکھنے کی وجہ سے ہر انتشار اور ہر انتشار پسند کے لئے ان کی آغوش کشادہ رہتی ہے۔ اس میں چوہدری محمد علی صاحب ہیں جو یوں تو اسلامی نظام کے علمبردار ہیں لیکن سنتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے لئے وہ اضطرار انہی نے پیدا کیا جس کے تحت اسے مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حمایت میں اللہ و رسول کو چھوڑنا پڑا۔ اس کے ایک رکن اعظم جنرل اعظم خاں بھی ہیں جو کل تک تو ختم نبوت کا نعرہ لگانے والوں کو پھانسیاں دیتے تھے، جن میں جماعت اسلامی کے امیر بھی شامل تھے۔ لیکن اب اقامتِ دین کا مستقبل ان کی ذات سے بھی وابستہ ہو گیا ہے۔ جماعت اسلامی کے لوگوں نے ایک زمانے میں جتنی گالیاں ان کو دی ہیں شاید ہی اس ملک میں کسی اور کو دی ہوں لیکن اب جماعت کے شیوا بیان نامہ نگاروں کے قلم سے ان کا ذکر جمیل پڑھیئے تو ایسا محسوس ہوگا کہ اسلاف میں سے کسی مجاہد اعظم کا ایمان افروز تذکرہ ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم کا ذکر ہم اس لئے نہیں کرتے کہ اب وہ اپنے

سب کے پاس پہنچ چکے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان سب میں دیندار اور شریف وہی تھے۔
یہ متحدہ محاذ ہے جس کا باب جماعت اسلامی اس ملک میں اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ سمجھتی ہے
اس محاذ نے پہلا اسلامی کارنامہ جو انجام دیا ہے وہ صدارت کے لئے مس فاطمہ جناح کی نامزدگی
ہے۔

یہ حضرات اضطرار کے علاوہ ایک اور دلیل یہ بھی پیش کرتے ہیں کہ ملکۂ سبا جب حضرت سلیمانؑ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لائیں تو اس وقت حضرت سلیمانؑ پر یہ وحی نہیں اتری کہ عورت کا بادشاہ رہنا ٹھیک نہیں ہے۔

اوّل تو ان بوالفضولوں سے کوئی یہ پوچھے کہ جب عورت کی بادشاہت پر یہ سبائی حجت تمہارے پاس موجود تھی تو پھر اضطرار کے آڑ میں پناہ لینے کی ضرورت کیا تھی؟ پھر تو خم ٹھونک کر یوں کہنا تھا کہ جس طرح سبا والوں نے ملکہ بلقیس کو اپنی ملکہ بنایا تھا اسی طرح ہم مس فاطمہ جناح کو اپنی ملکہ بنا رہے ہیں۔

دوسری یہ کہ یہ لوگ حضرت سلیمانؑ کی شریعت کے پیرو ہیں یا حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے؟ ہم نے مانا کہ حضرت سلیمانؑ پر ملکہ سبا کی بادشاہت کے بارے میں کوئی وحی نہیں آئی لیکن رسول اللہ پر تو عورت کی امارت کی حرمت کی وحی آئی۔ اور اس حرمت کے سب سے زیادہ زور دار بیان کرنے والے یہی تھے تو حضرت سلیمان کی شریعت رسول اللہ کی شریعت کی ناسخ ہے یا رسول اللہ کی شریعت حضرت سلیمانؑ کی شریعت کی؟

تیسری یہ کہ حضرت سلیمانؑ پر عورت کو بادشاہ بنانے کی حرمت کی وحی تو جب آتی کہ انہیں اسرائیلی شریعت کا یہ حکم معلوم نہ ہوتا کہ عورت حکمران نہیں ہو سکتی اور وہ ملکہ سبا کو کہیں کا بادشاہ بنانے کا ارادہ کرتے۔ قرآن سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ تو یہ ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکہ سبا کا تخت و تاج سب اپنے دربار میں منگوا لیا اور خود ان کو بھی اپنے دربار میں فرمانبردارانہ حاضر ہونے کا حکم دیا اور انہوں نے ان کے حکم کی تعمیل بھی کی۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ قرآن اس بارے میں خاموش ہے۔ لیکن قرینے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے ان کو اپنے حرم میں داخل کر لیا۔ تو جب صورت معاملہ یہ تھی تو حضرت سلیمانؑ پر وحی کس بات کے لئے آتی؟

چوتھی یہ کہ اگر ملکہ سبا کی بادشاہت مس فاطمہ جناح کی صدارت کے لئے دلیل بن سکتی ہے تو کیا حضرت سلیمان کی بادشاہت پاکستان میں جمہوریت کے بجائے بادشاہت کے قیام کے لئے دلیل نہیں بن سکتی؟ کیا حضرت سلیمانؑ نے اپنے ملک میں کوئی جمہوریت قائم فرمائی تھی یا انگریزی طرز کا پارلیمانی نظام قائم کیا تھا؟ اگر صدر ایوب اس دلیل سے فائدہ اٹھا کر اپنی بادشاہی کا حق جتانا شروع کر دیں تو ان فقیہوں کے پاس ہے اس کا کوئی جواب؟

پانچویں یہ کہ تورات، زبور، انجیل اور انبیاء کے دوسرے صحیفوں میں عورت کی حیثیت کیا بیان ہوئی ہے؟ کیا یہی کہ وہ ملکۂ سبا کی طرح حکمرانی کرے؟ ہم بنی اسرائیل کی پوری تاریخ از سیدنا حضرت اسحاقؑ تا سیدنا حضرت مسیحؑ سے ثابت کر سکتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں عورت کی حکمرانی کا نہ صرف یہ کہ کوئی تصور موجود نہیں ہے بلکہ اس کی کامل نفی موجود ہے۔

لیکن اس جہل کے ساتھ ذرا بد دماغی ملاحظہ ہو کہ ان مہمل دلائل پر ساری دنیا کو تحدی کی جا رہی ہے کہ کوئی ثابت کر دے کہ اسلام میں عورت کی صدارت و امارت جائز نہیں ہے۔ جماعت اسلامی کے امیر صاحب سے زیادہ فقہ اور شریعت تو حضرت سلیمانؑ کے ہدہد کو بھی معلوم تھی کہ اس لئے جب حضرت سلیمانؑ کو ملک سبا سے متعلق رپورٹ دی ہے تو اس نے جہاں اہل سبا کی سورج پرستی کا بانداز استخفاف ذکر کیا وہیں اسی انداز استخفاف میں اس بات کا بھی ذکر کیا کہ ان کے اوپر ایک عورت حکومت جمائے بیٹھی ہے۔

یہ حضرات آج بڑی عقیدت و احترام کے ساتھ بعض مفتیوں کے فتوے بھی اپنے ووٹروں کو سناتے پھر رہے ہیں۔ ہم ان پر بھی تنقید کر کے ان کی لغویت واضح کرنا چاہتے ہیں لیکن ابھی ہمیں اس امر میں تردد ہے کہ یہ فتوے فی الواقع انہی لوگوں کے ہیں جن کی طرف یہ منسوب کئے جا رہے ہیں۔ اس تردد کی [illegible] ہے کہ بعض اشخاص کے بارے میں ان لوگوں کا جھوٹ بالکل واضح ہے۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے کہیں بھی وہ فضول بات نہیں لکھی ہے جس کا یہ لوگ حوالہ دیتے پھر رہے ہیں۔ ایک فتویٰ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ فتویٰ قطع نظر اس سے کہ موجودہ صورت حال سے غیر متعلق ہونے کے بجائے خود بھی ایسا بے معنی اور غیر منطقی ہے کہ ہم باور نہیں کر سکتے کہ یہ

مولانا تھانوی کا ہے۔ ہمارا گمان یہ ہے کہ یہ کسی کم سوا مفتی کا فتویٰ ان کے نام سے منسوب کر دیا گیا ہے۔ اگر تحقیق سے ثابت ہوا کہ یہ انہی کا ہے تو ہم اس پر بھی مفصل تنقید کریں گے۔ لہ ایک مفتی کا یہ فتویٰ پیش کیا جا رہا ہے کہ عورت کی امارت اگرچہ آثار قیامت میں سے ہے لیکن اس صورت میں اس کا امیر بنانا جائز ہے جبکہ اس کو امیر بنانے میں دین کا فائدہ یقینی ہو اور وہ پردے میں رہے۔ کوئی ان اللہ کے بندوں سے پوچھے کہ عوام کو ان فتووں سے الجھن میں ڈال کر آخرت کی کون سی کمائی کر رہے ہو؟ تم اقامت دین کے دعوے سے اٹھے تھے یا قوم پر آثار قیامت مسلط کرنے کے ارادے سے؟ رسول کی حدیث اور تمہارے اس مفتی کے فتوے کی رو سے مس فاطمہ جناح کی صدارت کا آثار قیامت میں ہونا تو یقینی ہو گیا، اب یہ ثابت کرو کہ ان کی صدارت میں دین کا نفع یقینی ہے۔ چلو یقینی نہیں دین کے نفع کا کوئی دور قریب امکان ہی ثابت کر دو۔ چلو یہ بھی نہ سہی یہ فرماؤ کہ مس فاطمہ جناح پردہ کرتی ہیں؟ کیا ۷۰ سال کی زندگی میں کبھی انہوں نے پردہ کیا ہے؟ یہ بھی چھوڑو یہ بتاؤ کہ وہ پردے کی قائل بھی ہیں؟ کیا ان کی صدارت سے یہ توقع رکھتے ہو کہ ملک میں بے حجابی و بے پردگی کی اصلاح ہوگی؟ چلو یہ سب چھوڑو، ایمان داری سے بتاؤ کہ مس فاطمہ جناح عائلی قوانین کے حق میں ہیں یا اس کے خلاف؟ یہی ایک ترمیم دفعہ اسلام کے نام سے نو نکاتی پروگرام میں عوام کو بیوقوف بنانے کے لئے شامل کی گئی ہے لیکن اس کا بھی یہ حال ہے کہ متحدہ محاذ کا پورا کنبہ مادر ملت سمیت اس کو اپنے پروگرام سے خارج کرنے کا خواہش مند ہے۔ پھر دین کی وہ کون سی چیز ہے جس کے قائم کرنے کی امید پر مسلمانوں کو یہ دعوت دے رہے ہو کہ وہ خود اپنے ووٹوں سے اپنے اوپر وہ شامت مسلط کر لیں جس کو ان کے پیغمبر نے آثار قیامت میں سے گنایا ہے!

ان لوگوں کے سامنے جب عورت کی صدارت کی حرمت کے بارے میں خود ان کے فتوے رکھے جاتے ہیں تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کہتے ہیں کہ لوگ ہمارے فتووں کا اس طرح حوالہ دیتے ہیں گویا یہ ہمارے سب فتووں پر آج تک عمل کرتے رہے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ آپ کے ہر منفرد کی

لہ اب سنا ہے کہ اسی فتوے کی بنیاد پر مفتی شفیع صاحب نے بھی کوئی فتویٰ دیا ہے اس وجہ سے اس پر تنقید ضروری ہو گئی ہے۔ آئندہ شمارے میں اس کو ملاحظہ فرمائیے۔

ن آج جن مفتیوں کی مدح خواں ہے کیا آج تک آپ انہی مفتیوں کے فتووں پر عمل
تے رہے ہیں ؟ لوگ جو آپ کے سامنے آپ کے فتوے پیش کرتے ہیں تو اس لئے پیش
رتے ہیں کہ آپ اپنے ہی تحریر فرمائے ہوئے فتووں پر خود کیوں نہیں عمل کرتے ؟ دوسرے
جب عمل کریں جب مفتیوں کو خود اپنے فتووں پر عمل کرتے دیکھیں۔ جب لوگ دیکھتے ہیں کہ
پ کے فتوے آپ کی خواہشات کے محور پر گھومتے ہیں ، ایک چیز جو کل تک حرام تھی، آج
سیاسی اغراض کے لئے جائز ہو جاتی ہے تو ایسے دین باز مفتیوں کے فتووں کا بہترین مصرف
ی یہی سمجھتے ہیں کہ ان کا ہر مجلس اور ہر کوچہ و برزن میں مذاق اڑایا جائے ۔ چنانچہ یہی اس وقت
ر رہا ہے اور شاید یہی کھیل اس اقامتِ دین کے ڈرامے کا آخری کھیل ہے ۔

ان حضرات کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ جب ایوب صاحب کی حکومت میں عورت سفیر اور
زیر بنتی ہے تو ہم اگر ایک عورت کو صدر بنا رہے ہیں تو لوگوں کو اس پر کیوں اعتراض ہے ۔
م نیاز مندوں کو تو جو اعتراض ہے وہ ایوب صاحب پر بھی ہے اور ان حضرات پر بھی ہے ۔
بتہ ان حضرات پر زیادہ ہے ۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مذہب کے مدعی رہے ہیں اور کل تک
ورت کی حکومت کو حرام ٹھہراتے رہے ہیں ۔ ایوب صاحب کو ان پر جو اعتراض ہے وہ
س بنا پر نہیں ہے کہ وہ عورت کی حکومت کو حرام سمجھتے ہیں ، وہ تو مذہب جمہوریت کے
ئل ہیں اس وجہ سے عورت کی حکومت کو حرام سمجھنے کا ان کے ہاں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
ہیں جو مذہب یاد آیا ہے وہ ان حضرات کے فتووں کے یاد دلانے سے آیا ہے ۔ آخر وہ
ن کی جوتی ان کے سر پر کیوں نہ ماریں ؟ انصاف کی بات تو یہ ہے کہ ان حضرات کو تو ایوب
احب پر اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے اس لئے کہ یہ حضرات آج جمہوریت کے بھی بڑے
سردار ہیں اور جمہوریت کے نقطہ نظر سے ایوب صاحب کا عورت کو وزیر و سفیر بنانا قابل
عتراض نہیں لیکن ایوب صاحب کو ان کی پھبتی اڑانے کا حق ہے اس لئے کہ یہ حضرات
ذہب کے بھی دعویدار ہیں اور مذہب کی رو سے ، انہیں خود اعتراف ہے کہ عورت کی حکومت
ئز نہیں ۔

بعض سادہ لوحوں کی طرف سے یہ بات بھی کہی جا رہی ہے کہ جب حکومت میں مختلف قسم کی خلاف شرع باتیں ہو رہی ہیں تو آخر عورت کی صدارت ہی کے مسئلہ کو ایک شرعی اور دینی مسئلہ کیوں بنا لیا جائے۔ اہل دین کی زبان سے اس عذر کا پیش کیا جانا انتہائی ضعف ایمان کی دلیل ہے۔ اہل ایمان کا فریضہ ہر منکر کے خلاف آواز اٹھانا ہے۔ اسی سے وہ عند اللہ اس منکر کی ذمہ داریوں سے بری ہو سکتے ہیں۔ اس دلیل کی بنا پر کہ جب بہت سے منکر ہو ہی رہے ہیں تو ایک نئے منکر کے خلاف آواز کیوں اُٹھائی جائے ایک ایسی بات ہے جو زندہ ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ اہلِ دین اگر ایک منکر کے وجود کو دوسرے اس سے ہزار درجے بڑے منکر کے جواز کی دلیل بنائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے شیطان کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے کوئی شخص اگر صدر ایوب سے ناراض ہے تو وہ خدا کی شریعت سے بیزار کیوں ہو جائے اور اس کو شیاطین کے ہاتھوں تاراج ہونے کے لئے کیوں چھوڑ دے؟ غیرت ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس منکر پر بھی نکیر کیجئے جو صدر ایوب کے ذریعہ سے پھیلے اور اس منکر کی بھی بیخ کنی کیجئے جو مذہب کے مدعیوں کے ہاتھوں برپا ہو رہا ہے اور جو صرف ایک منکر ہی نہیں بلکہ منکرات کے فتح باب کا ایک شیطانی فلسفہ بھی اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ اگر ایک جماعت سیاست کے جنون میں مذہب کو بازیچہ اطفال بنا ڈالے اور اہلِ دین سیاسی مصالح ہی کے تحت اس سے اغماض کی پالیسی اختیار کریں تو یہاں اندیشہ ہے کہ دونوں ہی کی یہ سیاست بارگاہ الٰہی کے ہاں ایک ہی درجے کا جرم ٹھہرے گی۔ ہمارے دینی حلقوں کو یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت جو خاموشیاں ہوتی ہیں بعض اوقات وہ ایسے حالات پیدا کر دیتی ہیں کہ ہمیشہ کے لئے زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔ خدا اپنی شریعت کے معاملے میں بڑا غیور ہے!!

بہرحال جو لوگ آج شریعت کے ایک حرام کو اس دلیل سے جائز ٹھہرا رہے ہیں کہ اس حرام کے جائز کر لینے سے دین کی کامیابی کی راہیں کھلیں گی وہ اپنے آپ کو اللہ و رسول سے زیادہ عقلمند سمجھتے ہیں۔ رسول نے تو اُمت کو یہ تعلیم دی کہ جو قوم اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں پکڑا دے گی وہ کبھی فلاح نہیں پائے گی۔ یہ اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ شریعت کی ہر حرمت

ابدی نہیں ہے، آج اگر فلاح حاصل کرنا چاہتے ہو تو مس فاطمہ جناح کو اپنا حکمران بناؤ۔ پیغمبر صادق نے تو فرمایا کہ عورت کی حکومت میں جینے سے زمین میں گڑ جانا بہتر ہے اور یہ دعوت دیتے ہیں کہ مس فاطمہ جناح کو صدر بنانے کے لئے تن، من، دھن کی قربانی دو۔ یہ کہتے ہیں کہ صدر ایوب کی حکومت میں فسق و فجور ہے، مس فاطمہ جناح اس کی اصلاح کریں گی، حالانکہ از روئے شریعت مس فاطمہ جناح کی صدارت بجائے خود ایک فسق و معصیت ہے تو فسق سے فسق کی اصلاح کیا ہوگی؟ یہ کہتے ہیں کہ صدر ایوب دین سے ہٹے ہوئے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ صدر ایوب اگر دین سے ایک فرلانگ دور ہیں تو مس فاطمہ جناح دین سے ایک میل دور ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ صدر ایوب میں مرد ہونے کے سوا کوئی خوبی نہیں اور مس فاطمہ جناح میں عورت ہونے کے سوا کوئی عیب نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ صدر ایوب کا اس درجے کا مرد ہونا کہ متحدہ محاذ کا کوئی مرد ان کے مقابل میں کھڑے ہونے کی جرأت نہ کر سکا بجائے خود ایک ایسا وصف ہے جو صدارت کے لئے ان کے استحقاق کی کافی دلیل ہے۔ رہیں مس فاطمہ جناح تو ان کی ذات کو اگر "بے عیب" بھی مان لیجئے جب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ ان میں صدارت کا اہل ثابت کرنے والا ہنر کون سا ہے؟ رہا متحدہ محاذ تو وہ اس ملک کے تمام دین دشمن اور ملک دشمن عناصر کا مجموعہ ہے بلکہ سچ پوچھئے تو دین کے مخالفوں کو پبلک کے سامنے آنے کی جرأت متحدہ محاذ کے پلیٹ فارم ہی سے ہوئی ہے۔ اس سے پہلے وہ پبلک کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ جماعت اسلامی کی ان کے ساتھ ملی بھگت بھی دین دشمن عناصر ہی کی کامیابی ہے اس لئے کہ تحریف دین کے جو اصول اس جماعت کے پاس ہیں وہ اور کسی کے پاس بھی نہیں ہیں۔

اب اوپر کی بحثوں کا خلاصہ ذہن میں محفوظ کر لیجئے۔

۱۔ شریعت کی حرمتوں میں ابدی اور غیر ابدی، قطعی اور غیر قطعی کی کوئی تفریق و تقسیم نہیں ہے۔ سب حرمتیں ابدی اور قطعی ہیں۔ یہ تقسیم شیطان کا اٹھایا ہوا فتنہ ہے اور اگر آج اس کا سر نہ کچل دیا گیا تو شیطان اس حربے سے کام لے کر ساری شریعت کو تاراج کر کے رکھ دے گا۔

۲۔ شریعت کی کوئی حرمت "حکمت عملی" یا "عملی ضرورت" یا "شدید ضرورت" یا "مصلحت" کے عذرات پر حلت میں نہیں تبدیل ہو جاتی بلکہ اکراہ و اضطرار کی حالت میں اس کو

حرام سمجھتے ہوئے، احتیاط اور بے دلی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا لینے کی رخصت حاصل ہو جاتی ہے۔

۳۔ اکراہ و اضطرار کے معنی شدید ضرورت کے نہیں ہیں کہ جو شخص جب چاہے شدید ضرورت کے عذر پر حرام کو حلال بنا لیا کرے بلکہ بے بسی کی اس حالت کے ہیں جس میں گھر جانے کے بعد آدمی کے لئے دو حراموں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی راہِ فرار باقی ہی نہ رہ جائے۔ اس صورت میں شریعت نے اجازت دی ہے کہ اس حرام سے فائدہ اٹھائے جو دونوں میں مقابلتہً اہون ہو۔ اگر کوئی تیسری راہ مل سکنے کی گنجائش ہو جو جائز ہو تو پھر یہ اضطرار نہیں ہے۔

۴۔ اہون اور غیر اہون کا فرق ابدی اور غیر ابدی، قطعی اور غیر قطعی کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ پیش آمدہ صورت میں مصلحت شریعت اور حقوق عباد کے لحاظ پر ہے۔ ایک مومن جان بچانے کے لئے کلمۂ کفر کہہ سکتا ہے لیکن کسی مسلمان کو قتل نہیں کر سکتا۔ کیا یہ فرق اس بنیاد پر ہے کہ کلمہ کفر کی حرمت غیر ابدی اور غیر قطعی ہے اور حرمتِ نفس قطعی اور ابدی؟ قطعی اور ابدی تو دونوں ہیں لیکن برعایت حقوق عباد ایک کی اجازت ہے۔ دوسرے کی اجازت نہیں۔

۵۔ اگر مسلمانوں کے سامنے امامت و امارت کے لئے انتخاب کا سوال آئے تو وہ مجبوری پر ایک فاسق مسلمان کا تو انتخاب کر سکتے ہیں لیکن ایک عورت کا انتخاب نہیں کر سکتے اگرچہ وہ زاہدہ عابدہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر تمہارے اوپر ایک نکٹا حبشی بھی امیر بن جائے تو اس کی اطاعت کرنا مگر یہ نہیں فرمایا کہ اگر ایک عورت بھی تمہاری امیر بن جائے تو اس کی اطاعت کرنا۔

۶۔ حکمران اور امیر کے معاملے میں تدبر، سیاست اور صلاحیتِ کار کو دینی نقطہ نظر سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ جیسے امام الاتقیا کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر امیر کے انتخاب کا سوال درپیش ہو، ایک طرف ایک دیندار شخص ہو لیکن اسے انتظامِ ملک کا تجربہ نہ ہو دوسری طرف ایک ایسا مسلمان ہو جو زیادہ دیندار تو نہ ہو لیکن اسے انتظامِ ملک کا تجربہ ہو تو ترجیح اس کم دیندار اور زیادہ تجربہ کار کو دی جائے گی۔ یہی رائے اس معاملے میں امام ابن تیمیہؒ کی ہے۔ اب ہم

شخص خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک طرف ایک قدآور، ایک بہادر، ایک صاحبِ عزم، ایک صاحبِ تدبیر و سیاست زعیم ہے جس کا سینہ قوم و وطن کی سربلندی کے جذبے سے معمور ہے۔ دوسری طرف مس فاطمہ جناح ہیں جو اب سنا ہے ۷۲ سال کی ہو چکی ہیں اور اتنی عمر میں نہ انہوں نے دین کا کوئی تجربہ کیا نہ دنیا کا لیکن تمام دین دشمن اور ملک دشمن عناصر کو لے کر اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ کہ یہ ملک میرے بھائی کی یادگار ہے۔ ان کے بھائی کی یادگار تو بے شک ہے لیکن کیا ان کے عظیم بھائی نے ان کو یہ بھی وصیت کر دی تھی کہ میں اس کو ساری دنیا سے لڑ کے بنا کے جا رہا ہوں، تم میرے اور پاکستان کے سارے دشمنوں کو جمع کر کے اس کو بگاڑ کے آنا!!؟

—— ۲ ——

"خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب" کے عنوان سے جو مضمون بالاقساط نکل رہا تھا۔ اس کے لئے اس شمارے میں جگہ نہ نکل سکی۔ اس کی دو قسطیں اور باقی ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں اس کے لئے جگہ نکل سکے گی۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

۴۳

تفسیر سورۂ بقرہ

۸۹- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تاویل!

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ
ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ
جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ
فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ ھُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۲۷۵

ربٰو کا مفہوم

'ربا، یربو، ربا' کے معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے لفظ ربٰو ہے جس سے مراد وہ معین اضافہ ہوتا ہے جو ایک قرض دینے والا مدت و مہلت کے عوض اپنے مقروض سے اپنی اصل رقم پر وصول کرتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں یہ اصطلاح مذکورہ مفہوم کے لئے مشہور رہی ہے۔ اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں۔ لیکن اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ قرض دینے والا قرضدار سے ایک معین شرح پر صرف اس حق کی بنا پر اپنے دیئے ہوئے روپے کا منافع وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لئے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ اس امر کو اس کی حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہے کہ قرض کسی غریب و نادار کو دیا گیا ہے یا کسی امیر و تاجدار کو اور نہ اس بات سے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا کہ قرض کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لئے دیا گیا ہے یا کسی رفاہی اسکیم کے لئے دیا گیا ہے، یا تجارت، زراعت اور صناعت کے کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبے کے لئے دیا گیا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں ربٰو کی

اصطلاح کا جو مفہوم مسلّم رہا ہے اس پر ان ظاہری اختلافات سے سرِمو فرق واقع نہیں ہوتا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مقصدِ قرض یا قرضدار کی نوعیت وحیثیت کی تبدیلی ربٰو کی عرفی حیثیت کو بدل دیتی ہے ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ آگے آپ دیکھیں گے کہ خود قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔

'تخبط' کا لفظ 'خبط اللیل' سے ہے جس کے معنی رات کی تاریکی میں بھٹکنے کے ہیں۔ خابط اللیل اس شخص کو کہیں گے جسے دہنے بائیں کا کچھ ہوش نہ ہو، بس یوں ہی ہرزہ گردی کر رہا ہو۔ اسی سے یخبط خبطَ عشواء کا محاورہ ان لوگوں کے لئے پیدا ہوا جو بصیرت سے بالکل محروم ہوں اور اندھے بھینسے کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہوں۔ اسی سے تَخَبَّطَہُ الشَّیْطٰنُ نکلا جس کے معنی ہیں مَسَّہٗ الشَّیْطٰن بخبل او جنون، اس کو شیطان نے اپنی چھوت سے پاگل اور دیوانہ بنا دیا۔

'مس' کے اصل معنی چھونے کے ہیں۔ اس کا غالب استعمال کسی بُرائی، آفت اور دُکھ کے پہنچنے اور لاحق ہونے کے لئے ہوتا ہے۔ ہم نے موقع کے لحاظ سے اس کا ترجمہ چھوت کیا ہے۔ جو لفظی بھی ہے اور معنی خیز بھی۔ یوں تو دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا ہی کے اذن سے ہوتا ہے لیکن شیطان کو جن کاموں کے لئے مہلت ملی ہوئی ہے ان کی نسبت بعض اوقات اس کی طرف کر دی جاتی ہے۔ جیسے حضرت ایوبؑ کی دعا میں ہے انی مسنی الشیطٰن بنصب وعذاب ۴۱-ص (شیطان نے مجھے دُکھ اور تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے) نیک بندوں پر تو ارواحِ خبیثہ کا اثر اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ ان کو کوئی اذیت یا آزمائش پیش آجائے لیکن جن کی روحیں خود خبیث ہوتی ہیں جس طرح ان کا قلب شیطان کی مٹھی میں ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی ان کے عقل و دماغ سب پر شیطان کا تسلط ہو جاتا ہے اور وہ ظاہر میں بھی بالکل پاگل ہو کر کپڑے پھاڑتے گریبان چاک کرتے، منہ پر جھاگ لائے اور پریشان حال، پراگندہ بال جدھر سینگ سمائے اُدھر آوارہ گردی اور خاکبازی ہی کرتے پھرتے ہیں۔

اوپر اہلِ انفاق کے متعلق آپ پڑھ آئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو علم اور عمل دونوں میں رسوخ و عزیمت عطا فرماتا ہے، ان کے انفاق میں برکت بخشتا ہے، ان کا

کارساز بن کر ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، ان کو حکمت کا لازوال خزانہ بخشتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آخرت میں ان کو لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون کے سرور ازلی وابدی سے نوازے گا۔

اب یہ اس کے بالکل مخالف کردار رکھنے والوں یعنی سود خواروں کا بیان ہے۔ ان کی نسبت فرمایا کہ جب روز قیامت کو اُٹھیں گے تو بالکل اس طرح اٹھیں گے جس طرح وہ شخص اٹھا کرتا ہے جس پر کسی جنات یا بھوت کا سایہ ہو، جس سے وہ بالکل مخبوط الحواس ہو رہا ہو۔ اس تشبیہ کی زیادہ وضاحت نہیں فرمائی ہے اس لئے کہ اس کے اجمال ہی میں ساری وضاحت موجود ہے جس طرح قرآن میں ایک جگہ "رؤس الشیاطین" کی تشبیہ ہے جس کے الفاظ کو سن کر ہی دل پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، اسی طرح "تخبطہ الشیطٰن من المس" کے الفاظ سے خوف، وحشت زدگی اور پریشان حالی کی ایک ایسی تصویر سامنے آجاتی ہے جو کسی وضاحت کی محتاج نہیں رہ جاتی۔

آگے فرمایا کہ ان کی یہ حالت اس وجہ سے ہوگی کہ سود کی حرمت پر وہ اعتراض اُٹھاتے تھے کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے تو پھر بیع کو اللہ نے حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا؟ چونکہ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل مخبوط الحواس ہو، جس کی عقل ماری گئی ہو اور شیطان نے جس کو اپنی چھوت سے پاگل بنا دیا ہو اس وجہ سے عمل اور جزا کی مشابہت کے قانون کے تحت، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے مَنْ هُوَ فِي الدُّنْيَا اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (جو دنیا میں عقل اور دل کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اُٹھے گا) ایسا شخص جب قیامت میں اُٹھے گا تو پاگلوں اور دیوانوں کی طرح اُٹھے گا۔

یہاں ان کے قول کا حوالہ دے کر اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کی تردید نہیں کی ہے۔ اس لئے کہ اس قول کی لغویت اتنی واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات صرف وہ شخص کہہ سکتا ہے جو بالکل پاگل ہو چکا ہو اور پاگلوں کی کسی بات کی تردید کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ ہمارے اہل تاویل نے عام طور پر وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا کے ٹکڑے کو ان کی اس بات کی تردید کے معنی میں لیا ہے اور اسی پہلو سے اس کی تاویل کی ہے اگرچہ اس بات کا بھی ایک محل

ہے کیونکہ اللہ کا کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا بجائے خود اس امر کی بہت بڑی دلیل ہے کہ عقل و فطرت اور معاش و معاد کے نقطہ نظر سے اس چیز کی حلت یا حرمت بالکل معقول ہے لیکن یہ دلیل صرف مومن کے لئے قابل اعتماد ہے منکر کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس وجہ سے مجھے بار بار یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ٹکڑا الگ نہیں ہے بلکہ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا کے تحت ہی ہے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربٰو ہی کی طرح ہے، جب ایک تاجر اپنے سرمایہ پر نفع لیتا ہے تو ایک سرمایہ دار اگر اپنے سرمایہ کا نفع حاصل کرتا ہے تو آخر وہ مجرم کیوں ٹھہرے، پھر اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیوں ٹھہرایا؟ ہر چند یہ جملہ بشکل سوال نہیں ہے لیکن اس کے اندر وہی سوال یا اعتراض پوشیدہ ہے جو پہلے ٹکڑے کے اندر ہے۔

اس اعتراض سے یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی کہ سود کو بیع پر قیاس کرنے والے پاگلوں کی نسل دنیا میں نئی نہیں ہے بلکہ بڑی پرانی ہے۔ قرآن نے اس قیاس کو جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، لائق توجہ نہیں قرار دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بداہتہً باطل اور قیاس کرنے والے کی دماغی خرابی کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسے مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے، وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لئے قابل حصول بناتا ہے جو اپنی ذاتی کوشش سے اوّل تو آسانی سے اس کو حاصل نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاصل کر سکتے تھے تو اس سے کہیں زیادہ قیمت پر حسب قیمت پہ تاجر نے اُن کے لئے مہیا کر دیا۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لئے پیش کرتا ہے اور اس کے لئے منافع کی شرح بازار کا اُتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس اتار چڑھاؤ کے ہاتھوں بالکل دیوالیہ ہو کر رہ جائے اور ہو سکتا ہے کہ کچھ نفع حاصل کر لے۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی اس کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں کہ وہ ایک بار ایک روپے کی چیز ایک روپے دو آنے یا چار آنے میں بیچ کر پھر اس روپے سے ایک دھیلے کا بھی کوئی نفع اس وقت تک نہیں کما سکتا جب تک اس کا وہ روپیہ تمام خطرات اور سارے اتار چڑھاؤ سے گزر کر پھر میدان میں نہ اترے اور معاشرے کی خدمت کر کے اپنے لئے استحقاق نہ پیدا کرے۔

بھلا بتائیے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جانباز، غیور اور خدمت گزار سرمایہ سے

ایک سودخور کے اس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمنِ انسانیت سرمایہ کو جو جوکھم تو ایک بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں لیکن منافع بٹانے کے لئے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔ سودخوار کا سرمایہ دو بھیسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور دونوں ہی میں وہ یکساں بزدل اور خونخوار ہے۔ ایک تو یہ سودی کاروبار کرنے والے بنیوں، پٹھانوں اور یہودیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے، اس شکل میں تو اس کی خونخواری سے کسی کے لئے بھی انکار کی گنجائش نہیں ہو سکتی اس لئے کہ ایک بنیا، یا پٹھان جب ایک مرتبہ اپنے جال میں کسی کو پھنسا پاتا ہے تو چاہے اس مظلوم کے جسم پر گوشت کی ایک بوٹی بھی باقی نہ رہ گئی ہو لیکن وہ اپنی ہر میعاد پر آکر اپنا ایک پونڈ گوشت کاٹ لے گا اور مدت العمر کی اس قطع و برید کے بعد بھی بسا اوقات ہوتا یہ ہے کہ نہ صرف بنیے کا اصل سرمایہ قرضدار پر لدا رہتا ہے بلکہ وہ اصل سے کئی گنا ہو کر اکاس بیل کی طرح مظلوم قرضدار کے گھر در، اس کے اثاث البیت اور اس کے زن و فرزند ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور خاندان کے خاندان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کے رکھ دیتا ہے۔ بتائیے کس تاجر کے سرمایہ میں یہ سکت ہے کہ وہ کسی پر یہ ظلم ڈھا سکے؟ وہ تو زیادہ سے زیادہ اگر کر سکتا ہے تو یہ کہ بازار کے سارے اتار چڑھاؤ کا مقابلہ کر کے اگر موقع پائے تو اپنی ایک روپیہ کی چیز ڈیڑھ یا دو روپے میں بیچ لے اور وہ بھی ایک مرتبہ۔

سودخور کے سرمایہ کا دوسرا بھیس وہ ہے جس میں وہ رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام سے اٹھتا ہے۔ اس زمانے میں بہت سے سادہ لوح اس بھیس میں اس کو بڑا معصوم سمجھتے ہیں لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بزدلی اور خودغرضی کی فطرتِ بد اس کے اس جامے میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح پہلے بھیس میں موجود ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ فرض کیجئے ملک کی حکومت ملک کے کسی حصے کو سیلاب کی تباہ کاریوں سے یا کسی اور خطرے سے بچانے کے لئے کوئی بڑا منصوبہ عمل میں لانا چاہتی ہے اور اس کے لئے پانچ یا سات فیصد کی شرح پر لوگوں سے قرض لیتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت کا منصوبہ کروڑوں روپے خرچ کرنے کے بعد کسی ارضی و سماوی آفت کی زد میں آکر تباہ ہو جائے۔ اب بتائیے کہ ملک نے تو بحیثیت مجموعی ایک شدید قسم کا نقصان اٹھایا لیکن جن سودخوروں نے اس کے لئے قرض دیئے تھے نہ صرف ان کا

سرمایہ محفوظ ہے بلکہ ایک معین شرح کے ساتھ اس کا سود بھی دمبدم اس میں اضافے پر اضافہ کئے چلا جا رہا ہے۔ آخر یہ قومی خدمت کی کون سی شکل ہوئی؟ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ پہلی صورت میں اور اس دوسری صورت میں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ پہلی صورت میں سود خور کو صرف اس امر سے بحث ہے کہ اس کا سرمایہ محفوظ ہے اور منافع کا ایک پونڈ گوشت بغیر کسی غل وغش کے فصل فصل پر اس کو ملتا رہے، چاہے قرضدار کی سات پشتیں فاقہ کرتی مرجائیں۔ اور اس صورت میں بھی اس کے سامنے یہی چیز ہے کہ اس کا اصل سرمایہ بے داغ محفوظ رہے، معین سود اس کے حساب میں جمع ہوتا رہے، رہا قوم کا مردہ تو وہ چاہے دوزخ میں جائے یا بہشت میں جائے۔

برعکس اس کے ایک تاجر کا سرمایہ قوم اور ملک کی خدمت کے لئے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتا ہے۔ اگر حالات کے رد و بدل، بازار کے اتار چڑھاؤ، یا کسی اور سبب سے اس کو نقصان پہنچ جائے تو اس نقصان کو وہ اپنے ہی اوپر برداشت کرتا ہے۔ اس کے لئے ایک لمحہ کے واسطے بھی اس بات کا امکان نہیں ہوتا کہ وہ سود خوار کے سرمایہ کی طرح کسی کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھے اور دوسروں سے اپنا نفع وصول کرتا رہے۔ اگر اس کو سازگار سے سازگار حالات بھی میسر آجائیں تب بھی بہرحال اس کے منافع کی شرح پر بازار کا فیصلہ ناطق ہوتا ہے اور اس طرح جو کچھ وہ حاصل کر پاتا ہے درحقیقت وہ اس کا جائز حق المحنت ہی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاجر کے منافع کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تعبیر فرمایا ہے اور سود خوار کے سرمایہ کو، جیسا کہ ہم سورہ روم کی تفسیر میں واضح کریں گے، اس سانڈ سے تشبیہ دی ہے جو دوسروں کی چراگاہ میں چر کر فربہ ہو رہا ہو۔

فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ الایہ۔ موعظت کے لفظ میں زجر و تنبیہ کا پہلو غالب ہے اس وجہ سے اس کی اصل روح کو پیش نظر رکھ کر ہم نے اس کا ترجمہ تنبیہ کیا ہے۔ اس کی تانیث چونکہ غیر حقیقی ہے اس وجہ سے لفظ کے مفہوم کے لحاظ سے اس کے لئے فعل مذکر آیا ہے۔ مِنْ رَّبِّهٖ کے الفاظ نے اس تنبیہ کے اندر ایک خاص زور پیدا کر دیا ہے۔ یعنی یہ تنبیہ کوئی ہوائی بات نہیں ہے بلکہ یہ سب کے مالک و آقا کی طرف سے تنبیہ ہے اس وجہ سے اس کو سہل

نہیں خیال کرنا چاہیئے۔ ' فلہ ما سلف' یعنی اس تنبیہ کے بعد جو سودی لین دین سے رک گیا اس سے اس کے پچھلے لئے ہوئے سود کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جاتے گا۔ اس قانون کا نفاذ اگر ماضی پر بھی اثرانداز ہوتا تو اس سے ناقابل حل مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ وامرہٗ الی اللہ یعنی ایسے شخص سے اسلامی حکومت تو اس کے سابق سودوں پر کوئی گرفت نہیں کرے گی لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا سے بھی اس کو معافی مل گئی، بلکہ اس کا معاملہ خدا کے حوالہ ہے۔ خدا کے حوالہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کی زد سے بچنے کے لئے تو یہ بات کافی ہے کہ ایک شخص عملاً سودی کاروبار نہیں کر رہا ہے۔ لیکن خدا کے مواخذہ سے بچنے کے لئے مجرد یہ بات کافی نہیں ہے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کے دل سے بھی سود کا ہر شائبہ نکل جائے۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اس طرح کے لوگ آخرت سے بے خوف ہو کر نہ بیٹھ رہیں بلکہ جس حد تک بھی ہو سکے اپنے پچھلے مظالم کی تلافی کی کوشش کریں۔ اس لئے کہ یہ مظالم حقوق العباد سے تعلق رکھنے والے ہیں اور حقوق العباد کا معاملہ خدا کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ یعنی اس واضح تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سودی کاروبار کریں گے وہ دوزخی ہیں اور وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لئے دائمی دوزخ کی سزا کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ خدا کے اس حکم کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی اگر جذبات کے غلبہ کے سبب سے ہو جاتی ہے تو توبہ کے ذریعہ سے اس کی اصلاح کی راہ کھلی ہوئی ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ توبہ سے غفلت کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی کو معاف کر دے یا اس کے گناہوں کے بقدر اس کو سزا دے کر رہائی دے۔ لیکن جب نہایت واضح تذکیر و تنبیہ کے بعد بھی ایک شخص کسی حکم کی خلاف ورزی پر اصرار کئے چلا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کے اس حکم کا منکر ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ ایمان کا بھی دعویٰ کرتا ہے تو یہ محض ایک منافقانہ قسم کی حرکت ہے جو اس عالم الغیب سے مخفی نہیں ہے جو دلوں کے تمام بھیدوں سے بخوبی واقف ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ یعنی ان کو جہنم کے اس دائمی عذاب میں جھونک دے گا جو کفار و منافقین کے لئے مقرر ہے۔

گناہ کا احاطہ دائمی عذاب کا موجب ہے

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ایک چیز تو ہے کسی جرم کا مرتکب ہونا اور ایک چیز ہے کسی جرم کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا۔ جو جرم اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے وہ مجرم کی زندگی کے کسی ایک ہی پہلو کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی زندگی کا ہر پہلو اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ اس کا ظاہر، اس کا باطن، اس کا عقیدہ، اس کا عمل اور اس کا ایمان و اسلام سب اس جرم کی چھاپ قبول کر لیتا ہے۔ اس حالت کو قرآن نے 'احاطہ' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے اور ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے لئے دائمی عذابِ نار ہے۔ مثلاً ارشاد ہے۔ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ بقرہ (البتہ جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)۔

سود کو مٹانا اور صدقات کو بڑھانا آخرت کے لحاظ سے

يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝ ۲۷۶
اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ۲۷۷

'محق' کے معنی گھٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ اسی سے 'محق اللہ الشیٔ' نکلا جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے اس چیز کی برکت مٹا دی۔ 'ارباء' کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ سود خور تو یہ سمجھتا ہے کہ سود سے سرمایہ بڑھتا اور خیرات سے گھٹتا ہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ یہ گھٹانا اور بڑھانا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے۔ جب آخروی زندگی کی صبح ہوگی تو سود خوار دیکھے گا کہ دنیا کے بنک میں تو اس کے لاکھوں روپے جمع تھے لیکن خدا کے بنک میں اس کی ایک کوڑی بھی نہیں ہے، صرف حسرت و ندامت ہی اس کا سرمایہ ہے۔ برعکس اس کے خدا کی راہ میں انفاق کرنے والا جب اس زندگی میں آنکھ کھولے گا تو دیکھے گا کہ اس کے خرف ریزوں کے عوض یہاں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے جواہرات کے پہاڑ بنے ہوتے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ اس امر

کی وضاحت بھی ہے کہ اس گھٹنے اور بڑھنے کا تعلق آخرت ہی کی زندگی سے ہے۔ مثلاً وَمَا اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَکٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ۝۳۹ روم (اور جو مال تم سود کے لئے دیتے ہو کہ وہ لوگوں کے مال میں پل کر بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور یہ جو تم زکوٰۃ دیتے ہو، اللہ کی رضا طلبی میں، تو یہی لوگ خدا کے ہاں بڑھانے والے ہیں)

احادیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ ایک حدیث کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لیتا ہے، پھر وہ اس کی تمہارے لئے اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھیڑے کی پرورش کرتا ہے یہاں تک کہ تمہارا دیا ہوا ایک لقمہ خدا کے ہاں احد پہاڑ کی مانند بن جائے گا"

اگرچہ سود کے سرمایہ میں کوئی خیر و برکت اس دنیا کی زندگی میں بھی نہیں ہوتی لیکن آیت کا تعلق آخرت ہی کے نتائج و ثمرات سے ہے۔

سود خوار کفّار اور اثیم

"کفّار" کے معنی یہاں ناشکرے کے ہیں اور "اثیم" کے معنی، جیسا کہ ہم دوسری جگہ وضاحت کر چکے ہیں، دوسروں کے حقوق تلف کرنے والے کے ہیں۔ یہ ٹکڑا اس بات کی وضاحت کر رہا ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ سود خوار کے سرمایہ کو مٹائے گا۔ فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ناشکرا اور اللہ کے بندوں کے حقوق تلف کرنے والا ہے اور اللہ ان لوگوں کو کبھی دوست نہیں رکھ سکتا جو اس کی ناشکری کرنے والے اور اس کی مخلوق کے حقوق تباہ کرنے والے ہوں۔ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی ضرورت سے زیادہ مال دیتا ہے تو اس لئے دیتا ہے کہ وہ خدا کا شکر گزار بندہ بنے اور جس طرح اللہ نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ دوسروں پر احسان کرے لیکن جب وہ مال کو پا کر اس مال ہی کی بندگی میں لگ جاتا ہے اور دوسروں کے لئے سہارا بنانے کے بجائے اُس کو ان کا خون چوسنے اور ان کے حقوق تلف کرنے کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو ایسا قسی القلب اور ناشکرا اسی بات کا سزاوار ہے کہ اللہ کے ہاں اس کی دولت صرف موجب وبال و خسران ہو، اور محرومی کے سوا اس کے پلے کچھ نہ پڑے۔

اس کے بعد اہلِ ایمان کے عظیم اجر و ثواب کا ذکر فرمایا ہے اور قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اشارہ ان اہلِ ایمان کی طرف ہے جن کے صدقات میں برکت کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ فرمایا ہے اس آیت کے تمام اجزا کی تشریح مختلف مقامات میں گزر چکی ہے۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝٢٧٨

اس آیت میں اہلِ ایمان کو براہِ راست خطاب کر کے اللہ سے ڈرتے رہنے اور سود کا جو حصہ قرضداروں کے ذمہ ابھی باقی تھا اس سے بالکل دستبردار ہو جانے کی ہدایت فرمائی اور اس کو ایمان کا لازمی تقاضا ٹھہرایا۔ اس سے پہلے سود سے متعلق جو آیات نازل ہوئی تھیں ان کی نوعیت نصیحت و موعظت کی تھی اور ان کی بنیاد اس امر پر تھی کہ آسمانی مذاہب اور دنیا کے عرف میں اس کی حیثیت ہمیشہ سے ایک حرام یا کم از کم ایک مکروہ شے کی رہی ہے۔ اہلِ عرب اس حقیقت سے ناواقف نہیں تھے اس وجہ سے قرآن نے مکی دور ہی سے اس کا ظلم ہونا واضح کرنا شروع کر دیا تھا چنانچہ اسی پہلو سے اس کا ذکر سورہ روم میں بھی ہوا ہے اور وہ ایک مکی سورہ ہے لیکن چونکہ اس کی نوعیت ایک وسیع معاشی فساد کی تھی جس کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ ملک کا پورا نظام عملاً اسلام کے زیرِ اقتدار ہو اس وجہ سے اس پر آخری ضرب حجۃ الوداع کے موقع پر لگائی گئی۔ یہ آیتیں اسی موقع پر نازل ہوئیں اور مضمون کی مناسبت کی وجہ سے ان کو ترتیب میں یہاں جگہ دی گئی:

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝٢٧٩

اس کی نوعیت بالکل الٹی میٹم کی ہے یعنی اب جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کے لئے خبردار ہو جائیں۔ سود کے متعلق جو لب ولہجہ ان آیات کا ہے بعینہ یہی لہجہ سود سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع میں معلوم ہوتا ہے جس سے ان آیات کے زمانۂ نزول کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس آیت سے صریح طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام میں سودی کاروبار کرنے والوں کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی

کے لئے عندالضرورت فوجی کارروائی بھی کی جا سکتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورۃ مائدہ میں آئے گی۔

اس الٹی میٹم کے بعد سودی کاروبار رکھنے والوں کو صرف اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ اپنی اصل رقمیں قرضداروں سے واپس لے سکتے ہیں، نہ وہ اس میں کسی چال سے سود کی کوئی رقم جوڑ کر قرضدار کی حق تلفی کی راہ ڈھونڈھیں اور نہ قرضداروں کے لئے یہ بات جائز ہے کہ وہ اس اصلاح سے فائدہ اٹھا کر مہاجنوں کی اصل رقمیں بھی دبا بیٹھنے کی کوشش کریں۔ یہ تنبیہ اس لئے ضروری ہوئی کہ جب کوئی اہم معاشرتی اور معاشی اصلاح عمل میں آتی ہے تو اس سے متاثر ہونے والے طبقات میں بڑی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کو اس اصلاح سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے وہ ایسی تدبیریں اور ایسے حیلے اختیار کرتے ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو نقصان سے بچائے جائیں اور جنہیں فائدہ پہنچنے کی توقع ہوتی ہے وہ فائدہ کی اسی مقدار پر قناعت نہیں کرنا چاہتے جو انہیں قانون پہنچا رہا ہے بلکہ وہ قانون کی حدود سے آگے بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ اس افراتفری اور کشاکش کو روکنے کے لئے قرآن نے اول تو اس کے بہت پہلے سے، جیسا کہ اوپر واضح ہوا، ذہنوں کو تیار کیا، پھر جب آخری حکم دیا تو اس کے ساتھ یہ ہدایت فرما دی کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ۔ اسی ہدایت کی یہ برکت تھی کہ عرب میں یہ عظیم معاشی اصلاح بغیر کسی طبقاتی کشمکش کے عمل میں آ گئی۔ نہ مہاجنوں پر کوئی آفت آئی نہ قرضداروں کو کوئی گزند پہنچا بلکہ دونوں اس اصلاح کی برکت سے یکساں طور پر مستفید ہوئے اگر بات کے اپنے حدود سے آگے بڑھ جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو یہاں ہم دکھاتے کہ دنیا میں دوسری قوموں کو اس قسم کی اصلاحات کے لئے کیا کیا قیمتیں دینی پڑی ہیں:

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

اوپر مہاجنوں کو یہ اجازت جو دی ہے کہ وہ اپنی اصل رقم قرضداروں سے واپس لے سکتے ہیں

اس کے ساتھ ان کو یہ ہدایت دی کہ اگر قرضدار تنگ دست ہو تو اسکو ہاتھ کشادہ ہونے تک مہلت دو،
اور اگر ایسی حالت میں اپنی اصل رقم بھی معاف کردو تو یہ بہت بہتر ہے، اس کا اجر و ثواب بے پایاں ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس زمانے میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں 'زمانۂ نزول قرآن سے پہلے' جو سود رائج تھا یہ صرف مہاجنی سود تھا۔ غریب اور نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لئے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے ربٰو قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھہرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی اور کاروباری قرضے جن کا اس زمانے میں رواج ہے تو ان کا اس زمانے میں نہ دستور تھا نہ اُن کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔

ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرضدار تنگ دست (ذوعسرۃ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرہ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانے میں قرض لینے والے امیر اور مالدار لوگ بھی ہوتے تھے۔ بلکہ یہاں اگر اسلوب بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجئے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض اور لین دین کی معاملت زیادہ تر مالداروں ہی میں ہوتی تھی۔ البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرضدار ایسی تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اس کے لئے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اس کو اس کی مالی حالت سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اس معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے اس لئے کہ فرمایا ہے کہ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ (اگر قرضدار تنگ حال ہو تو اس کو کشادگی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے)۔ عربی زبان میں 'اِنْ' کا استعمال عام اور عادی حالات کے لئے نہیں ہوتا بلکہ بالعموم نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لئے ہوتا ہے۔ عام حالات کے بیان کے لئے عربی میں 'اِذَا' ہے۔ اس روشنی میں غور کیجئے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر قرضدار ذومیسرہ (خوش حال) ہوتے تھے لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ قرضدار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت ہوئی۔

یوں تو اس تفسیر میں جو کچھ بھی میں لکھ رہا ہوں سب استاذ رحمۃ اللہ علیہ ہی کا فیض ہے لیکن

خاص اس آیت سے متعلق ان کے اپنے الفاظ بھی مجھے مل گئے ہیں جو کم از کم آج سے پچاس سال
پہلے ان کے قلم سے نکلے ہیں جب سود کے مسئلہ میں معترضین کی یہ موشگافیاں نہیں پیدا ہوئی
تھیں جو اب پیدا ہو گئی ہیں۔ اُس وقت مولیناؒ نے بالکل غیر جانبدارانہ ذہن کے ساتھ، مجر
قرآن کے الفاظ سے جو رائے اس مسئلہ پر قائم فرمائی تھی وہ یہ ہے۔

"وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَّاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ" يلوح من هذه الكلمات انهم كانوا يأخذون الربٰو من ذی میسرة والقريش كانت تجارا واصحاب الربٰو فلا اریٰ فرقا بين حالهم وحال ابناء زماننا فی الربٰو، والله اعلم بالصواب۔

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عسرة الایہ کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اہلِ عرب خوش حالوں سے بھی سود لیتے تھے۔ پھر قریش تاجر لوگ تھے اور سودی بیوپار ان میں رائج تھا، اس وجہ سے اس معاملے میں ان کے اور ہمارے حالات کے درمیان کوئی خاص فرق مجھے در بابِ سود نظر نہیں آتا۔ واللہ اعلم بالصواب

ظاہر ہے کہ مالدار لوگ اپنی ناگزیر ضروریات زندگی کے لئے مہاجنوں کی طرف رجوع
نہیں کرتے رہے ہوں گے بلکہ وہ اپنے تجارتی مقاصد ہی کے لئے قرض لیتے رہے ہوں گے۔
پھر ان کے قرض اور اس زمانے کے ان قرضوں میں جو تجارتی اور کاروباری مقاصد سے
جاتے ہیں کیا فرق ہوا؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ
بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَ
الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ
اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْ
وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـــمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِ

اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ
تَكُوْنَ تِجَارَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا
اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۲۸۲

اس آیت میں کوئی خاص لفظی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ لفظ املال کے معنی وہی ہیں جو املاء کے ہیں، یعنی لکھوانے کے۔ قرآن نے ان دونوں لفظوں کو استعمال کیا ہے اور بعینہٖ ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ میں نے ان دونوں کے مادے اور مشتقات پر جہاں تک غور کیا ہے اس سے میرا رجحان اس بات کی طرف ہے کہ لکھوانے کے معنی میں اصل لفظ تو املاء ہی کا ہے لیکن صوتی مشابہت کی وجہ سے 'املال' بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا ورنہ بجائے خود املال کے مادے میں لکھنے یا لکھانے کے مضمون کے لئے کچھ زیادہ گنجائش نہیں ہے۔ صوتی مشابہت کی بنا پر ایک مادے سے دوسرے مادے کی طرف الفاظ کے منتقل ہوجانے کی عربی زبان میں بکثرت مثالیں موجود ہیں لیکن اس قسم کی تفصیلات میں ہمارے لئے زیادہ گھسنے کی گنجائش نہیں ہے۔

آیت کے آخر میں لفظ 'فسوق' کے ساتھ جو 'بکم' کا لفظ آیا ہے اس میں 'ب' کا تعلق 'فسوق' کے ساتھ بعض لوگوں کو بیگانہ سا محسوس ہوگا۔ ایسے لوگوں کو عربی زبان کا یہ اسلوب یاد رکھنا چاہیئے کہ جب صلہ اور اس کے متعلق میں بیگانگی ہو تو وہاں کوئی ایسا لفظ محذوف مان لیتے ہیں جو اس صلہ سے موافقت رکھنے والا ہو۔ یہاں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ 'فسوق' کے بعد کوئی لفظ لازم ہوجانے اور چپک جانے کے مفہوم کا محذوف ہے مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم نے فلاں بات کی تو یہ تمہاری طرف سے ایسے فسق کا ارتکاب ہوگا جو تمہارے ساتھ چپک کے رہ جائے گا، اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔

یہاں سودی قرضوں کے سلسلے کو یک قلم ختم کرنے کے بعد قرض دینے والوں اور قرضداروں دونوں کو نزاع اور نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے مندرجہ ذیل ہدایات دی ہیں:۔

(۱) جب کوئی قرض لین دین ایک خاص مدت تک کے لئے ہو تو اس کی دستاویز لکھی جائے۔

(ب) یہ دستاویز دونوں پارٹیوں کی موجودگی میں کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے، اس میں کوئی دخل فشل نہ کرے، اور جس کو لکھنے کا سلیقہ ہو اس کو چاہیئے کہ وہ اس خدمت سے انکار نہ کرے، لکھنے کا سلیقہ اللہ کی ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ آدمی ضرورت پڑنے پر لوگوں کے کام آئے۔ اس نصیحت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اُس زمانے میں لکھے پڑھے لوگ کم تھے۔ دستاویزوں کی تحریر اور ان کی رجسٹری کا سرکاری اہتمام اس وقت تک نہ عمل میں آیا تھا اور نہ اس کا عمل میں آنا ایسا آسان تھا۔

(ج) دستاویز کے لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہوگی، وہ دستاویز میں اعتراف کرے گا کہ میں فلاں بن فلاں کا اتنے کا قرضدار ہوں اور لکھنے والے کی طرح اس پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ اس اعتراف میں تقویٰ کو ملحوظ رکھے اور ہرگز صاحبِ حق کے حق میں کسی قسم کی کمی کرنے کی کوشش نہ کرے۔

(د) اگر یہ شخص کم عقل ہو یا ضعیف ہو یا دستاویز وغیرہ لکھنے لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو جو اس کا ولی یا وکیل ہو وہ اس کا قائم مقام ہوکر انصاف اور سچائی کے ساتھ دستاویز لکھوائے۔

(ہ) اس پر دو مردوں کی گواہی ثبت ہوگی جن کے متعلق ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ مِن رِجالکم یعنی اپنے مردوں میں سے ہوں۔ جس سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مسلمان ہوں، دوسری یہ کہ وہ اپنے میل جول اور تعلق کے لوگوں میں سے ہوں کہ فریقین ان کو جانتے پہچانتے ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ 'ممن ترضون' یعنی پسندیدہ اخلاق و عمل کے ثقہ، معتبر اور ایماندار ہوں۔

(و) اگر مذکورہ صفات کے دو مرد میسر نہ آسکیں تو اس کے لئے ایک مرد اور دو عورتوں کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔ دو عورتوں کی شرط اس لئے ہے کہ اگر ایک سے کسی لغزش کا صدور ہوگا تو دوسری کی تذکیر و تنبیہ سے اس کا سدّباب ہو سکے گا۔ یہ فرق عورت کی تحقیر کے پہلو سے نہیں ہے بلکہ اس کی مزاجی خصوصیات اور اس کے حالات و مشاغل کے لحاظ سے یہ ذمہ داری اس کے لئے ایک بھاری ذمہ داری ہے اس وجہ سے شریعت نے اس کے اٹھانے میں اس کے لئے سہارے کا بھی انتظام فرما دیا ہے۔ یہ موضوع اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ سورہ نساء میں زیر بحث آئے گا۔

(ز) جو لوگ کسی دستاویز کے گواہوں میں شامل ہو چکے ہوں، عندالطلب ان کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ہے۔ اس لئے کہ حق کی شہادت ایک عظیم معاشرتی خدمت بھی ہے اور شہداء للہ ہونے کے پہلو سے اس امت کے فریضۂ منصبی کا ایک جزو بھی۔

(ح) قرض لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، اگر وہ کسی مدت کے لئے ہے، دست گرداں نوعیت کا نہیں ہے، تو اس کو قیدِ تحریر میں لانے سے گرانی نہیں محسوس کرنی چاہیئے۔ جو لوگ اس کو زحمت سمجھ کر ٹال جاتے ہیں وہ سہل انگاری کی وجہ سے بسا اوقات ایسے جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں جن کے نتائج بڑے دور رس نکلتے ہیں۔

(ط) مذکورہ بالا ہدایات اللہ تعالیٰ کے نزدیک حق و عدل سے قرین، گواہی کو درست رکھنے والی اور شک و نزاع سے بچانے والی ہیں اس لئے معاشرتی صلاح و فلاح کے لئے ان کا اہتمام ضروری ہے۔

(ی) دست گرداں لین دین کے لئے تحریر و کتابت کی پابندی نہیں ہے۔

(ک) ہاں، اگر کوئی اہمیت رکھنے والی خرید و فروخت ہوتی ہے تو اس پر گواہ بنا لینا چاہیئے تاکہ کوئی نزاع پیدا ہو تو اس کا تصفیہ ہو سکے۔

(ل) نزاع پیدا ہو جانے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لئے جائز نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی و تمدنی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کو بلا وجہ نقصان پہنچانے کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثقہ اور محتاط لوگ گواہی اور تحریر وغیرہ کی ذمہ داریوں سے گریز کرنے لگیں گے اور لوگوں کو پیشہ ور گواہوں کے سوا کوئی معقول گواہ ملنا مشکل ہو جائے گا۔ اس زمانے میں ثقہ اور سنجیدہ لوگ گواہی وغیرہ کی ذمہ داریوں سے جو بھاگتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ کوئی معاملہ نزاعی صورت اختیار کر لیتا ہے تو اس کے گواہوں کی شامت آجاتی ہے۔ بیچارے ہتک، اغوا اور نقصانِ مال و جائداد بلکہ قتل تک کی تعدیوں کے نشانہ بن جاتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کی شرارتوں سے روکا کہ جو لوگ اس قسم کی حرکتیں کریں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ کوئی چھوٹی موٹی نافرمانی نہیں ہے جو آسانی سے معاف ہو جائے گی بلکہ یہ ایک ایسا فسق ہے جو ان کے ساتھ چمٹ کے رہ جائے گا اور اس کے برے نتائج سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ یہ اس شہادت کی بنیاد کو ڈھانے

کی کوشش ہے جو اس اُمت کی بعثت کی اصل غایت ہے۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو۔ خدا نافرمانیوں پر فوراً نہیں پکڑا کرتا لیکن جب پکڑتا ہے تو کوئی اس سے چھوٹ نہیں سکتا۔ پھر فرمایا کہ "یہ اللہ تمہیں تعلیم دے رہا ہے" جس میں سرتاسر تمہارا اپنا ہی نفع ہے اور وہی ہے جو ساری باتوں سے واقف ہے اس وجہ سے اسی کو تعلیم و ہدایت دینے کا حق پہنچتا ہے

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝۲۸۳

رہان مقبوضہ کا مفہوم

'رہان' 'رہن' کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ شے ہے جو قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ 'فرھان مقبوضۃ' بالکل اسی طرح کا جملہ ہے جس طرح سورہ یوسف میں 'فصبرٌ جمیل' ہے۔ جی چاہے اس کو مبتدا مان کر اس کی خبر کو محذوف قرار دیجئے جی چاہے اس کو خبر مانیئے اور مبتدا کو محذوف قرار دیجئے مطلب یہ ہے کہ اگر لکھا پڑھی اور گواہی شہادت کی صورت مفقود ہو تو کوئی چیز بطور رہن قبضے میں کرا کے بھی قرض کی معاملت کی جا سکتی ہے۔

'اَمِنَ فلان فلانا' کے معنی یہ ہیں کہ فلاں شخص اپنے آپ کو فلاں کی طرف سے خطرے سے محفوظ سمجھتا ہے، اس کی طرف سے مامون ہے، اس پر اعتماد کرتا ہے۔

"اٰثِمٌ قلبہ" (اس کا دل آلودۂ گناہ ہے) اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ بعض گناہ تو ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر انسان کے محض ظاہری اعضا ہی تک محدود رہتا ہے، ان کی نوعیت بس اوپری گرد و غبار کی ہوتی ہے۔ مثلاً لغو قسمیں جو بے مقصد کھائی جاتی ہیں۔ اس طرح کے گناہ یا تو انسان کی روزمرہ کی معمولی نیکیوں سے آپ سے آپ جھڑ جاتے ہیں یا معمولی توجہ سے ان کی اصلاح ہو جایا کرتی ہے۔ دوسرے گناہ وہ ہوتے ہیں جن کی تحریک دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے۔ ایسے گناہوں کے اثرات بھی دل تک متعدی ہوتے ہیں۔ گناہ کی یہ قسم خطرناک ہے۔ یہ دل

کے فساد کی غمازی کرتی ہے۔ اگر اس سے احتیاط نہ کی جائے یا صادر ہو جانے کے بعد فوراً اس کی اصلاح کی کوشش نہ کی جائے تو اس کے جڑ پکڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اوپر ہم احاطہ کرنے والے گناہ اور جھپٹ جانے والے فسق پر گفتگو کر چکے ہیں اس کو نگاہ میں رکھئے۔ یہاں یہ بتایا ہے کہ شہادت کو چھپانا اسی نوعیت کا گناہ ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ ہے کہ شہادت علی الناس اس امت کا وہ اصل فریضہ منصبی ہے جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مامور فرمایا ہے اس وجہ سے اس سلسلے کی ہر کوتاہی بڑے دوررس نتائج کی حامل ہے۔

اس آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر حالتِ سفر میں قرض لین دین کی ضرورت پیش آن پڑے اور تحریر و شہادت کا اہتمام ممکن نہ ہو اور قرض دینے والا بغیر کسی ضمانت کے قرض دینے پر آمادہ نہ ہو تو یہ شکل بھی اختیار کی جا سکتی ہے کہ کوئی چیز بطور رہن اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ لیکن یہ شکل صرف اسی وقت تک کے لئے ہے جب تک قرض دینے والے کے لئے اطمینان و اعتماد کی صورت نہیں پیدا ہو جاتی، جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ ایک دوسرے پر اعتماد کے لئے جو باتیں مطلوب ہیں وہ فراہم ہو جائیں، مثلاً سفر ختم کر کے حضر میں آ گئے دستاویز کی تحریر کے لئے کاتب اور گواہ مل گئے اپنوں کی موجودگی میں قرض معاملت کی تصدیق ہو گئی اور اس امر کے لئے کوئی معقول وجہ باقی نہیں رہ گئی کہ قرض دینے والا رہن کے بغیر اعتماد نہ کر سکے تو پھر اس کو چاہیئے کہ وہ رہن کردہ چیز اس کو واپس کر دے اور اپنے اطمینان کے لئے چاہے تو وہ شکل اختیار کرے جس کی اوپر ہدایت کی گئی ہے۔ یہاں رہن کردہ مال کو امانت سے تعبیر فرمایا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قرض دینے والے کے پاس رہن بطور امانت ہوتا ہے، جس کی حفاظت ضروری اور جس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز ہے۔

مجاہدؒ اور ضحاکؒ کے متعلق تفسیروں میں منقول ہے کہ یہ حضرات رہن کو سفر کے ساتھ مخصوص مانتے تھے۔ مجھے ان کی یہ رائے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جب اعتماد کرنے کے لئے وجوہ و اسباب موجود ہوں تو رہن پر قبضہ جمائے رکھنے کے لئے کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ یہ امانت، امانت رکھنے والے کو لوٹا دینی چاہیئے۔ بالخصوص جب معاملہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو تب تو یہ چیز نہ صرف اسلامی اخوت و مروّت کے خلاف ہے بلکہ یہ ایک قسم

کی دنائت بھی ہے۔ جب ایک شخص دستاویز اور گواہی کی ضمانتیں حاصل کر سکتا ہے تو یہ بات نہایت بھونڈی ہے کہ وہ اپنے قرض کی ضمانت میں قرضدار کا مکان، یا اس کا کھیت، یا اس کا باغ، یا اس کا گھوڑا، یا اس کی بکری یا اس کے بیوی بچوں کے پہننے کے زیور اور کپڑے اپنے قبضہ میں رکھے !!

رہن سے متعلق حدیث کی توجیہ

ہمیں اس روایت سے انکار نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس کچھ جو کے بدلے رہن رکھی۔ لیکن اس سے جو بات زیادہ سے زیادہ نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان کو کسی شدید مجبوری کے سبب سے کسی بنیے یا یہودی سے قرض لینے کی نوبت آجائے اور وہ رہن کے سوا کسی اور صورت پر معاملہ کرنے کے لئے تیار نہ ہو تو اس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جا سکتا ہے اور بہت کھینچ تان کی جائے تو اس سے یہ بات بھی نکالی جا سکتی ہے کہ کسی تنگ دل مسلمان سے بھی بدرجہ مجبوری اس طرح معاملہ کیا جا سکتا ہے لیکن عام مسلمانوں کے لئے جب باہمی معاملت کی ایک واضح، قابلِ اعتماد اور اسلامی اخوت و مروت کے تقاضوں کے مطابق ایک شکل بیان کر دی گئی ہے تو اس کے ہوتے ہوتے کس طرح اس کو پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ بلا کسی مجبوری کے بھی وہ رہن پر قرض لین دین کریں۔ یہ بات قرآن کی اس آیت کے تو بالکل خلاف ہے۔ رہی حدیث تو اس سے بھی رہن کے عام جواز پر استدلال کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ایک تو یہ معاملہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، ایک یہودی کے ساتھ ہوا۔ دوسرے صورت واقعہ صاف گواہی دے رہی ہے کہ یہ بہت مجبوری کی صورت میں ہوا ہے۔

زیرِ بحث آیت میں مفسرین نے عام طور پر امانت سے وہ قرض مراد لیا ہے جو کوئی شخص کسی کو بغیر رہن کے مجرد اعتماد پر دیدے لیکن قرض کے لئے امانت کی تعبیر گوناگوں پہلوؤں سے ہمارے نزدیک غلط ہے۔ اصل میں یہ حضرات چونکہ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ سفر ختم ہو جانے کے بعد جب اعتماد و اطمینان کی شکل پیدا ہو جائے تو رہن واپس کر دینا چاہیئے اس وجہ سے انہیں امانت کی تاویل میں یہ تکلف کرنا پڑا لیکن ہم نے جو تاویل کی ہے اس میں آیت و حدیث دونوں کا محل الگ الگ معین ہو گیا ہے اس وجہ سے نہ اس تکلف میں پڑنے کی ضرورت باقی رہی اور نہ اُس کی توجیہ میں دلائل جمع کرنے کی ضرورت باقی رہی ہے

(باقی آئندہ)

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

حدیثوں کے متعلق ایک اعتراض کا جواب

حدیثوں کی حجیت اور دین میں ان کی اہمیت پر اردو میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور سچ یہ ہے کہ ان تحریروں کے بعد بھی جو لوگ ان کے قابل قبول اور لائق اعتماد ہونے میں شک و تردد کرتے ہیں وہ محض ضد، تعصب اور کسی خطرناک گمراہی کا شکار ہیں۔ اس مضمون میں پہلے ان کے بعض شکوک کا جواب دیا جاتا ہے اور اس کے بعد اخبار آحاد کی حجیت کا ذکر کیا جائے گا اور آگے اس سلسلہ کی کچھ اور باتیں تحریر کی جائیں گی۔

حدیثوں کا انکار کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ قرآن مجید بذات خود دین اور مسائل شریعت کی وضاحت کے لئے کافی ہے اور اس کے اندر جملہ مہمات کا حل اور تمام تفصیلات موجود ہیں اس لئے حدیثوں کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں اور ان سے قطع نظر مجرد قرآن مجید میں غور و فکر کرنے سے مقاصد دین کے متعلق آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس شبہ کے ثبوت میں قرآن مجید کی بعض آیتوں مثلاً "مافرطنا فی الکتاب من شئ" وغیرہ اور ایک روایت "ما اتاکم عنی فاعرضوہ علی کتاب اللہ فان وافق کتاب اللہ فانا قلتہ وان خالف کتاب اللہ فلم اقلہ انا وکیف اخالف کتاب اللہ وبہ ھدانی" سے استدلال کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ روایتیں اگر خلاف قرآن ہوں تو قابل رد اور اگر موافق قرآن ہوں تو بھی ان کی کوئی ضرورت نہیں اس لئے کہ قرآن مجید میں تو وہ مذکور ہی ہے۔

یہ اور اس طرح کے بعض اور نہایت لغو و لاطائل اور مضحکہ خیز شبہات پیش کئے جاتے ہیں جو نہ

صرف یہ کہ غلط بلکہ اپنے اندر مختلف غلطیوں کو سمیٹے ہوتے ہیں اس لئے سردست ان ہی کے متعلق اور اگر آئندہ ضرورت ہوئی تو اس قسم کے دوسرے شبہوں کا جواب دیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ معترضین جن آیتوں کو اپنے خیال کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ان سے ہرگز ان کے منشا کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر صرف قرآن مجید کافی ہوتا اور رسول کی تعلیم و ہدایت کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تو اس بات کو قرآن مجید میں صراحۃً کیوں نہیں بیان کیا گیا بلکہ اس کے برعکس وہ تو رسول کی اتباع و اطاعت کو ضروری اور خدا کی اتباع و اطاعت کی طرح لازمی قرار دیتا ہے اور رسول کی متعدد ایسی خصوصیات کو جنکی تفصیل کا یہ محل نہیں بیان کرتا ہے جن سے رسول کی مستقل بالذات حیثیت کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں صرف قرآن مجید کو کافی سمجھنا اور حدیثوں کی ضرورت تسلیم نہ کرنا ایک مہمل سی بات ہے اگر ان آیتوں کو ان کے موقع و محل سے الگ کر کے صرف اسی نوعیت سے دیکھا جائے جس نوعیت سے معترضین دیکھ رہے ہیں تب بھی ان کا مفہوم اور قرآن مجید کے کافی ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ :۔

قرآن مجید نے دین کے تمام مبادی و مسائل یا تو خود بنفس نفیس واضح کر دیے ہیں یا جن باتوں اور جزئیات کی اس نے وضاحت نہیں کی ہے ان کی شرح و تفصیل سنت میں موجود ہے۔ اور سنت کے اندر موجود ہونے سے بھی قرآن کا کافی اور وافی ہونا صحیح و ثابت ہے۔ پس دونوں آیتوں میں اگر قرآن کی کفایت کا ذکر ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ وہ بذاتِ خود یا بحوالہ سنت کافی ہے جہاں تک آیتِ قرآنی (ما فرطنا فی الکتاب) کا سوال ہے اس میں " الکتاب " سے قرآن مجید مراد ہی نہیں ہے بلکہ ام الکتاب اور لوح محفوظ مراد ہے چنانچہ پوری آیت اس طرح ہے :۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ	زمین میں چلنے والے چوپائے اور اپنے بازوؤں
يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ	سے اڑنے والی چڑیاں سب تمہاری ہی جیسی امتیں
مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ ثُمَّ إِلَىٰ	ہیں ہم نے کتاب میں کچھ کمی نہیں کی پھر ان کو ان کے
رَبِّهِمْ يُحْشَرُونَ ۝ (انعام ۳۸)	خداوند کی طرف اکٹھا کیا جائے گا۔

اس صورت میں اس کا جو مفہوم ہے وہ صرف اس قدر کہ دنیا کی تمام مخلوقات کی روزی، عمر اور اعمال وغیرہ تمہارے اعمال، آجال اور ارزاق کی طرح لوح محفوظ میں درج ہیں۔ اور کوئی چیز

اس میں درج ہونے سے چھوٹی نہیں ہے۔ اس ایک آیت سے ان کے استدلال کی نوعیت پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی پر قیاس کرکے کہا جا سکتا ہے کہ دوسری آیتوں سے ان کے استدلال کی نوعیت کس قدر مضحکہ خیز ہوگی اور اگر بالفرض ان آیتوں کا وہی مفہوم لیا جائے جو یہ حضرات بیان کر رہے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول کی جو اور خصوصیات قرآن نے بتائی ہیں ان کے بعد یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ رسول کی باتوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس تضاد کو دور کرنے کے لئے قرآن کی کفایت کا وہی مطلب لینا چاہیئے جو پہلے بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ قرآن پر عمل کرنا سنت ہی پر عمل کرنا ہوا۔ اس کی تائید بعض واقعات سے بھی ہوتی ہے۔

مطرف بن عبداللہ بن شخیر سے کہا گیا کہ وہ قرآن کے سوا اور کچھ نہ بیان کریں تو انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم ہم لوگ قرآن کا مقابل اور بدل تلاش نہیں کرتے بلکہ اس ذات کا سہارا لیتے ہیں جو قرآن کا ہم سے زیادہ واقف کار تھا۔

عبداللہ بن مسعود نے واشمات (گودنا لگانے والیوں) کو لعنت کی تو بنو اسد کی ایک عورت نے کہا آپ اس طریقہ سے کیوں لعنت کرتے ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ جن لوگوں پر رسول اللہ نے لعنت کی ہو اور اس کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہو میں کیوں نہ ان پر لعنت کروں۔ عورت نے کہا میں نے تو قرآن مجید پڑھا ہے لیکن مجھے خدا کی اس لعنت کا علم نہیں ہوا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا کیا تم نے قرآن مجید کی یہ آیت نہیں پڑھی ہے وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔

مشہور تابعی طاؤس بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس نے جب انہیں عصر بعد دو رکعت نماز پڑھنے سے منع کیا تو انہوں نے عرض کیا کہ اس کی ممانعت تو اس لئے ہے کہ انہیں مستقل سنت نہ بنا لیا جائے۔ حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ آنحضور نے عصر بعد کوئی نماز پڑھنے سے منع کیا ہے، ایسی حالت میں میں نہیں جانتا کہ تمہارے اس عمل پر تمہیں عذاب ملے گا یا اجر۔ اللہ کا ارشاد تو یہ ہے۔ وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم۔

حکم بن ابان سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عکرمہ سے امہات الاولاد کے متعلق دریافت کیا تو جواب ملا کہ وہ آزاد ہیں۔ ابن ابان نے وجہ پوچھی تو عکرمہ نے کہا قرآن سے یہ ثابت ہے، حکم نے وہ آیت دریافت کی تو عکرمہ نے یہ آیت تلاوت کی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا

الرسول واولی الامر منکم۔

عمران بن حصین نے ایک شخص کو کہا تم عجیب احمق آدمی ہو کیا کتاب اللہ کے اندر ظہر کی چار رکعتوں اور ان کے سِرّی ہونے کا ذکر ہے؟ پھر انہوں نے دوسرے وقتوں کی نمازوں اور زکوٰۃ وغیرہ کے متعلق اس سے پوچھا کہ کیا ان سب کا قرآن میں تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے؟ آخر قرآن مجید نے ان چیزوں کو مبہم ہی رکھا ہے البتہ حدیثیں ان امور اجمال کی شرح و تفسیر کرتی ہیں۔

عبدالرحمن بن یزید نے احرام باندھنے والے ایک شخص کو عام آدمیوں جیسا لباس پہنے دیکھا تو اسے اس سے منع کیا، اس نے کہا کس آیت کی رو سے آپ میرا لباس اتروانا چاہتے ہیں انہوں نے جواب میں یہ آیت پڑھی (وما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا)

امام اوزاعی کا مشہور مقولہ ہے:۔

الکتاب احوج الی السنۃ من السنۃ الی الکتاب۔ کتاب کو (شرح و تعبیر میں) سنت کی اس سے زیادہ احتیاج ہے جتنی سنت کو کتاب کی احتیاج ہے

میمون بن مہران سے روایت ہے کہ فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول میں ردالی اللہ کا مطلب کتاب الٰہی کی طرف اور ردالی الرسول کا مطلب آپ کے موجود ہونے کی صورت میں آپ کی ذات کی طرف اور آپ کی وفات کے بعد آپ کی سنت کی طرف رجوع ہوگا۔

غرضیکہ یہ اور اس طرح کے متعدد آثار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین نے کبھی سنت سے بے نیازی اور صرف قرآن مجید کو کافی نہیں سمجھا اور نہ انہوں نے ان آیتوں کا سہارا لیا اور ان کا وہ مطلب سمجھا جو آج کل کے نکتہ آفرین دماغوں کی پیداوار ہے۔

اس سلسلہ میں جو روایت پیش کی گئی ہے وہ نہ صرف ضعیف بلکہ بالکل موضوع ہے۔ محدثین اور علماء اصول نے اس پر سخت تنقیدیں کی ہیں علامہ ابن عبدالبر اور امام شاطبی وغیرہ نے اس کی وضعیت کے متعلق علماء کے متعدد اقوال نقل کئے ہیں، عبدالرحمن ابن مہدی کا بیان ہے کہ یہ زنادقہ اور خوارج کی گڑھی ہوئی ہے ان کے نزدیک یہ الفاظ آنحضور صلعم سے ثابت نہیں ہیں۔ علامہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ رسول کریم صلعم کی اطاعت واتباع کا اسی طرح مطلقاً و مجملاً حکم دیا گیا ہے جس طرح کتاب الٰہی

کے اتباع و اطاعت کی تلقین کی ہے اور اس میں کسی طرح کی کوئی ایسی قید نہیں لگائی ہے جس سے ثابت ہو کہ رسول کی اطاعت اُسی وقت کی جائیگی جب وہ کتاب الٰہی کے موافق ہو بعض اہل علم نے اس حدیث پر یہ اعتراض بھی کیا ہے کہ اس میں احادیث کو قرآن کے مطابق جانچنے اور پرکھنے کی جو تعلیم دی گئی ہے اس کے مطابق جب خود اس حدیث کو قرآن پر پرکھا جاتا ہے تو وہ اس کے خلاف معلوم ہوتی ہے کیونکہ کتاب اللہ میں کہیں اس کا ذکر نہیں ہے کہ رسول کی وہی حدیث قبول کی جائے گی جو کتاب اللہ کے موافق ہو بلکہ اس کے برعکس اس میں تو رسول کی اقتدار و اطاعت کا حکم اور اس کی مخالفت کی ہر حال میں ممانعت ملتی ہے، صاحب کشف الخطا نے صنعانی کے حوالہ سے اس حدیث کو موضوع کہا ہے۔

غرضیکہ اس حدیث کی وضعیت پر محدثین اور علمائے اصول کا پورا اتفاق ہے اس لئے وہ سرے سے لائق بحث نہیں۔

مگر یہ کتنی عجیب اور دلچسپ بات ہے کہ ایک طرف تو حدیث وسنت کو قابلِ اعتماد بھی نہیں سمجھا جاتا اور دوسری طرف ضعیف و موضوع روایات تک کو عدمِ حجیتِ حدیث کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اور اگر یہ حضرات جو احادیث کو قابل اعتنا نہیں سمجھتے احادیث موضوعہ تک سے اس کی عدم حجیت ثابت کرنے کے درپے ہیں تو پھر صحیح و ثابت روایات سے ان لوگوں کو استدلال کی اجازت کیوں نہیں دیتے جو احادیث کو مستند اور دین کا اہم سرمایہ سمجھتے تھے۔ ہم نے اپنے ایک مضمون میں منکرین حدیث کے رد میں صرف آیات قرآنی سے احادیث کا استنا و ثابت کر کے قرآن کے بزعم خود غلط متبعین کی "اتباع قرآنی" کا راز فاش کیا ہے لیکن اس پر اہلِ علم اس قدر لکھ چکے ہیں کہ اس کی اشاعت کی ضرورت مناسب نہ معلوم ہوئی۔ لیکن جب موضوع حدیثوں تک سے احتجاج کے منکرین حدیث خود روادار ہیں (اور یہی احتجاج احادیث کے حجت و مستند ہونے کا بڑا ثبوت ہے) تو کیوں نہ حدیثوں کی حجیت صحیح اور معتبر روایات سے ثابت کی جائے۔ ذیل میں اس طرح کی چند روایات نقل کی جاتی ہیں:-

تركت فيكم امرين لن تضلوا ما تمسكتم بهما كتاب الله وسنة رسوله۔	میں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں جبتک ان دونوں کو مضبوطی سے پکڑے رہوگے ہرگز گمراہ نہ ہوگے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔

صحیح بخاری میں ہے:۔

ان احسن الحديث كتاب الله واحسن الهدى هدى محمد صلى الله عليه وسلم	سب سے اچھی بات اللہ کی کتاب اور سب سے اچھی ہدایت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت ہے

حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں:۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال كل امتى يدخلون الجنة الا من ابى قالوا ومن يابى قال من اطاعنى دخل الجنة ومن عصانى فقد ابى۔	رسول اللہ نے فرمایا کہ میری تمام امت جنت میں داخل ہوگی سوائے اس کے جس نے انکار کیا۔ لوگوں نے پوچھا کون شخص انکار کرے گا آپ نے فرمایا جس نے میرا حکم مانا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نا فرمانی کی اس نے انکار کیا۔

صحیح بخاری میں ابوہریرہؓ ہی سے ایک اور روایت ہے:۔

ان الله يغنيكم بالاسلام وبمحمد صلى الله عليه وسلم	بیشک اللہ نے تم لوگوں کو اسلام اور محمدؐ کے ذریعہ (ہر چیز سے) مستغنی کر دیا ہے۔

دوسری روایت میں ہے:۔

دعونى ما تركتكم انما اهلك من كان قبلكم سوالهم واختلافهم على انبيائهم فاذا نهيتكم عن شئ فاجتنبوه واذا امرتكم بامر فانوا منه ما استطعتم۔	جو کچھ میں نے تمہارے لئے چھوڑ دیا ہے اتنے ہی پر مجھے چھوڑ دو (اس کے علاوہ مزید مجھ سے سوالات نہ کرو) تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں ان کو ان کے سوالات اور انبیاء سے اختلافات نے ہلاک کیا۔ جب میں تمہیں کسی چیز سے روکوں تو اس سے رک جاؤ اور جب کسی بات کا حکم دوں تو بقدر استطاعت اسے انجام دو۔

حضرت جابرؓ کی ایک طویل روایت کا ٹکڑا ہے :-

فمن اطاع محمداً صلی اللہ علیہ وسلم فقد اطاع اللہ ومن عصی محمداً صلی اللہ علیہ وسلم فقد عصی اللہ ورسولہ	جس نے محمدؐ کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی۔

مقدام بن معدیکرب کی مشہور روایت ہے :-

الا انی اوتیت الکتاب ومثلہ معہ الا یوشک رجل شبعان علی اریکتہ یقول علیکم بھذا القرآن فما وجدتم فیہ من حلال فاحلوہ وما وجدتم من حرام فحرموہ۔ الا ان ما حرم رسول اللہ مثل ما حرم اللہ۔	آگاہ! مجھ کو کتاب اور اس کے ساتھ اس جیسی چیز ملی ہے عنقریب آسودہ حال شخص ٹیک لگائے کہے گا کہ تمہارے لئے صرف یہ قرآن کافی ہے جو کچھ تمہیں اس میں حلال ملے اسے حلال اور جو کچھ اس میں حرام ہے اسے حرام سمجھو۔ آگاہ! جو کچھ رسول اللہ نے حرام قرار دیا ہے وہ بھی اللہ کے حرام قرار دئے ہوئے کیطرح ہے

محمد بن منکدر جابر سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ نے فرمایا :-

یوشک باحدکم یقول ھذا کتاب اللہ ما کان فیہ من حلال احللناہ وما کان فیہ من حرام حرمناہ الا من بلغہ حدیث فکذب بہ فقد کذب اللہ ورسولہ والذی حدثہ۔	عنقریب تم میں سے کوئی شخص کہے گا کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اس کے اندر جو کچھ حلال ہے ہم اسے حلال اور اس کے اندر جو کچھ حرام ہے اسے حرام قرار دیں گے۔ سن لو کہ جس شخص کو کوئی حدیث پہنچی اور اس نے اسے جھٹلا دیا تو اس نے اللہ، اسکے رسول اور اس چیز کو جھٹلایا جسے اس نے بیان کیا ہے

یہ اور اس طرح کے متعدد آثار و روایات سے احادیث کی حجیّت و اہمیت ثابت ہے، لیکن یہ کس قدر دیدہ دلیری کی بات ہے کہ صحیح و ثابت روایتوں کو چھوڑ کر موضوع اور غلط روایتوں سے صرف اس لئے استدلال کیا جائے کہ وہ اپنے مطلب کی ہیں ع۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو۔

یہ منکرین حدیث کے ایک اعتراض کا جواب تھا اسی پر دوسرے اعتراضات کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر مہمل اور لغو ہوں گے ✱

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولینا امین احسن اصلاحی

۱۔ تدبر قرآن (قرآن فہمی کی رہنما) ۔۔۔ ۳/۲۵

۲۔ تدبر قرآن (تفسیر آیہ بسم اللہ و سورۂ فاتحہ) ۔۔۔ ۷۵/-

۳۔ اسلامی قانون کی تدوین ۔۔۔ ۲/- ۔۔۔ ۳/-

۴۔ عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصرہ ۔۔۔ ۲/۲۵

مطبوعات دیگر مصنفین

۱۔ (آنحضرت) سیرت ابن ہشام ۔۔۔ ۴۰/-

۲۔ ابوبکرؓ صدیق اکبر ۔۔۔ ۴/۵۰

۳۔ عمرؓ فاروق اعظم ۔۔۔ ۲۰/-

۴۔ حیات امام ابوحنیفہؒ ۔۔۔ ۱۵/-

۵۔ حیات امام احمد بن حنبلؒ ۔۔۔ ۱۰/-

۶۔ آثار امام شافعیؒ ۔۔۔ ۱۲/-

۷۔ حیات امام مالکؒ ۔۔۔ ۱۰/-

۸۔ حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ۔۔۔ ۲۱/-

۹۔ زادِ سفر (حصہ اوّل) ۔۔۔ ۳/۷۵

۱۰۔ ISLAM AND THE WORLD. ۔۔۔ ۴/-

ملنے کا پتہ: **مکتبہ میثاق رحمان پورہ** اچھرہ۔ لاہور ۱۲

محمد الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمان پورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا

مبر 1964ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے۔
سالانہ چھ روپے (پندرہ شلنگ)

ماہنامہ

میثاق

جلد ۱۰ | شعبان المعظم ۱۳۸۴ھ | شمارہ ۱۲

فہرست مضامین

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ:-

منیجر ماہنامہ میثاق ○ رحمان پورہ اچھرہ۔ لاہور ۱۲

ہندوستانی خریداروں کے لئے ترسیلِ زر کا پتہ:-

منیجر دائرۃ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح

سرائے میر۔ اعظم گڑھ۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

اس شمارے میں ہم مولینا تھانوی ؒ کے اس فتوے پر تنقید کرنا چاہتے تھے جس کا حوالہ جناب مفتی محمد شفیع صاحب نے دیا ہے لیکن مولینا رحمۃ اللہ علیہ کے بعض ثقہ اور ذی علم معتقدین نے وضاحت کر دی ہے کہ اوّل تو اس فتوے کی نسبت ہی مولانا کی طرف مشکوک ہے پھر اس کا تعلق انگریزی دور کی ان دیسی ریاستوں سے ہے جن کی حیثیت آزاد حکومتوں کی نہیں بلکہ نوابیوں اور تعلقوں کی تھی۔ ان میں ریاست کی سربراہی قوم کے ووٹوں سے نہیں بلکہ وراثت اور ولی عہدی کے ذریعے سے مورث سے وارث کو منتقل ہوتی تھی۔ جس سے بعض اوقات یہ صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ ذکور میں سے کوئی وارث موجود نہ ہونے کے باعث اناث میں سے کوئی صغریٰ یا کبریٰ گدی کی وارث بن جاتی۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ مفتی کے جواب کا تعلق سوال کی نوعیت سے ہوتا ہے اس وجہ سے اس فتوے کو یہاں کے حالات پر منطبق کرنا بالکل غلط ہے۔ مولینا نے حکومتوں کی جو تقسیم کی ہے وہ بھی ان کی ایک خاص اپنی ذہنی تقسیم ہے، نہ وہ دنیا کے موجودہ مروجہ اشکال حکومت پر منطبق ہوتی، نہ پاکستان کے دستور و نظام پر۔ علاوہ ازیں مولانا نے فتوے میں بطور استدلال ملکہ سبا کی حکمرانی کا ذکر کیا ہے لیکن مولینا کے ایک معتقد نے ان کی تفسیر کا ایک حوالہ ہم کو دکھایا جس میں انہوں نے اپنی یہ دلیل خود ہی ختم کر دی ہے اور بعینہٖ وہی موقف اس مسئلے میں اختیار کیا ہے جو اپنے پچھلے شمارے والے مضمون میں ہم نے اختیار کیا ہے۔ ایسی صورت میں اس فتوے پر کوئی بحث بالکل غیر ضروری ہے۔ ہم مفتی شفیع صاحب سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ خود اس صورت حال کی وضاحت کر دیں گے اور اگر ان کی رائے کی بنیاد مجرد اس فتوے ہی پر ہے تو اپنی اس رائے پر بھی

نظر ثانی کریں گے ۔

انتخابات کے نئے پروگرام کے مطابق چونکہ صدر کے انتخاب کا مرحلہ اب بالکل سامنے ہے اس وجہ سے اس موقع پر چند باتیں ہم بنیادی جمہوریتوں کے ارکان سے کہنا چاہتے ہیں جن کے فیصلے ہی پر اب اس ملک کی قسمت کا انحصار ہے ۔

سب سے پہلے ہمارے ان نمائندوں کو یہ بات پیش نظر رکھنی ہے کہ سیاست میں بیجا عقیدت ایک غیر فطری مداخلت ہے ۔ اگر مس فاطمہ جناح کا آپ احترام کرتے ہیں تو یہ احترام سر آنکھوں پر لیکن صدر کا انتخاب کرتے وقت آپ اس احترام کو بالائے طاق رکھ کر معاملے کو اس پہلو سے دیکھیں کہ آپ ملت کے لئے ماں کا انتخاب نہیں کرنے چلے ہیں بلکہ ریاست کے لئے صدر کا انتخاب کرنے چلے ہیں ۔ اس منصب کی عظیم ذمہ داریوں کے لحاظ سے دونوں شخصیتوں میں سے جس شخصیت کو آپ موزوں تر پائیں اس کو ووٹ دیں ۔ اپنی اس ذمہ داری کی ادائیگی میں اپنے ذاتی جذبات عقیدت کو مزاحم نہ ہونے دیں ۔ ورنہ اس کا خمیازہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس دنیا میں بھی بھگتنا پڑے گا اور صرف ۸۰ ہزار ممبروں ہی کو نہیں بلکہ دس کروڑ پاکستانیوں کو بھگتنا پڑے گا ۔ اس معاملے میں آپ کی غلطی اس بات کا بھی ثبوت ہوگی کہ ابھی ہم پاکستانیوں میں جمہوریت کی ذمہ داریوں کا شعور نہیں پیدا ہوا ہے ۔ جو قومیں آج جمہوری نظام کامیابی سے چلا رہی ہیں ان کی یہ مشترک صفت ہے کہ وہ اپنے عہدوں اور مناصب کے لئے اشخاص اُن عہدوں کے تقاضوں کے مطابق منتخب کرتی ہیں ۔ افسوس ہے کہ متحدہ محاذ نے ایک خالص سیاسی و انتظامی معاملے میں آپ کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے اور آپ کو ایک سخت امتحان میں ڈال دیا ہے ۔ یہ درحقیقت حصول اقتدار کے لئے ایک سازش ہے جس کو اگر آپ نے ناکام نہ بنا دیا تو آپ کا ملک سخت خطرے میں پڑ جائے گا ۔ اس اندیشے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ سیاسیات میں سازشی ہتھکنڈوں کے استعمال کا ردعمل بعض اوقات نہایت خطرناک نتائج پر منتہی ہوتا ہے ۔

دوسری بات یہ یاد رکھنے کی ہے کہ اس ملک میں اسلام نہ صدر ایوب کے ہاتھوں آیا ہے نہ مس فاطمہ جناح کے ۔

صدر ایوب اگر اسلام سے بعید ہیں تو مس فاطمہ جناح بعید تر۔ علیٰ ہذا القیاس مسلم لیگ اور متحدہ محاذ سے بھی اسلام کے لئے کسی خیر کی امید نہ رکھئے۔ عملاً یہ دونوں ہی دین سے دور ہیں بس یہ فرق ہے کہ متحدہ محاذ میں ایسی پارٹیاں بھی شامل ہیں جو عقیدۃً بھی اسلام کی باغی ہیں جب کہ مسلم لیگ میں کم از کم اسلامی نظام کے کھلم کھلا مخالفت کرنے والے موجود نہیں ہیں۔ متحدہ محاذ کے ساتھ اسلامی نظام کی حامی جو جماعتیں شامل ہیں اول تو محاذ کے اندر ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے، یہ حقیقت بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات سے اچھی طرح واضح ہو چکی ہے، ثانیاً ان میں سے کم از کم ایک جماعت —— جماعت اسلامی کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لئے اس ملک میں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ہے۔ متحدہ محاذ کی اسلام دشمن جماعتیں اسلام کی مخالفت بے دلیل کریں گی اور جماعت اسلامی کے امیر صاحب اور ان کے اتباع ان کے لئے اپنی نرالی فقاہت سے شرعی دلیلیں ایجاد کریں گے۔ جہاں تک مس فاطمہ جناح کا تعلق ہے نہ وہ مذہب کی مدعی ہیں، نہ فکراً و عملاً ان کو مذہب سے کبھی کوئی واسطہ رہا ہے۔ ان کی طبعی مناسبت دین بیزاروں سے جتنی ہو سکتی ہے، دینداروں سے نہ اتنی ہوئی ہے نہ ہو سکتی ہے۔ آپ اگر ان کو اپنے ووٹ سے برسر اقتدار لاتے ہیں تو اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ ان کے ساتھ آپ نے ان کی دین بیزاری کو بھی اپنے اوپر مسلط کر لیا بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ آپ نے ہر شعبہ زندگی میں مرد و زن کی کامل مساوات کے خالص مغربی نظریے کو اعتقاداً و عملاً تسلیم کر لیا۔ اس کا قدرتی ردعمل جو آپ کے معاشرے پر ہوگا وہ یہ ہوگا کہ ان کے اقتدار کے چند دنوں کے اندر اندر آپ کا معاشرہ اتنا تبدیل ہو جائے گا کہ پھر قیامت تک اس کے اسلام کی طرف مڑنے یا موڑنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جائے گا۔ یہ جنگ جو آج اسلامیت و مغربیت میں ہو رہی ہے وہ مغربیت کی فتح پر ختم ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ صدر ایوب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ اسلام سے ناواقف ضرور ہیں لیکن اسلام سے بیزار نہیں ہیں۔ ان کا مزاج سپاہیانہ اور ان کے اندر حمیت ملی و قومی ہے۔ انہوں نے غلطیاں ضرور کی ہیں لیکن ان کی اصلاح کی راہ مسدود نہیں ہوئی ہے۔ ان سے لڑنے کے لئے میدان کھلا ہوا ہے اور انہوں نے اپنے عمل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان میں اصلاح پذیری کی صلاحیت موجود ہے۔ وہ کوئی سوکھی ہوئی لکڑی نہیں ہیں جو ٹوٹ تو سکے لیکن لچک نہ سکے۔ وہ چند سال میں

بہت بدلے ہیں اور آئندہ بہت بدل سکتے ہیں۔ اس انتخاب میں وہ کامیاب ہوگئے تو ہمیں امید ہے کہ وہ عوامی آدمی بھی بن جائیں گے اور مذہبی پہلو سے بھی ان میں مفید تبدیلیاں آئیں گی۔

تیسری بات یہ یاد رکھئے کہ آپ کو صرف جمہوریت ہی کی نہیں بلکہ مستحکم حکومت کی بھی ضرورت ہے۔ آپ کے ملک کے عوام برطانیہ کے عوام کی طرح تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور نہ آپ کی سیاسی پارٹیاں وہاں کی پارٹیوں کی طرح اپنے حقوق و فرائض کے معاملے میں تربیت یافتہ ہیں۔ اس امر کو نظرانداز نہ کیجئے کہ یہاں عوام کو آسانی سے گمراہ کیا جا سکتا ہے اور سیاسی پارٹیاں بسا اوقات مفادِ ملک کے خلاف سرگرمیوں میں منہمک ہو جاتی ہیں۔ پھر ہمارے ملک کے دو بازو ہیں اور دونوں میں ہزار میل کا فاصلہ بھی ہے اور بدقسمتی سے مفسد پارٹیوں نے دونوں کے اندر شدید قسم کی غلط فہمیوں کی تخم ریزی بھی کر رکھی ہے۔ علاوہ ازیں بھارت کے ساتھ ہمارے تعلقات ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کیا صورت پیش آ جائے۔ ایسے حالات میں آپ کے لئے جمہوریت کی وہ شکل جس کی علم بردار مس فاطمہ جناح ہیں، نہایت خطرناک ہے۔ مس فاطمہ جناح کے پیچھے جو پارٹیاں جمع ہوئی ہیں ان کے درمیان کوئی رابطہ ایوب دشمنی کے سوا نہیں ہے۔ صدر ایوب اگر خدانخواستہ ہٹ گئے تو ان کا یہ رابطہ بھی ٹوٹ جائے گا اور پھر یہ ایک دن کے لئے بھی کوئی مضبوط حکومت نہ بنا سکیں گی۔ چودھری محمد علی صاحب نے یہ مینڈکوں کی پنسیری باندھی ہے جس کو باندھے رکھنے پر مس فاطمہ جناح قادر نہ ہو سکیں گی اور خود چودھری صاحب کا تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ اندرون خانہ سیاست کے تو ماہر ہیں لیکن میدان میں نکل کر حالات کا مقابلہ کرنے کے معاملے میں سخت بودے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ ابتری اور انتشار کی شکل میں ظاہر ہوگا اور پھر دو ہی امکانات سامنے ہیں۔ یا تو کوئی انقلاب ظہور میں آتے یا خدانخواستہ ہم آزادی ہی سے محروم ہو بیٹھیں۔ ان دونوں میں سے کوئی امکان بھی گوارا کئے جانے کے لائق نہیں ہے۔ اس وجہ سے صدر ایوب کو ووٹ دیجئے تاکہ آپ جمہوریت کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کو بھی مضبوط بنا سکیں۔ انگریزوں کا نظام بالکل غیر فطری اور غیر عقلی ہے۔ یہ تو اُن کے مخصوص قسم کے ٹھنڈے سیاسی مزاج کی برکت ہے کہ وہ ان کے ہاں چل رہا ہے۔ اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے مضبوط عوامی قیادت اور ہمہ گیر عوامی سیاسی شعور

ناگزیر ہیں ہمارے ہاں یہ چیزیں مفقود ہیں اس وجہ سے ہمارے لئے ان کی رسیں خطرناک ہوگی۔ ہم اپنے ملک کے سیاسی استحکام کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ ہم پچھلے شمارے میں لکھ چکے ہیں کہ اس کے لئے ہر چیز قربان کی جا سکتی ہے۔ ہمیں کمزور قوم کی حیثیت سے جینے کا ایک لمحے کے لئے بھی تصور نہیں کرنا چاہیے۔

یہ حقیقت بھی یاد رکھئے کہ حکومت کا مزاج فاعلانہ ہونا چاہیئے نہ کہ منفعلانہ۔ اس کی اصلی سرشت مردانہ ہے نہ کہ زنانہ۔ عورت کا مزاج منفعلانہ ہوتا ہے اور اس کے اصل فطری فرائض کے لحاظ سے اس کا یہی مزاج اس کے لئے موزوں ہے۔ اپنے اس مزاج کے لحاظ سے عورت حکومت کے لئے فطرتاً ناموزوں ہے۔ اگر حکومت عورت کے سپرد کر دی جائے تو حکومت کا مزاج بھی اس کے اثر سے بگڑ کر زنانہ ہو جاتا ہے جس سے اس کی صلاحیت کار بالکل برباد ہو کر رہ جاتی ہے۔ علم السیاست کے مشہور راہبر بلنچلی نے تاریخی اور فلسفیانہ دونوں ہی پہلوؤں سے ثابت کیا ہے کہ حکومت کے معاملات میں عورت کی مداخلت حکومت کے مزاج کو بگاڑ کے رکھ دیتی ہے۔ یہی رمز ہے کہ امریکہ کے لوگوں نے جمہوریت اور مساواتِ مرد و زن کے نظریہ پر ایمان رکھنے کے باوجود آج تک اپنے ہاں کسی عورت کو صدر نہیں بنایا۔ انگریز وراثت اور ولی عہدی کے نظام کی مجبوریوں کی وجہ سے کبھی کبھی کسی عورت کو بادشاہ بنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُن کے ہاں بادشاہ محض ایک مقدس نشان ہے، حکومت ان کے ہاں چرچل، ایٹلی، ایڈن، میک ملن اور ولسن جیسے لوگوں ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اس وجہ سے اس نے قوامیت اور سربراہی کا منصب مرد کے سپرد کیا ہے۔ عورت کو نہ گھر کا قوام بنایا ہے نہ باہر کا۔ ہمارے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی جو اپنی باگ ایک عورت کے ہاتھ میں پکڑائے گی۔ آپ کس طرح یہ توقع کر سکتے ہیں کہ اپنی حکومت کا مزاج و کردار زنانہ بنا کر اور اپنے پیغمبرؐ کی ہدایت کی مخالفت کر کے فلاح پا سکیں گے؟ ہمیں اپنی حکومت کے مردانہ مزاج و کردار کو نہ صرف باقی رکھنا ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ اس کو ترقی دینا ہے اس وجہ سے اس انتخاب کے موقع پر ان لوگوں کی کوششوں کو ناکام بنا دیجئے جو ہماری حکومت کے مزاج کو نسوانی اور نامردانہ بنانا چاہتے ہیں۔

اس نازک موقع پر اس بات کو بھی یاد رکھئے کہ دین اور عقل دونوں سے بعید تر جماعت اس ملک میں اگر کوئی ہے تو جماعت اسلامی ہے۔ اس کی الٹی منطق اور اس کے دینی فہم دونوں کا جائزہ ہم پچھلے شمارے میں لے چکے ہیں اور آئندہ ہم اس کے سارے فکر و فلسفہ کا جائزہ لینے والے ہیں۔ یہ جماعت اب صحیح فکر اور صحیح عمل کی توفیق سے محروم ہو چکی ہے۔ اس کی ہر بات الٹی ہوتی ہے اور جو قدم بھی یہ اٹھاتی ہے اس سے اپنی بے راہ روی اور ضلالت کا ثبوت مہیا کرتی ہے۔ اس جماعت نے مس فاطمہ جناح کی حمایت میں جو دلیل پیدا کی ہے اس کی بنیاد ملک کے موجودہ حالات کی نزاکت پر رکھی ہے، یعنی حالات بہت پیچیدہ اور نازک ہیں اس وجہ سے اسے مس فاطمہ جناح کی صدارت کی حمایت پر مجبور ہونا پڑا۔ غور کیجئے کہ نازک اور پیچیدہ حالات دنیا میں مردوں کے حل کرنے کے ہوتے ہیں یا عورتوں کے؟ جس قوم کے مرد ملکی مسائل کی گتھیاں سلجھانے سے قاصر ہو جائیں گے، کیا اس کے مسائل ایک عورت حل کرے گی؟ پھر اس سے زیادہ قابل ماتم بات یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ لوگ مجبوری کا عذر پیش کرتے ہیں کہ جس طرح اضطرار میں کوئی جان بچا لینے کے لئے خنزیر کھا لیتا ہے اسی طرح انہوں نے مس فاطمہ جناح کی صدارت گوارا کر لی ہے، دوسری طرف یہ حال ہے کہ ملتان میں اس جماعت کے قیم نے مس فاطمہ جناح کو "نورِ خدا" سے تشبیہ دی۔ بتائیے، ہے ان دونوں باتوں میں کوئی مناسبت؟ جن لوگوں کو مس فاطمہ جناح کے اندر بھی نورِ خدا نظر آئے انہیں کہاں نورِ خدا نظر نہیں آ سکتا؟ یہ مس فاطمہ جناح کی خوبی نہیں ہے کہ آج ان کے اندر نورِ خدا پیدا ہو گیا ہے۔ بلکہ صرف ان حضرات کی آنکھوں کی خیرگی کا کرشمہ ہے کہ انہیں ان کے اندر بھی نورِ خدا نظر آنے لگا ہے۔ جب کسی کی غیرت ایمانی مردہ اور بصیرت روحانی سلب ہو جاتی ہے تو اس کو اسی طرح کے عجائب نظر آتے ہیں۔ آخر دنیا نے گایوں اور بچھڑوں کی پوجا اور پتھروں اور درختوں کی پرستش یوں ہی تو نہیں کی ہے!!

یہ امر بھی یاد رکھئے کہ جو لوگ اپوزیشن میں ہوتے ہیں ان کے لئے جھوٹے سچے وعدے کرنے اور امیدوں کے سبز باغ دکھانے کے بڑے مواقع ہوتے ہیں۔ وہ انتظام کی ذمہ داریوں اور حکومت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ ہوتے ہیں اس لئے بڑی آسانی سے لوگوں کو بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ یہ راتوں رات دودھ اور شہد کی نہریں جاری کر سکتے ہیں، جمہوریت کی بہار لا سکتے ہیں، کتاب و سنت کے انوار سے ملک کے کونے کونے کو جگمگا دے سکتے ہیں اور معلوم نہیں کیا کیا کچھ کر دے سکتے ہیں لیکن یہ سب کچھ ادھار ہوتا ہے اور اس کے لئے انہیں الفاظ کے

سوا اور کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا۔ جو برسر اقتدار ہو اس کو یہ آسانیاں حاصل نہیں ہوتیں، اس کو سارا معاملہ نقد نقد کرنا پڑتا ہے اور نقد اور نسیہ میں جو فرق ہے وہ معلوم ہے۔ اپوزیشن کے بزرگوں میں سے جن لوگوں کے اقتدار کا ابھی آپ نے تجربہ نہیں کیا ہے ان کے بارے میں ابھی کچھ کہنا تو قبل از وقت ہے لیکن ان میں سے جن جن حضرات کے اقتدار کا تجربہ آپ صوبوں یا مرکز میں کر چکے ہیں ان کے دورِ اقتدار کو حافظے پر ذرا زور ڈال کر یاد کیجئے کہ جب ان کے ہاتھ میں حکومت کی باگ تھی تب انہوں نے کیا بنایا ہے اور پھر اسی سے اندازہ کیجئے کہ آئندہ اگر انہیں آپ نے اقتدار کی امانت سونپی تو وہ کیا بنائیں گے۔

یہاں اپوزیشن کے تمام آزمودہ افراد کا تذکرہ تو بہت طولانی ہو جائے گا جس کیلئے گنجائش نہیں ہے اس لئے ہم صرف چودھری محمد علی صاحب کے حوالے پر کفایت کرتے ہیں۔ چودھری صاحب اپوزیشن کے گل سرسبد ہیں اور ہم بھی ان کی قابلیت کے مداحوں میں ہیں۔ یہ حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل بھی رہ چکے ہیں، وزیر مالیات بھی رہ چکے ہیں اور وزیر اعظم بھی۔ دل میں ان کیلئے چونکہ ایک احترام ہے اس وجہ سے ان کے دور کی بعض باتیں حافظہ میں محفوظ ہیں۔ چودھری صاحب مالیات کے ماہر ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ چودھری صاحب کے دور کے لحاظ سے آج پاکستان کی مالی پوزیشن بہت مستحکم ہے، چودھری صاحب شہری آزادیوں اور جمہوریت کے بڑے دلدادہ ہیں لیکن چودھری صاحب کے دور میں جو سیفٹی قوانین نافذ رہ چکے ہیں، میں ذاتی تجربے کی بنا پر پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ آج کے قوانین ان سے ہزار درجے لبرل ہیں، چودھری صاحب نے ایک "اسلامی دستور" بھی بنوایا تھا جس میں "لا کمیشن" نامی ایک چیز بھی تھی، میں اس کے متعلق بھی ذاتی تجربے کی بنا پر یہ رائے رکھتا ہوں کہ موجودہ مشاورتی کونسل کی پوزیشن آئینی لحاظ سے اس کمیشن سے کہیں زیادہ باوقار اور مضبوط ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ کونسل کوئی کام کرے یا نہ کرے۔ مجھے یاد ہے کہ چودھری صاحب نے اپنے دور میں کشمیر کے مسئلے کو بھی زندہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان کی مسیحائی فدا کارگر نہ ہوئی لیکن صدر ایوب نے نہ صرف کشمیر کے مسئلے کو ایک زندہ مسئلہ بنا دیا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بھارت کے لئے ایک اور مستقل دردِ سر بھی پیدا کر دیا ——— ان باتوں کے ذکر سے مقصود چودھری صاحب کی صلاحیتوں کی تحقیر نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ آج اپوزیشن میں ہونے کی وجہ سے وہ جس بیدردی سے تنقید اور جس فیاضی سے وعدے کر رہے ہیں اس کے متعلق ان کے ماضی کو دیکھ کر فیصلہ کیجئے۔ ان کے بارے میں شروع سے ہماری ایک رائے ہے جو آج ہم بلا کسی ارادہ تحقیر کے ظاہر کر رہے ہیں کہ ان میں ایک سگھڑ بیوی کی تو ساری صفات موجود ہیں لیکن وہ قوامیت کی صفات سے بالکل عاری ہیں۔

محترمہ مس فاطمہ جناح کا اب تک اس کے سوا کوئی تجربہ نہیں ہوا ہے کہ وہ سال میں چند مخصوص مواقع پر ایک خاص ڈھنگ کے بیانات دیتی رہی ہیں۔ انہیں سیاسی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ ان میں کسی مذہبی خدمت کا تو دور کنار کسی سماجی خدمت کا بھی کوئی ذوق و شوق کبھی محسوس نہیں ہوا۔ جمہوریت کا لفظ وہ بار بار دہراتی ہیں لیکن اس کے لئے جس مزاج اور جس جذبۂ خدمت کی ضرورت ہے وہ ان کے اندر مفقود ہے۔ ملک کی صدارت جیسے منصب کے لئے اگر آپ نے محض ان کی انتخابی تقریروں پر اعتماد کر کے انکو انتخاب کر لیا تو ہمیں اندیشہ ہے کہ اس کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔ صدارت کے منصب کی ذمہ داریوں کے لئے قوت، قابلیت اور ساتھ ہی صبر اور بردباری کی ضرورت ہے، وہ ان اوصاف سے بالکل خالی ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ متوقع اس بات کی ہوں گی کہ ان کے احکام کی تعمیل کُن فیکون کی طرح کی جائے اور لوگ اُن کا احترام قائداعظم کی طرح کریں۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوگی، پھر کیا ہوگا، اس کے نتائج کا اندازہ آپ خود کر لیجئے۔

جنرل اعظم فطرتاً ایک ڈکٹیٹر ہیں ختمِ نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جو مارشل لا جاری ہوا تھا اس میں ان کا اصلی مزاج بے نقاب ہو چکا ہے۔ وہ جب جمہوریت کا نام لیتے ہیں تو واقعی ہمیں حیرانی ہوتی ہے۔ یہ ان کے اپنے فکری انقلاب کا کرشمہ ہے یا صدر ایوب کی مخالفت کا جوش ان کو اس نیک راہ پر لایا ہے، اس کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم صرف یہ عرض کر سکتے ہیں کہ ان کے اوپر اعتماد کرنے میں جلدی نہ کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ جمہوریت کا یہ عشق ان کے اندر ایوب دشمنی کی راہ سے پیدا ہوا ہو۔ اگر خدانخواستہ بات یہی نکلی تو ان کے اوپر آپ کا اعتماد نہایت مہلک نتائج کے دروازے کھول سکتا ہے۔ اگر فی الواقع ان کے اندر کوئی نظریاتی تبدیلی ہوئی ہے تو اس کو انہیں کچھ عرصہ سماجی خدمات میں مصروف رہ کر پختہ کرنا چاہیئے۔ بغیر اس ریاضت کے اگر وہ "مادرِ ملت" کی آڑ میں اقتدار حاصل کرنے کے لئے زور لگائیں گے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ ان کے ہاتھوں جمہوریت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ چیز خود ان کے بھی سوچنے کی ہے اور وہ نہ سوچیں تو بی۔ ڈی کے ممبروں کے سوچنے کی ہے۔

تدبر قرآن
امین احسن اصلاحی

(۴۴)

تفسیر سورۂ بقرہ

۹۰ - خاتمۂ سورہ - آیات ۲۸۴-۲۸۶

اب یہ عظیم سورہ ختم ہوگئی۔ آگے کی آیات بطور خاتمہ ہیں۔ اس خاتمہ میں پہلے تو یہ تنبیہ ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب خدا ہی کی ملکیت اور اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ بندوں کے تمام ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ وہ ہر چیز کا حساب کرے گا اور اپنے اختیار مطلق سے جس کو مغفرت کا سزاوار قرار دے گا اس کی مغفرت فرمائے گا اور جس کو سزا کا مستحق پائے گا اس کو سزا دے گا، کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے ارادے اور فیصلے میں مداخلت کر سکے۔

دین کی یہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کا صحیح شعور اس امانت کا اہل بناتا ہے جو اس سورہ میں امت مسلمہ کے سپرد کی گئی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس کو فراموش کر دینے کے سبب سے یہود اور نصاریٰ اس امانت کی سعادتوں سے محروم ہوئے۔ اس اہمیت کی وجہ سے جس طرح جگہ جگہ اس سورت میں اس کی یاد دہانی کی گئی ہے اسی طرح خاتمہ پر بھی اس کی یاد دہانی فرمائی۔

اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کے رسول اور اس کے ایمان لانے والے بندوں نے اس چیز کو قبول کر لیا ہے جو اُن کی طرف اتاری گئی ہے۔ یہی اس پر ایمان لانے کے سزاوار تھے۔ یہ یہود و نصاریٰ کی طرح خدا کے نبیوں اور رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں مبتلا نہ تھے کہ کسی کو مانیں،

کسی کو نہ مانیں اس وجہ سے اللہ نے ان کے لئے ہدایت کی راہ کھول دی اور وہ فائز المرام ہوئے۔ رہے وہ لوگ جو تعصبات کے پھندوں میں گرفتار ہیں تو اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ وہ جس وادی میں چاہیں بھٹکتے پھریں۔ اپنا انجام خود دیکھیں گے۔

اس کے بعد وہ عظیم دعا نمودار ہوتی ہے جو اس امت کے ہر فرد کی صدائے حال ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے اس بھاری ذمہ داری کا احساس بھی ٹپک رہا ہے جو اس امت پر ڈالی گئی ہے، وہ اعتراف بھی نمایاں ہو رہا ہے جو روح ایمان ہے، اُن باتوں سے بچائے جانے کی التجا بھی جھلک رہی ہے جو پچھلی امتوں کے لئے ٹھوکر کا باعث ہوئیں اور ادائے فرض کی راہ میں جن مشکلات کے اندیشے ہیں ان میں استعانت اور جن لغزشوں کے خطرے ہیں ان سے درگزر کی درخواست بھی ہے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

(آیات ۲۸۴-۲۸۶)
لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ
بِهِ اللّٰهُ ۭ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۲۸۴ اٰمَنَ
الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۣ
لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۣ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ڭ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۲۸۵
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ
نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا
وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۲۸۶ۧ

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو ظاہر کرو یا چھپاؤ، خدا اس کا تم سے حساب لے گا، پھر جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا سزا دے گا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۲۸۴

رسول ایمان لایا اس چیز پر جو اس پر اس کے رب کی جانب سے اتاری گئی اور مومنین ایمان لائے۔ یہ سب ایمان لائے اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر۔ ان کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے رسولوں میں کسی کے درمیان فرق نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہم

نے مانا اور اطاعت کی۔ اے پروردگار! ہم تیری مغفرت کے طلبگار ہیں اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، ہر ایک پائے گا جو کمائے گا اور بھرے گا جو کرے گا۔ اے پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہم سے مواخذہ نہ فرمانا۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر اس طرح کا کوئی بار نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے ہو گزرے۔ اور اے ہمارے پروردگار! ہم پر کوئی ایسا بوجھ نہ لاد جس کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہمیں معاف کر، ہمیں بخش اور ہم پر رحم فرما تو ہمارا مولیٰ ہے، پس کافروں کے مقابل میں ہماری مدد کر۔ (۲۸۵-۲۸۶)

۹۱۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

"جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے"۔ یہ جملہ اپنے اندر بیک وقت تین مفہوم رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، دوسرا یہ کہ ہر چیز اسی کے اختیار و تصرف میں ہے، تیسرا یہ کہ بالآخر ہر چیز کا مرجع خدا ہی ہے۔ اردو میں کوئی ایسا ترجمہ اس کا جو ان تینوں مفہوموں کو بیک وقت اٹھا لے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

دل کی پوشیدہ باتوں کے محاسبہ کا مفہوم

"اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ" دل کی پوشیدہ باتوں کا محاسبہ کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ دل میں جو خیالات اور وسوسے گزرتے رہتے ہیں ان کا بھی محاسبہ ہوگا بلکہ اس سے صرف وہ عزائم مراد ہیں جو مضبوط ارادے کے ساتھ دل میں موجود ہیں لیکن کسی مجبوری یا مزاحمت کے سبب سے وہ ظاہر نہ ہو سکے یا عمل میں نہ آسکے۔ مثلاً ایک شخص اگر کسی کے قتل کا دل میں پختہ ارادہ رکھتا ہے تو ہر چند کسی خوف یا مجبوری کے سبب سے اس کا ارادہ بروئے کار نہ آسکے لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں اس ارادے پر اس کی پکڑ ہوگی۔

خدا کی مشیت اس کی حکمت کے مطابق ہے

"فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ" الآیہ۔ اور اس طرح کی دوسری آیات میں، جیسا کہ ہم بار بار اپنی اس کتاب میں واضح کر چکے ہیں، اصل زور جس بات پر ہوتا ہے وہ اس پر ہوتا ہے کہ

خدا کی مشیت میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں ہے اور مقصود اس سے شرک کی نفی ہوتی ہے۔ یہ مقصد نہیں ہوتا ہے کہ خدا کی اس مشیت کے لئے سرے سے کوئی ضابطہ و قاعدہ ہی نہیں ہے۔ خدا کی ہر مشیت اس کی حکمت کے ساتھ ہے۔ چنانچہ یہ مغفرت اور عذاب کا معاملہ بھی اسی ضابطۂ حکمت کے تحت عمل میں آئے گا جو اس کے لئے اس نے مقرر فرما رکھا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی اور کے لئے اس میں کسی مداخلت کی گنجائش نہیں ہے۔

آیت ۲۸۴ بقرہ

اس پوری آیت کے موقع و محل پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک پہلو سے تو اپنے ماسبق سے مربوط ہے اور دوسرے پہلو سے یہ سورہ کے خاتمہ کی نہایت جامع اور مؤثر تمہید ہے۔ اوپر والی آیت میں فرمایا تھا کہ "شہادت کو نہ چھپاؤ، جو شہادت کو چھپاتا ہے اس کا دل آلودۂ معصیت ہو جاتا ہے اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے باخبر ہے"۔ اب اس کے ساتھ اگر یہ مضمون لگا دیجئے کہ "جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کا ہے، اللہ تمہارے ظاہر و باطن سب کا محاسبہ کرنے والا ہے، پھر جس کو چاہے گا وہ بخشے گا اور جس کو چاہے گا، عذاب دے گا" تو گویا بات پوری طرح مدلل بھی ہو گئی اور مکمل بھی۔ یہ آیت کا ربط ماسبق سے ہوا۔

آگے سے اس کا ربط، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، یہ ہے کہ یہ توحید کی آیت ہے۔ احکام و قوانین کے باب میں جس طرح نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اسی طرح عقائد کے باب میں توحید کو اساسِ دین کا مقام حاصل ہے۔ چنانچہ یاد ہوگا کہ جہاں سے اس سورہ میں امت کے لئے تعلیم شریعت کا باب شروع ہوا ہے وہاں سب سے پہلے توحید کا بیان ہوا ہے اس کے بعد نماز کا۔ اب خاتمے پر امت کو کامل حوالگی اور سپردگی کی تعلیم دینے کے لئے توحید کی پھر یاد دہانی کی اور یاد دہانی کا انداز تعلیم سے زیادہ تنبیہ کا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ امت اس امانت کی گراں باریوں کو سمجھے اور غلط سہاروں پر اعتماد کرنے کے بجائے صرف اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کے آگے جواب دہی کے لئے تیار رہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ

رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ"

یہاں رسول اور مسلمانوں کے ایمان کی خبر دینے سے مقصود محض ایک واقعے کی خبر دینا نہیں ہے بلکہ قرآن کے مخالفین بالخصوص یہود کی مخالفت سے بے پروائی کا اظہار ہے۔ سورہ کا آغاز، یاد ہوگا، اس بات سے ہوا تھا کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے میں تو کسی شبہے کے لئے گنجائش نہیں ہے لیکن اس پر ایمان وہی لوگ لائیں گے جن کے اندر خدا ترسی، حقیقت بینی اور حق طلبی ہوگی۔ جو لوگ گروہ پرستی، عصبیت اور اپنی برتری کے زعم میں مبتلا ہوں گے وہ اس کتاب پر ایمان لانے سے محروم رہیں گے۔ اب یہاں خاتمے پر یہ اعلان فرما دیا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھ ایمان لانے والوں نے واضح کر دیا کہ اس ایمان کی سعادت سے بہرہ مند ہونے والے کون لوگ تھے۔ گویا دودھ کے اندر جتنا مکھن تھا وہ نکال کر سامنے رکھ دیا اور اس کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کر دیا کہ اس دودھ کے اندر یہ مکھن تھا جو نکل آیا ہے۔ اب جو بچ رہا ہے یہ چھاچھ ہے خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ کتاب الٰہی پر ایمان لانے والوں میں سب سے پہلے جس کا ذکر ہوا ہے وہ خود رسول کی ذات ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں قانون کی فرمانبرداری اور اطاعت کے معاملے میں پیغمبر بھی اسی سطح پر ہے جس پر عام اہل ایمان ہیں۔ دنیوی بادشاہ اپنی رعایا کو جو قانون دیتے ہیں وہ خود اس قانون سے بالاتر ہوتے ہیں لیکن خدا کے قانون میں خود اس قانون کا لانے والا نہ صرف یہ کہ اس کے تحت ہوتا ہے بلکہ اُسے سب سے آگے بڑھ کر اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ اور اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ کہتے ہوئے اس کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالنا پڑتا ہے۔ یہ ان پیغمبروں کی سچائی کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف ایک ہٹ دھرم ہی جھٹلا سکتا ہے۔

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ الایۃ میں جن اجزائے ایمان کا ذکر ہوا ہے ان پر ہم اسی سورہ کی آیت ۱۷۷ کے تحت گفتگو کر چکے ہیں۔ وہاں اللہ، فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان کی حقیقت سمجھی چاہیے۔ خاص طور پر فرشتوں پر ایمان کی ضرورت ہم نے وہاں تفصیل سے واضح کی ہے۔ البتہ ایک بات کی طرف یہاں بھی اشارہ ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہاں کتاب کا لفظ ہے، یہاں کتاب کے بجائے کُتُب کا لفظ ہے جو کتاب کی جمع ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح ہمارے لئے تمام رسولوں

ایمان لانے والوں سے ... (margin note, partly illegible)

قانون کی فرمانبرداری کے معاملے میں نبی اور امتی سب یکساں ہیں

اجمالی ایمان تمام انبیاء اور تمام صحیفوں پر

پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اہل کتاب صرف اپنی کتاب اور صرف اس نبی یا ان نبیوں پر ایمان کا اظہار کرتے ہیں جن کو وہ اپنے یا اپنا نبی خیال کرتے ہیں، برخلاف اس کے یہ امّت اللہ کے تمام نبیوں اور تمام کتابوں پر ایمان رکھتی ہے۔ جہاں تک اجمالی ایمان کا تعلق ہے ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء، قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ البتہ چونکہ دوسرے انبیاء اور ان کے صحیفوں کی تعلیم محفوظ نہیں رہی۔ نیز ان صحیفوں اور ان انبیاء نے خود خبر دی تھی کہ ان کی شریعت کامل نہیں ہے، کامل شریعت قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے دنیا کو ملے گی۔ اس وجہ سے ہم قرآن اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پر صرف اجمالی نہیں بلکہ تفصیلی ایمان بھی رکھتے ہیں اور اسی تفصیلی ایمان کی دعوت دنیا کو بھی دیتے ہیں۔

اسلوب کی تبدیلی میں بلاغت کا نکتہ

"لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ"، اس ٹکڑے کی شرح ہم اسی سورہ کی آیت ۱۲۵ کے تحت امّت وسط کے کلمہ کی وضاحت کرتے ہوئے کر چکے ہیں۔ البتہ اس میں یکایک اسلوب کی جو تبدیلی ہوئی ہے یعنی بات غائب کے سے نکل کر جو متکلم کے صیغے میں آگئی ہے یہ دھیان میں رکھنے کی ہے۔ اوپر کے ٹکڑے میں بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی گئی ہے لیکن یہ جملہ براہ راست امت کی طرف سے اعتراف و اظہار کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔ اس میں بلاغت کا یہ نکتہ پوشیدہ ہے کہ اوپر کے ٹکڑے میں مسلمانوں کا جو ایمان و عقیدہ بیان ہوا ہے پوری اُمت اس کا اقرار و اظہار کرتی ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کے باب میں کسی تعصب میں گرفتار نہیں ہیں، یہ تمام انبیاء ایک ہی سلسلۃ الذہب کی کڑیاں ہیں اس وجہ سے ہم یہود و نصاریٰ کی طرح یہ نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو رد کر دیں۔ "احد" کا لفظ چونکہ جمع کے مفہوم میں آتا ہے۔ جیسے لستن کاحد من النساء اس وجہ سے اس کے ساتھ لفظ "بین" کا استعمال صحیح ہے۔

سمع کا مستعمل مفہوم

"وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا" سمع کا لفظ یہاں مجرد سننے کے معنی میں نہیں بلکہ ماننے اور قبول کرنے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اردو میں بھی سننے کا لفظ اس معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس میں "سمعنا" کا لفظ دل کی قبولیت کا اظہار کرتا ہے اور "اطعنا" کا لفظ عملی اطاعت کا۔ اور ایمان و اسلام کی اصل حقیقت یہی ہے۔ اس میں یہود کے "سمعنا و عصینا" پر ایک لطیف تعریض بھی ہے۔

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ' غفرانک فعل محذوف کا مفعول ہے۔ اس طرح کے مواقع میں فعل کا حذف دُعا کرنے والے کے اضطراب کو ظاہر کرتا ہے جو قبولیت دُعا کے لئے ایک نہایت موثر سفارش ہے۔

سمع وطاعت کے اقرار کے بعد معاً دُعا کا زبان پر جاری ہو جانا اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ اقرار ایک عظیم ذمہ داری کا اقرار ہے، یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے، اس میں بڑی بڑی آزمائشیں پیش آتی ہیں اور ہر قدم پہ لغزشوں، کوتاہیوں اور ٹھوکروں کے اندیشے ہیں۔ اس حقیقت کے شعور نے سمعنا و اطعنا کے اقرار کے فوراً بعد طلب مغفرت کی طرف متوجہ کر دیا۔ اس لئے کہ جب راہ بھی کٹھن ہے اور پرسش بھی ہر پوشیدہ اور علانیہ پہ ہونی ہے جیسا کہ اوپر والی آیت میں گزر چکا ہے اور عذاب اور رحمت سب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے تو اس کی مغفرت کے سہارے کے سوا ہر سہارا بے حقیقت ہے۔ وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ میں کامل سپردگی ہے، یعنی تیرے سوا کوئی نہیں ہے جو کسی پہلو سے مرجع و ماویٰ بن سکے۔ اس میں ایک لطیف تعریض یہود و نصاریٰ پر بھی ہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد اور شرکاء و شفعا کے اعتماد پہ سمع و طاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو بیٹھے، لیکن اس امت پہ یہ حقیقت واضح ہے کہ سب کو اللہ ہی کی طرف لوٹنا، اسی کے آگے پیش ہونا اور اسی کے سامنے جواب دہی کرنی ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۲۸۶

لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا) یہ دُعا کے بیچ میں ایک جملہ معترضہ ہے اور مقصود اس کے لانے سے اس اہم حقیقت کا اظہار ہے کہ سمع و طاعت کی یہ ذمہ داری جو اس امت پہ ڈالی گئی ہے ہے تو ایک بھاری ذمہ داری، لیکن اس کے بھاری ہونے کے احساس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ بندوں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں

ڈالنا، ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اُس کو طاقت عطا ہوئی ہے جو چیز اس کے حدود اختیار و امکان سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، شریعت نے خود اپنے احکام و قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور مجبوریوں کی صورت میں اسی پہلو سے بندوں کو رخصتیں دی ہیں۔ اس وجہ سے نہ تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندے اپنے آپ کو کسی تکلیف مالا یطاق میں ڈالیں اور نہ کسی دوسرے ہی کے لئے یہ جائز ہے کہ اُن پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے جس کو وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ حدیثوں میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب لوگوں سے سمع و طاعت کا عہد لیتے تو از خود یاد دہانی کر کے ان سے "تا بحدِ استطاعت" کی شرط لگوا دیتے یہ حضورؐ کی طرف سے اسی آیت کی تعمیل تھی۔ اس میں اہل ایمان کے لئے جو تخفیف اور بشارت ہے وہ بالکل واضح ہے بالخصوص اس موقع پر جب ان پر ایک عظیم شریعت کی ذمہ داریاں ڈالی جا رہی ہیں۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور وہ بھگتے گا جو اس نے کیا) یہ بات چونکہ اسی بات کا ایک پہلو ہے جو اُوپر گزری ہے اس وجہ سے اسی کے ساتھ اس کو جوڑ دیا ہے اس سے الگ نہیں کیا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو نفع یا ضرر جو کچھ بھی پہنچے گا اس کے اپنے عمل ہی سے پہنچے گا، کسی اور شے سے نہیں پہنچے گا۔ جو وہ بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کچھ کرے گا وہی بھرے گا، نہ دوسرے کے نیک اعمال کا کریڈٹ اس کو ملنے والا ہے اور نہ دوسرے کی بدیاں اس کے کھاتے میں پڑنے والی ہیں اور نہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اُٹھانے والا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نفس پر ذمہ داری اس کی طاقت اور اس کے اختیار کے پیمانے سے ناپ کر ڈالی ہے اس وجہ سے ہر شخص کی کامیابی اور ناکامی اس ذمہ داری کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا، اُوپر والا جملہ معترضہ محض اہل ایمان کی تسلی اور ایک مناسب موقع حقیقت کی یاد دہانی کے لئے تھا۔ اب اصل دعا پھر زبان پر جاری ہو گئی۔ اس ٹکڑے میں نسیان اور خطا پر مواخذہ نہ کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ نسیان تو یہ ہے کہ آدمی سمع و طاعت کی ذمہ داری ادا کرتے ہوئے کوئی چیز بھول جائے اور خطا یہ ہے کہ اپنی ناسمجھی سے کسی کام کو غلط طور

پر کاربند رہیں۔ اگرچہ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں لیکن معاف شدہ چیزوں کی معافی کی درخواست بندے کی طرف سے غایت درجہ خشیت کا اظہار ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت وعنایت کے مزید دروازے کھلتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف تھے، پھر بھی آپ استغفار میں زیادہ سے زیادہ مشقت اٹھاتے تھے جب آپ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا، کیا میں یہ نہ چاہوں کہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنوں!

اصر کا مفہوم اور اس سے ملتا کا مفہوم

"رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا"، "اصر" کے اصل معنی عہد اور ذمہ داری کے ہیں مثلاً ءَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي ۸۱۔ آل عمران (کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور ان باتوں کے لئے میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اُٹھائی) یہیں سے اس کا استعمال ان بھاری اور گراں ذمہ داریوں اور بوجھوں کے لئے ہوا جن کا اٹھانا دشوار ہو۔ اسی مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے۔ یہود کی شریعت میں اس قسم کے اصر اور اغلال جن کی تفصیل سورہ اعراف کی تفسیر میں آئے گی، موجود تھے اور خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ اللہ کی شریعت کو ان بوجھل طوق وسلاسل سے آزاد کر کے اسکو فطرت کی اساس پر قائم کریں گے جیسا کہ ارشاد ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۱۵۷ اعراف) (اور ان کے اُوپر سے وہ دور کرے گا وہ بوجھ اور وہ طوق جو ان پر پہلے سے ہیں) یہاں دُعا کے ان الفاظ میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہم پر اس قسم کے بوجھ نہ ڈالے جائیں جس قسم کے بوجھ یہود پر اُن کی سرکشی کی وجہ سے ڈالے گئے اور جن کو بالآخر وہ اُٹھا نہ سکے۔ دُعا کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اس امت کے مزاج اور اس کو ملنے والی شریعت کے مزاج میں کامل موافقت ہے۔

طاقت سے بڑھ کر آزمائش سے بچنے کی دعا

"رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ"، "تحمیل" کے معنی کسی پر کوئی بھاری بوجھ لادنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس سمع و طاعت کی راہ میں آگے جو آزمائشیں پیش آنے والی ہیں اُن میں کوئی آزمائش ایسی نہ ہو جو ہماری برداشت سے زیادہ ہو اور جو ہمیں تیری وفاداری کے امتحان میں ناکام بنا دے۔ جہاں تک ابتلاء و امتحان کا تعلق ہے وہ تو لازمۂ ایمان و اسلام بلکہ لازمۂ حیات ہے جس سے اس دنیا میں مفر نہیں ہے۔ کھرے کھوٹے میں امتیاز اور بندوں کی صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کے

لئے اس سے گزرنا ضروری ہے اس وجہ سے اس سے بچنے کی دُعا صحیح نہیں ہے لیکن یہ دُعا بندے کو کرتے رہنا چاہیئے کہ کوئی امتحان اس کی طاقت سے زیادہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے امتحان کے معاملے میں اپنی کمزوری و ناتوانی کا اعتراف ہی صحیح رویّہ ہے، جو لوگ اپنے اوپر زیادہ اعتماد کر بیٹھتے ہیں وہ اکثر امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ احادیث میں مختلف پہلوؤں سے اس کی ممانعت آئی ہے۔

یہاں اوپر والے ٹکڑے اور اس ٹکڑے کے فرق کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اوپر والے ٹکڑے میں تو اس بات کی دعا ہے کہ ہماری شریعت اس قسم کے اصر و اغلال سے پاک رہے جو پچھلی شریعتوں میں موجود ہیں۔ اور اس دوسرے ٹکڑے میں ان خارج از استطاعت آزمائشوں سے محفوظ رکھے جانے کی دُعا ہے جو اس شریعت کے حقوق ادا کرنے کی راہ میں پیش آ سکتی ہیں۔

وَاعْفُ عَنَّا، وَاغْفِرْ لَنَا، وَارْحَمْنَا :- اس میں اکٹھی تین چیزوں کی درخواست ہے۔ عفو، مغفرت، اور رحم۔ عفو کے معنی چشم پوشی کے بھی ہیں اور معاف کر دینے کے بھی۔ یہاں لفظ دوسرے معنی میں ہے۔ غفر کے معنی ڈھانک دینے کے ہیں، رحم کا مفہوم واضح ہے۔ بندے کا سارا اعتماد بس انہی تین چیزوں پر ہونا چاہیئے۔ رب کریم کوتاہیوں سے درگزر فرمائے، گناہوں کو ڈھانک دے اور اپنی رحمت سے نوازے۔ آخرت کا سارا سہارا بس یہی تین چیزیں ہیں۔

أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ، 'مولیٰ' کے معنی مرجع کے ہیں جس کی طرف مشکلات میں رجوع کیا جائے۔ یہ آخر میں مخالفین اسلام کے مقابل میں مدد و نصرت کی دُعا ہے۔ اس لئے کہ سمع و طاعت کا یہ بارِ گراں امت نے ایسے حالات میں اٹھایا ہے جب کہ دوسرے، جیسا کہ پچھلی تفصیلات سے واضح ہو چکا ہے، اس بار کو نہ صرف اپنے کندھوں سے پھینک چکے تھے بلکہ اس بنا پر مسلمانوں کے جانی دشمن بھی بن گئے تھے کہ انہوں نے ان کے پھینکے ہوئے اس بوجھ کو سنبھال کیوں لیا۔

یہ آخری سطریں ہیں جو اس سورہ کی تفسیر میں لکھنے کی اس گنہگار اور بے مایہ کو توفیق نصیب ہوئی۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ؛

تصحیح نومبر کے شمارۂ میثاق میں صفحہ نمبر ۲۴ سطر نمبر ۱۶ میں من ھو فی الدنیا اعمیٰ کی بجائے ومن کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ کر لیا جائے ؛ (ادارہ)

مقالات

مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی

حدیثوں کی جمع و تدوین میں اُمت کی غیر معمولی جانکاہی اور احتیاط

حدیثوں کے معتبر و مستند ہونے کا ایک بڑا ثبوت وہ سعی و کاوش اور اہتمام بلیغ ہے جو ان کے نقل و روایت میں پیش نظر رہا ہے۔ ذیل میں اس پہلو کی وضاحت کی جاتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے رہنما اور قائد ہیں اور وہ آپ کی اتباع و اطاعت کو عین دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ صحابہ کرام کی زندگی میں آپ کی اطاعت و پیروی سے ایک بہت بڑی تبدیلی واقع ہوگئی تھی اس لئے جب وہ اپنی گذشتہ زندگی کا اس موجودہ زندگی سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھی مقابلہ کرتے تو خدا کا شکر بجا لاتے۔ خدا نے بھی اپنے اس احسان و انعام کا ذکر اس طرح کیا ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۔ (آل عمران ۱۶۴)	اللہ نے مسلمانوں پر احسان کیا جب ان میں ان ہی کے اندر سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا اور اُن کا تزکیہ کرتا اور انہیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے۔ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔

دوسری جگہ فرمایا :-

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ	اور اپنے اوپر اللہ کا احسان یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے پس اللہ نے تمہارے

اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ (آل عمران ۱۰۳)

دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے تھے لیکن اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔

اس لئے وہ کامل ذوق و شوق اور پوری توجہ و کاوش سے دین کو سیکھتے اور رسول کی ہر بات معلوم کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کو عزت و وقار کی زندگی اسی سے ملی ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ دین اس سانچے اور رنگ میں ڈھل اور رنگ جانے کا نام ہے جس میں رسول اللہ ڈھالنا اور رنگنا چاہتے تھے۔

ایک طرف صحابہ کرام کے یہ احساسات کہ دین ہی کی بدولت ان کو ہدایت و سعادت ملی ہے اور آنحضورؐ ان کے مذہبی قائد و رہنما ہیں اس لئے فطری طور پر ان میں آپ کی ہر ہر بات معلوم کرنے کی خواہش تھی۔ دوسری طرف قرآن اور حدیث نے دین سیکھنے کی ترغیب اور احکام و مسائل دین کی تحصیل کو ضروری قرار دیا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:۔

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ۔ (توبہ ۱۲۳)

سارے مسلمانوں کے لئے کوچ کرنا ممکن نہیں تو کیوں نہ ہر فرقہ کا ایک حصہ نکلے تاکہ دین میں سمجھ پیدا کریں اور تاکہ خبر پہنچا دیں اپنی قوم کو جب وہ لوٹ کے آئیں ان کی طرف تاکہ وہ بچتے رہیں۔

اس آیت میں اعراب کو جو مدینہ سے دور دیہاتوں میں رہتے تھے ہدایت دی گئی ہے کہ اگر سارے لوگ دربارِ نبوی میں جاکر دینی بصیرت نہیں حاصل کرسکتے تو ہر طبقہ و جماعت سے کچھ افراد اور لوگوں کو تو ضرور ہی اس کام کے لئے مدینہ جانا چاہئے تاکہ جب وہ وہاں سے واپس ہوں تو اپنی پوری بستی اور جماعت کے لوگوں کو رسول کی باتوں سے واقف کرا دیں۔ یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرامؓ آنحضرتؐ کی موجودگی کو نہایت غنیمت جانتے تھے اور آپ سے سب کچھ جان اور سیکھ لینا چاہتے تھے۔ ہر شخص کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ کی خدمت میں گزارے تاکہ دین کو حاصل کرسکے۔ معاش اور اہل و عیال کی ضرورتیں اگر اس راہ میں رکاوٹ بنتیں تو وہ بقدر استطاعت اس کے لئے قربانی دیتے۔ دو آدمیوں کی باری ہو جاتی کہ ایک دن ایک

آدمی دربار نبوی میں جائے اور دوسرا اپنی روزی کا انتظام کرے اور دوسرے دن دوسرا جائے اور پہلا بال بچوں کے لئے کمائے۔ تاکہ ہر ایک کو وہ ساری باتیں جو آپ کے یہاں ہوتی ہیں معلوم ہو جائیں اور بال بچوں کے گزر بسر کا سامان بھی ہو جائے۔ صحیح بخاری میں حضرت عمرؓ اور ان کے ایک پڑوسی کا ایسا ہی واقعہ مذکور ہے۔

یہ تو دین و شریعت معلوم کرنے میں ان کے جوش و سرگرمی کا حال تھا۔ لیکن وہ جس سرگرمی سے دین سیکھتے تھے اسی مستعدی سے دوسروں کو سکھاتے اور بتاتے بھی تھے۔ اور اسے اپنا فریضۂ مذہبی سمجھتے تھے۔

احادیث میں بھی علم دین کی نشر و اشاعت کی تلقین کی گئی ہے۔ فرمایا:-

نضر الله امرءا سمع منا شيئا فبلغه كما سمعه فرب مبلغ اوعى من سامع	اللہ اس شخص کو شاداب کرے جس نے ہم سے کوئی چیز سنی اور اسے ویسے ہی دوسروں تک پہنچا دیا جیسے اس نے سنی تھی۔ بعض لوگ جن تک کوئی بات پہنچائی جاتی ہے وہ سننے والے سے زیادہ محفوظ رکھتے ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے بار بار تاکید فرمایا کہ جو باتیں میں تم کو بتلا رہا ہوں وہ دوسرے لوگوں کو بھی ذمہ داری کے ساتھ بتا دینا۔

فليبلغ الشاهد الغائب	موجود غیر موجود تک (میرے احکام) پہنچا دے۔

ان احکام و تعلیمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صحابہ کرامؓ جو کچھ جانتے تھے اسے دوسروں تک پہنچاتے تھے اور یہی ذوق و جذبہ ان کے بعد تابعین، تبع تابعین اور آئندہ نسلوں میں منتقل ہوتا رہا۔

یہ ذوق و جذبہ اسقدر بڑھا ہوا تھا کہ اگر کوئی بزرگ کسی روایت کے متعلق یہ سن لیتے کہ وہ فلاں مقام پر فلاں بزرگ سے معلوم ہو سکتی ہے تو وہ سخت مشقت جھیل کر سفر کرتے اور اُسے معلوم کر کے ہی چین لیتے۔ مسلمانوں نے اس سلسلہ میں اس قدر غیر معمولی جد و جہد کی ہے کہ آنحضورؐ کی سیرتِ مبارکہ اور حیاتِ طیبہ کا کوئی گوشہ اور پہلو مخفی نہ رہنے دیا۔ اس سلسلے میں ان کو بڑی آسانی اس سبب سے رہی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ لوگوں کے ساتھ رہتے تھے۔ ان ہی کے

ساتھ آپ کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب کچھ ہوتا تھا۔ لوگ آپ کی خلوت وجلوت ہر ایک میں شریک ہوتے تھے۔ آپ کی حیثیت بادشاہوں اور بڑے آدمیوں جیسی نہ تھی جو اپنے کو بالکل الگ تھلگ رکھتے ہیں اور جنہیں لوگوں سے ملنا جلنا بھی گوارا نہیں ہوتا۔ بلکہ آپ سب کو اللہ کا پیغام بتاتے اور سکھاتے تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ کوئی بیمار ہوتا تو اس کے گھر جاکر عیادت کرتے، جنازوں میں شریک ہوتے اور ہر شخص کے معاملات اور جھگڑوں کا تصفیہ کرتے۔ اس طرح آپ کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جسے ہر شخص پڑھتا اور دیکھتا تھا اور بقدر حوصلہ ظرف اس سے استفادہ کرتا تھا۔

اس سلسلہ میں ایک خاص قابل لحاظ بات یہ بھی ہے کہ عربوں کا حافظہ نہایت قوی تھا اس لئے وہ جو بات بھی سنتے تھے یا دیکھتے تھے اسے محفوظ کر لیتے تھے۔ سینکڑوں طویل قصائد اور ہزاروں اشعار ان کی زبان پر رہتے تھے قدیم وقائع وایام کے متعلق ان کے سینوں میں جو کچھ از بر اور محفوظ تھا بمشکل سفینوں میں وہ محفوظ رہ سکتا تھا۔ اپنا، اپنے قبیلہ کا اور دوسروں کے پشتہا پشت بلکہ اصیل گھوڑوں تک کے نسب نامے ان کے حافظہ میں ہوتے تھے۔ اور فطرت کا یہ عام قاعدہ ہے کہ جس قوت سے جس درجہ زیادہ کام لیا جائے اسے اسی قدر زیادہ ترقی ہوتی ہے اور جب ان کے حافظہ کا یہ عالم رہا ہو تو پھر نبیؐ کے اشغال واعمال جنہیں وہ اپنا دین وایمان اور جن کی تحصیل کو وہ دین و دنیا دونوں کی سعادت وبرکت کا ذریعہ سمجھتے تھے کیوں نہ پوری مستعدی اور ذمہ داری سے محفوظ کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثیں محفوظ اور اس درجہ مستند شکل میں آج موجود ہیں۔

اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ صحابہؓ کے حافظہ نے وہ کام کیا جو تحریری یادداشتیں بھی نہیں کر سکتی تھیں، آنحضورؐ نے ابتداء میں حدیثوں کی تحریر وکتابت سے جو منع کیا تھا اسکی وجہ علاوہ قرآن میں التباس واختلاط کے یہ بھی تھی کہ یہ چیز ان کی ذہانت اور حافظہ پر اثر انداز ہوتی تاہم یہ ممانعت آخر میں ختم ہوگئی تھی اور بعض صحابہ نے آپ کے احکام وہدایات نقل بھی کر لئے تھے کیونکہ انہیں اپنی یادداشت پر زیادہ اعتماد نہ تھا۔

ان وجوہ واسباب کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ حدیثوں کی نشر واشاعت میں صحابہؓ نے پورے

شوق، دلچسپی اور توجہ سے حصہ لیا اور ان کے حافظہ نے اس شوق کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ اس درجہ کامل انہاک و اشتغال کے بعد یہ ناممکن ہے کہ آنحضورؐ کے اعمال و اشغال کا معتد بہ حصہ محفوظ ہونے سے رہ گیا ہو۔

ایک طرف اگر اس درجہ جوش و ولولہ تھا کہ رسول اللہؐ کی کوئی بات مخفی نہ رہ جائے اور جو کچھ بھی آپ نے فرمایا ہے اسے جان لیا جائے اور دوسروں کو بھی بتا دیا جائے۔ تو دوسری طرف ہوش سے بھی کام لیا گیا یعنی یہ بات ہمیشہ مدنظر رکھی گئی کہ جو کچھ بھی آپ سے بیان کیا جائے وہ پورے وثوق و احتیاط اور کامل اطمینان کے بعد ہی بیان کیا جائے۔ صحابہ جوش عقیدت میں سرشار ضرور تھے لیکن اس جوش نے غلط و صحیح میں امتیاز کی قوت و صلاحیت کو ختم نہیں کر دیا تھا کہ غلط سلط سب کچھ وہ نقل و بیان کر دیتے۔ اس احتیاط کا اندازہ درج ذیل باتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

قرآن و حدیث نے جس طرح کتمان علم کی مذمت کی ہے۔ اسی طرح روایت حدیث میں تحقیق و تفتیش اور چھان پھٹک کو بھی ضروری قرار دیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (حجرات ۵) — مسلمانو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کر لو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مختلف مواقع پہ اس سلسلہ میں نہایت ضروری ہدایات دیں۔ اس قسم کی چند روایتیں مسلم شریف کے مقدمہ سے نقل کی جاتی ہیں۔

حضرت ابوہریرۃ جو مخالفین حدیث کے طبقہ میں کثرت روایت کی وجہ سے خاص طور پر مطعون ہیں فرماتے ہیں کہ رسول اللہ کا ارشاد ہے:۔

من كذب علىّ متعمداً فليتبوأ مقعده من النار۔ — جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ گھڑا تو اسے چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا جہنم کو بنائے!

انہی سے ایک اور روایت ہے کہ آنحضورؐ نے فرمایا:۔

كفى بالمرء كذبا ان يحدث بكل ما سمع۔ — آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ جو کچھ بھی سنے اسے وہ (بے تحقیق) بیان کرنے لگے۔

حضرت علیؓ اپنے خطبوں میں کہا کرتے تھے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے :-

لاتکذبوا علیّ فانہ من یکذب علیّ یلج النار۔	مجھ پر جھوٹ مت گھڑو کیونکہ جو مجھ پر جھوٹ گھڑے گا وہ جہنم میں داخل ہوگا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ :-

من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین۔	جس نے میری طرف سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جسے وہ جھوٹ سمجھ رہا ہے تو ایسا شخص بھی جھوٹوں میں سے ایک ہے۔

غور فرمایئے کہ صحابہ کرام جن کا مقصدِ زندگی ہی آنحضرت صلعم کے اقوال و اعمال اور طرز و ادا کی تقلید رہا ہو اور جنہوں نے پورے ذوق و شوق اور مستعدی سے آپ کے اقوال و اعمال اس لئے سیکھے اور سکھائے ہوں کہ آپ کے سانچے میں خود ڈھلیں اور دوسروں کو ڈھال دیں، کیا یہ غلط سلط روایتیں بیان کرسکتے تھے۔ غلط سلط روایتیں بیان کرنا یوں ہی کیا کم قابل مذمّت فعل ہے لیکن جب معاملہ دین کا ہو۔ اور غلط سلط روایتیں بیان کرنے پر ایسی سخت اور شدید وعیدیں بھی ہوں تو اس کا کوئی ادنیٰ سا احتمال بھی کہاں رہ جاتا ہے۔

اب صحابہؓ کی احتیاط پسندی کی مختصر کیفیت بیان کیجاتی ہے۔

بعض صحابہؓ کے طرزِ عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تکثیر روایت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کا یہ سبب ہرگز نہ تھا کہ وہ حدیثوں کو معتبر نہیں خیال کرتے تھے بلکہ اس لئے کہ آپؐ کی جانب کوئی غلط بات نہ منسوب ہو جائے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ جو کثیر الروایت ہیں، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسقدر آزادی سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک دنیا میں رہے ان کے سامنے متعدد واقعات پیش آتے رہے، ان کا خود بیان ہے کہ اگر قرآن مجید میں دو آیتیں اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا الی قولہ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ، نہ ہوتیں تو میں ایک حدیث بھی بیان نہ کرتا۔ ہمارے مہاجر بھائی بازاروں میں اپنی روزی روزگار میں لگے رہتے تھے اور انصار اپنی کھیتیوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے تھے اور میں برابر خدمت نبوی میں

حاضر اور آپ کے ارشادات سنتا رہتا تھا"

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اپنے والد حضرت زبیرؓ سے عرض کرتے ہیں کہ آپ فلاں فلاں بزرگوں کی طرح روایتیں کیوں نہیں بیان کرتے؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ مجھے آپؐ کی صحبت میں رہنے کا ضرور موقعہ ملا ہے، لیکن میں نے آپ سے سنا ہے:۔ من کذب علیّ فلیتبوأ مقعدہ من النار۔

حضرت زید بن ارقمؓ سے حدیثیں بیان کرنے کے لئے کہا گیا تو ارشاد فرمایا کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں اور ہمارا حافظہ کمزور ہو گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرنے کا معاملہ نہایت اہم ہے۔

سائب بن زید فرماتے ہیں کہ میں سعد بن مالک کے ساتھ مدینہ سے مکہ گیا لیکن میں نے ان سے کوئی حدیث نہ سنی۔

شعبی کا بیان ہے کہ میں ایک برس تک حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں رہا لیکن ان کو آنحضرتؐ کی طرف کوئی بات منسوب کر کے بیان کرتے ہوئے نہ سنا۔

حضرت انس بن مالکؓ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات بیان کرتے تو اس خوف سے کہ آپؐ کی جانب کوئی غلط بات منسوب ہو جائے او کما قال بھی کہہ دیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آنحضورؐ کے متعلق جب کوئی بات بیان کرتے تھے تو کانپ اٹھتے اور لرز جاتے تھے اور یہ کہتے کہ یہ یا اسی طرح کی بات آپ نے بیان کی ہے۔

حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی احتیاط پسندی تو مشہور ہی ہے وہ بسا اوقات ایک شخص سے کوئی روایت سنتے تھے تو مزید اطمینان کے لئے کسی اور شخص کو بھی ثبوت وشہادت کے لئے طلب کرتے تاکہ وہ بھی اس روایت کی تائید کر دے۔

حضرت علیؓ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ روایت بیان کرنے والے سے قسم لے کر اطمینان حاصل کرتے تھے۔

جرح و تعدیل کا اصطلاحی فن گو محدثین کی ایجاد ہے لیکن عہد صحابہؓ ہی میں اس کی بنیاد

پڑھ چکی تھی اور وہ باقاعدہ روایتوں اور راویوں پر نقد کرتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

حضرت عائشہ رضؓ سے جب رؤیتِ الٰہی کے متعلق روایتیں بیان کی گئیں تو انہیں ان کے قبول میں تامل ہوا۔ اور قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کی:۔ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اس روایت کو کہ "مردہ پر اگر نوحہ کیا جائے تو اسے قبر میں عذاب ہوتا ہے؟" یہ کہکر رد فرمایا کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ" من حمل جنازة فليتوضأ" جس نے جنازہ اٹھایا اسے وضو کرلینا چاہیئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ خشک لکڑیوں کے چھونے یا اٹھانے سے وضو لازمی نہیں ہے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے حضرت ابن عباس سے یہ حدیث بیان کی کہ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ آگ سے پکی چیز کھانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔" حضرت ابن عباس نے کہا" تب تو گرم پانی کے استعمال سے بھی وضو لازمی ہے" حضرت ابوہریرہؓ نے کہا" بھتیجے جب تم آنحضورؐ کی کوئی حدیث سنو تو کہاوتیں نہ کہا کرو!"

ام المومنین حضرت عائشہؓ تو راویوں کے حفظ و ضبط کا امتحان بھی لیتی رہتی تھیں چنانچہ اپنے بھتیجے حضرت عروہ بن زبیر سے ایک مرتبہ کہا کہ ہمارے اس سفر حج میں عبداللہ بن عمرؓ بھی شریک ہیں۔ ان کے پاس علم حدیث کا وسیع ذخیرہ ہے اس لئے ان کی ملاقات کرکے کچھ روایتیں سنو! چنانچہ انہوں نے ایسا کیا اور منجملہ متعدد روایات کے انہوں نے عبداللہ بن عمر سے یہ حدیث بھی سنی کہ:۔ ان الله لا ينزع العلم من الناس انتزاعا ولكن يقبض العلماء فيرفع العلم معهم ويبقى فى الناس رؤس جهال يفتونهم بغير علم فيضلون ويُضلون" حضرت عروہؒ نے جب اس روایت کا ام المومنین سے ذکر کیا تو انہوں نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے کہا کیا انہوں نے تم سے ایسے بیان کیا اور یہ کہا ہے کہ انہوں نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، عروہ نے اثبات میں جواب دیا۔ دوسرے سال پھر حج کے موقع پر حضرت عائشہؓ نے عروہ سے کہا ابن عمر کے پاس جاکر پھر علم والی روایت

معلوم کرو۔ چنانچہ حضرت ابن عمر نے اسے بعینہٖ اسی طرح بیان کیا۔ جس طرح گذشتہ سال بیان کیا تھا۔ تو ام المومنین نے فرمایا کہ بیشک ابن عمر صحیح بیان کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے روایت میں کوئی کمی بیشی نہیں کی ہے۔

صحابہ کرام کے زمانہ سے یہ احتیاط بھی چلی آرہی ہے کہ جن روایتوں کے عام لوگ متحمل نہ ہو سکیں اور وہ ان کی فہم سے بالاتر ہوں انہیں نہ بیان کیا جائے۔ اس سلسلہ میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ایک مشہور واقعہ ہے جس کو امام بخاریؒ نے کتاب العلم میں نقل کیا ہے۔ حضرت بن جبلؓ سے آنحضرتؐ نے فرمایا کہ صدق قلب سے اگر کسی نے لاالٰہ الا اللہ کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو حرام قرار دے گا۔ حضرت معاذ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں یہ بشارت لوگوں کو بھی سنا دوں۔ آپ نے فرمایا "نہیں! ایسا نہ کرو ورنہ لوگ اسی پر اکتفا کر لیں گے" حضرت معاذ نے اپنی وفات کے وقت یہ روایت اس لئے بیان کی کہ وہ کتمان علم کے گناہ کے مرتکب نہ ہوں۔

اسی طرح کی ایک روایت امام مسلم نے کتاب الایمان میں نقل کی ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے جب آنحضورؐ سے یہ بشارت سنی کہ من قال لا الٰہ الا اللہ صادقا من قلبہ دخل الجنۃ تو اس کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے سنا تو انہیں زدوکوب کیا اور آنحضرتؐ کے پاس تشریف لائے اور عرض کیا کہ کیا آپ نے ابو ہریرہؓ سے اس طرح کی بات کہی ہے؟ آپؐ نے جواب دیا ہاں! حضرت عمرؓ نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ لوگ اسی پر تکیہ کر لیں اور عمل سے باز آ جائیں، انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیجئے کہ وہ عمل کرتے رہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم کسی جماعت سے اگر ایسی بات کی روایت کرو گے جو اس کی عقل و فہم سے ماوراً اور بالاتر ہو تو وہ اس کے لئے باعث فتنہ ہوگی۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول کریمؐ سے دو طرح کی باتیں سیکھی ہیں ایک طرح کی باتیں تو میں نے لوگوں سے بیان کر دیں۔ لیکن اگر دوسری قسم کی باتیں بھی ان سے بیان کر دوں تو یہ گردن کٹ جائے گی۔

اس قسم کی روایتیں بیان کرنے میں متعدد مقصد سے ہو سکتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ چونکہ اس نوعیت کی احادیث لوگوں کی فہم سے بالاتر ہوتی ہیں اس لئے

وہ راوی ہی کو جھوٹا سمجھنے لگتے ہیں جس سے ثقہ وضابط لوگوں کی ثقاہت وضبط پر اثر پڑتا ہے اسی لئے ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے بیان بھی کر دے۔

دوسرے ان روایتوں کا کچھ سے کچھ مطلب نکال کر لوگ احکام شرع کے تارک و مخالف ہو جائیں گے۔

تیسرے لوگوں کو دین کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوں گے اور وہ خُدا اور رسول کی تکذیب و تردید پر آمادہ ہوں گے اسی لئے حضرت علیؓ اور عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ۔

حدثوا الناس بما یعرفون اتریدون ان یکذب اللہ و رسولہ	لوگوں کو وہی باتیں بیان کرو جن کو وہ جانتے ہوں (جو ان کی فہم سے ماوراء اور جو ان کے نزدیک مستبعد نہ ہو) کیا تم پسند کرتے ہو کہ (لوگوں کی عقل سے بالاتر روایتیں بیان کی وجہ سے) خُدا اور رسول کی تکذیب کی جائے۔

غرضیکہ صحابہ کرام نے احادیث کے نقل و روایت میں نہ تو کسی طرح کی کوئی کوتاہی کی اور نہ ان کی صحت کی چھان بین اور احتیاط میں کوئی دقیقہ فروگذاشت رکھا۔

ان کے بعد تابعین، تبع تابعین، فقہاء، محدثین اور علمائے اسلام نے بھی روایات کے نقل کرنے میں اسی طرح سعی و کاوش اور تحقیق واحتیاط سے کام لیا ہے اور یہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے حدیثوں کے ضبط و روایت میں جس قدر تحقیق و کاوش، چھان بین اور احتیاط سے کام لیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ سید سلیمان ندوی مرحوم فرماتے ہیں:-

"اس باب میں تمام دنیا متفق ہے کہ اس حیثیت سے اسلام نے اپنے پیغمبر کی اور نہ صرف پیغمبر کی بلکہ ہر اس چیز کی اور اس شخص کی جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی حضرت کی ذات مبارک سے تھا جس طرح حفاظت کی ہے وہ عالم کے لئے مایہ حیرت ہے ان لوگوں کو جو آنحضرت صلعم کے اقوال، افعال، اور متعلقات زندگی کی روایت، تحریر اور تدوین کا فرض انجام دیتے تھے، راویان حدیث، روایت یا محدثین اور ارباب سیر کہتے

ہیں جن میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور بعد کے چوتھی صدی ہجری تک کے اشخاص داخل ہیں۔ جب تمام سرمایۂ روایت تحریری صورت میں آ گیا تو ان تمام راویوں کے نام و نشان تاریخ زندگی، اخلاق و عادات کو بھی قید تحریر میں لایا گیا جن کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعۂ اقوال کا نام اسماء الرجال ہے۔"

(خطبات مدراس طبع سوم ص ۳۴)

علامہ شبلیؒ دوسری قوموں اور مسلمانوں کے اصول سیرت اور تحریر واقعات کا فرق بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"اس قسم (زبانی روایتوں کے قلمبند کرنے) کا موقع جب دوسری قوموں کو پیش آتا ہے یعنی کسی زمانہ کے حالات مدت کے بعد قلمبند کئے جاتے ہیں تو یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر قسم کی بازاری افواہیں قلمبند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا۔ ان افواہوں میں سے وہ واقعات انتخاب کر لئے جاتے ہیں جو قرائن اور قیاسات کے مطابق ہوتے ہیں، تھوڑی دیر کے بعد یہی خرافات ایک دلچسپ تاریخی کتاب بن جاتے ہیں۔ یورپ کی تاریخی تصنیفات اسی اصول پر لکھی گئی ہیں۔

لیکن مسلمانوں نے اس فن سیرت کا جو معیار قائم کیا وہ اس سے بہت زیادہ بلند تھا، اس کا پہلا اصول یہ تھا کہ جو واقعہ بیان کیا جائے اس شخص کی زبان سے بیان کیا جائے جو خود شریک واقعہ تھا اور اگر خود نہ تھا تو شریک واقعہ تک تمام راویوں کا نام بترتیب بتایا جائے، اس کے ساتھ یہ بھی تحقیق کیا جائے کہ جو اشخاص سلسلۂ روایت میں آئے کون لوگ تھے، کیسے تھے؟ ان کے کیا مشاغل تھے؟ چال چلن کیسا تھا؟ حافظہ کیسا تھا؟ سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ تھے یا غیر ثقہ؟ سطحی الذہن تھے یا دقیقہ بین؟ عالم تھے یا جاہل؟ ان جزئی باتوں کا پتہ لگانا سخت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن تھا۔ سینکڑوں ہزاروں محدثین نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کر دیں۔ ایک ایک شہر میں گئے، راویوں سے ملے، ان کے متعلق ہر قسم کی معلومات بہم پہنچائیں۔ جو لوگ ان کے زمانہ میں موجود نہ تھے ان کے دیکھنے والوں سے حالات دریافت کئے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ سے اسماء الرجال (بیوگرافی) کا

وہ عظیم الشان فن تیار ہو گیا، جس کی بدولت آج کم از کم لاکھ شخصوں کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔
محدثین نے حالات کے بہم پہنچانے میں کسی شخص کے رتبہ اور حیثیت کی پروا نہ کی۔
بادشاہوں سے لے کر بڑے بڑے مقتداؤں تک کی اخلاقی سراغ رسانیاں کیں اور ایک
ایک کی پردہ دری کی۔" (سیرت النبی جلد اول صفحہ ۳۸، ۳۹ طبع چہارم)

پھر یہی نہیں کہ صرف راویان حدیث کے متعلق اس قدر چھان بین کی گئی بلکہ نفس روایت کی تحقیق و صحت کے لئے بھی جس حد تک احتیاط و تحقیق ممکن تھی وہ سب کی گئی مثلاً روایت کے متن کو پرکھا گیا۔ اس کے متعلق صحیح، حسن، ضعیف، متصل، مرسل، مرفوع، منقطع، منفصل، مقلوب، مشہور، غریب، متواتر، آحاد، افراد، معروف، شاذ، منکر، معلل، موضوع، مدرج، ناسخ، منسوخ، خاص، عام، مجمل، مبین، اور دوسرے مختلف و متعدد انواع کی معلومات حاصل کی گئیں۔ اور یہی سب امور علم حدیث کا اصل موضوع ہیں۔ علامہ نووی فرماتے ہیں:۔

ان المراد من علم الحدیث تحقیق معانی المتون و تحقیق علم الاسناد و العلل۔ والعلۃ عبارۃ عن معنی فی الحدیث خفی یقتضی ضعف الحدیث مع ان ظاھرہ السلامۃ منھا وتکون العلۃ تارۃ فی المتن وتارۃ فی الاسناد ولیس المراد من ھذا العلم مجرد السماع ولا الاسماع ولا الکتابۃ بل الاعتناء بتحقیقہ و البحث عن خفی معانی المتون والاسانید و الفکر فی ذالک و دوام الاعتناء بہ ومراجعۃ اھل المعرفۃ بہ ومطالعۃ کتب اھل التحقیق فیہ وتقیید ماحصل من نفائسہ وغیرھا فیحفظھا الطالب بقلبہ و یقیدھا

علم حدیث کا مقصد معانی متون، علم اسناد اور علل کی تحقیق ہے۔ حدیث کے اندر علت اس معنی خفی کو کہتے ہیں جو اس کے ضعف کی متقاضی ہو لیکن بظاہر حدیث اس عیب سے پاک معلوم ہوتی ہو۔ یہ علت کبھی متن میں اور کبھی اسناد کے اندر ہوتی ہے۔ علم حدیث کا مقصد محض سننا سنانا اور کتابت نہیں بلکہ تحقیق حدیث میں اعتنا، متون و اسانید میں بحث و تفتیش، اس میں غور و فکر اور ہمیشہ اس کی جانب توجہ و انہماک اور اس فن کے واقفکاروں سے مراجعت، ماہرین و محققین فن کی کتابوں کے مطالعہ اور اس کا عمدہ انتخاب کرنا وغیرہ سب علم حدیث کے مقصود میں داخل ہے تاکہ طالب حدیث اسے

بالکتابتہ ثم یدیم مطالعتہا کتبہ ویتحری التحقیق فیما یکتبہ ویتثبت فیہ فانہ فیما بعد ذلک یصیر معتمدا علیہ ویذاکر بمحفوظاتہ من ذلک من یشتغل بہذا الفن سواء کان مثلہ فی المرتبۃ او فوقہ او تحتہ فان بالمذاکرۃ یثبت المحفوظ ویتحرر ویتاکد ویتقرر ویزداد بحسب کثرۃ المذاکرۃ ومذاکرۃ حاذق فی الفن ساعۃ انفع من المطالعۃ والحفظ ساعات بل ایاما ولیکن فی مذاکراتہ متحریا الانصاف قاصدا الاستفادۃ او الافادۃ غیر مترفع علی صاحبہ بقلبہ ولا بکلامہ ولا بغیر ذلک من حالہ مخاطبا لہ بالعبارۃ الجمیلۃ اللینۃ فبہذا ینمو علمہ وتزکو محفوظاتہ واللہ اعلم

(شرح نووی برحاشیہ مسلم)
جلد اوّل صفحہ ۴۷ و ۴۸
مطبع مصریہ ازہریہ ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۹ء

یاد کرے اور قید تحریر میں لائے نیز جو کچھ اس نے لکھا ہے اس کا بار بار مطالعہ اور اس میں غور و فکر اور تحقیق و جستجو کرنا کیونکہ اس کے بعد وہ خود معتمد و مرجع بنے گا۔ طالب حدیث کا یہ بھی کام ہے کہ اس فن میں اشتغال رکھنے والوں سے اپنے محفوظات کے متعلق مذاکرہ کرے خواہ اس طرح کے لوگ اس کے ہمسر ہوں یا بلند تر اور کمتر ہوں کیونکہ مذاکرہ سے اس کی یاد کی ہوئی چیز اور زیادہ ثابت و پختہ ہوگی اور کثرت مذاکرہ سے اس کے علم میں خود بھی اضافہ ہوگا اور کسی حاذق و ماہر سے ایک گھنٹہ کا مذاکرہ کئی گھنٹوں بلکہ کئی دنوں کے مطالعہ و حفظ سے زیادہ مفید ہے، لیکن مذاکرہ میں انصاف، استفادہ یا افادہ کا قصد ہونا چاہیئے اور افادہ کی صورت میں جس سے مذاکرہ کیا جائے اس پر اپنی برتری اور ترفع کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے نہ دل سے نہ بات سے اور نہ کسی اور ادا سے بلکہ نہایت نرم و خوبصورت انداز میں گفتگو کرنی چاہیئے اس طرح سے اس کے علم میں اضافہ اور یادداشتوں میں زیادتی ہوگی۔

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ بھی اس کے متعلق نہایت اہم اور قابل غور حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:-

واعلم وفقک اللہ تعالیٰ ان الواجب

جس شخص کو صحیح و سقیم روایات اور ثقہ و متہم

على كل احد عرف التمييز بين
صحيح الروايات وسقيمها وثقات
الناقلين لها من المتهمين ان لا
يروي منها الا ما عرف صحة مخارجه
والستارة في ناقليه وان يتقي منها
ماكان منها عن اهل التهم والمعاندين
من اهل البدع والدليل على ان الذي
قلنا من هذا هو اللازم دون ما خالفه
قول الله جل ذكره (يا ايها الذين آمنوا
ان جاءكم فاسق بنباء فتبينوا ان تصيبوا
قوماً بجهالة فتصبحوا على ما فعلتم نادمين)
وقال جل ثناؤه (ممن ترضون من الشهداء)
وقال عز وجل (واشهدوا ذوي عدل
منكم) فدل بما ذكرنا من هذه الآي ان
خبر الفاسق ساقط غير مقبول وان
شهادة غير العدل مردودة والخبر
وان فارق معناه معنى الشهادة في
بعض الوجوه فقد يجتمعان في اعظم
معانيهما اذ كان خبر الفاسق غير
مقبول عند اهل العلم كما ان
شهادته مردودة عند جميعهم
ودلت السنة على نفي رواية المنكر
من الاخبار كنحو دلالة القرآن على

راویوں کی تمیز اور پرکھ ہو اس کے لئے ضروری
ہے کہ وہ صرف ایسی روایتیں بیان کرے جن
کے صحت مخارج اور ناقلین کی ثقاہت کے
متعلق اسے واقفیت ہو۔ اور ان روایتوں
کے نقل و بیان سے احتراز کرنا چاہیئے جو متہم اور
اہل بدع معاندین سے مروی ہوں۔ اس بات
کے لازمی اور ضروری ہونے کی دلیل اللہ تعالیٰ
کا ارشاد یا ایھا الذین آمنوا ان جاءکم
فاسق بنباء فتبینوا ان تصیبوا قوماً بجہالۃ
فتصبحوا علی ما فعلتم نادمین (اے ایمان
والو اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو
تم اچھی طرح تحقیق کر لو ورنہ کہیں نادانی سے
کسی قوم پر جا پڑو اور پھر اپنے کئے پر پچھتانے
لگو) نیز خدا نے فرمایا "ممن ترضون من
الشہداء" (ان لوگوں میں سے جن کو پسند
کرتے ہو گواہوں میں) اور یہ بھی فرمایا کہ
"واشہدوا ذوی عدل منکم (اور
گواہ بناؤ اپنے اندر سے دو معتبر شخصوں کو)
ان آیتوں سے ثابت ہو گیا کہ فاسق کی خبر ساقط
اور غیر مقبول ہے اور غیر عادل شخص کی شہادت
مردود ہے، شہادت اور خبر کے مفہوم میں گو
بعض اعتبار سے فرق ضرور ہے لیکن اہم اور
عظیم مفہوم میں دونوں یکساں ہیں اس لئے کہ

علی نفی خبر الفاسق	جس طرح فاسق کی خبر تمام اہل علم کے نزدیک غیر مقبول ہوتی
وھو الاثر المشھور	ہے اسی طرح اس کی شہادت بھی سب کے نزدیک قابلِ رد ہے
عن رسول اللہ صلی اللہ	اور حدیث و سنت سے منکر روایت کا عدم قبول ونفی اسی
علیہ وسلم (من حدث	طرح ثابت ہے جس طرح قرآن مجید سے خبر فاسق کا عدم قبول
عنی بحدیث یری انہ	ثابت ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور روایت ہے کہ
کذب فھو احد الکاذبین)	من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین (جس
(مقدمہ صحیح مسلم مع شرح نووی	نے مجھ سے کوئی ایسی حدیث بیان کی جس کو وہ جانتا تھا کہ یہ غلط اور جھوٹی
صفحہ ۱۹ و ۲۲ مطبع مصریہ ازہر ۱۳۴۷ھ ۱۹۲۹ء	ہے تو وہ بھی ایک جھوٹا ہوا)

احادیث کے متعلق اس درجہ احتیاط سے کام لیا گیا کہ محدثین نے کتب حدیث کے جو مجموعے مرتب و مدون کئے اور جو اس زمانہ میں متداول ہیں وہ بار بار کی حک و اصلاح اور انتخاب کا نتیجہ ہیں، امام احمدؒ اپنی مسند کے متعلق فرماتے ہیں :-

ھذا الکتاب جمعتہ وانتقیتہ من اکثر من سبعمائۃ	یہ مجموعہ میں نے سات لاکھ پچاس ہزار
الف حدیث وخمسین الفا (الحدیث والمحدثون ص۲۷۱)	حدیثوں سے منتخب کیا ہے۔

امام بخاری کی صحیح میں مکررات کو شامل کر کے سات ہزار سے کچھ زیادہ حدیثیں ہیں لیکن علماء کا بیان ہے :-

انہ اختارھا وصحت عندہ من	اس کو انہوں نے ۶ لاکھ حدیثوں سے منتخب
ستمائۃ الف حدیث کانت متداولۃ	کیا جو خود ان کے نزدیک صحیح اور اس زمانہ میں
فی عصرہ (فجر الاسلام ص۲۵۳)	متداول تھیں۔

امام ابوداؤد نے ۵ لاکھ حدیثوں سے صرف ۴ ہزار اٹھ سو منتخب حدیثیں اپنی سنن میں شامل کیں۔

امام نسائی نے پہلے سنن کبریٰ مرتب کی تھی لیکن پھر اس میں انتخاب سے کام لے کر سنن صغریٰ الموسوم بہ المجتبیٰ مرتب کی۔

امام ترمذی نے اپنی جامع کے متعلق جب پورا اطمینان کرلیا اور عام علماء نے اس کی توثیق و تحسین کردی تب اسے منظر علم پر لائے۔

عرضت هذا الكتاب على علماء الحجاز والعراق وخراسان فرضوا به واستحسنوه۔ (الحطہ ص۱۲۰)	میں نے اس کتاب کو حجاز، عراق اور خراسان کے علما کے سامنے پیش کیا اور انہوں نے اس پر رضامندی اور پسندیدگی کا اظہار کیا۔

یہی حال حدیث کی دوسری کتابوں کا بھی ہے۔ اس موقع پر یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ ائمہ فن نے جن حدیثوں کو نظر انداز کردیا اور انہیں اپنی کتابوں میں شامل نہیں کیا وہ سب غلط نہ تھیں بلکہ ان کے خاص معیار و اصول اور سخت شرائط پر وہ پوری نہیں اترتی تھیں۔

اس تفصیل سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ حدیثوں کی روایت اور تحریر میں جس طرح جوش وخروش اور غیر معمولی سرگرمیوں سے کام لیا گیا اور اس کی کوشش کی گئی کہ آنحضرت صلعم کی ہر حدیث ضبط تحریر میں آجائے اور آپ کا کوئی فعل و عمل عام نگاہوں سے مستور نہ رہ جائے۔ اسی طرح ان کے نقل و بیان میں مکمل ہوش و احتیاط کو بھی پیش نظر رکھا گیا اور اس بات کی سعی و کاوش میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب کوئی غلط سلط اور جھوٹی بات منسوب نہ ہو جائے۔

کیا اس قدر سعی و کاوش اور انتہائی احتیاط و ضبط کے بعد بھی حدیثوں کو ناقابل تسلیم و حجت اور غیر مستند کہنے کے لئے کوئی گنجائش اور وجہ جواز باقی رہجاتی ہے۔

یہ بات اگر کہی جائے تو کچھ قرین قیاس بھی ہے کہ یہ تمام کاوش و احتیاط انسان کی ہے اور انسانی کاوش و احتیاط میں غلطیوں کا امکان ہوتا ہے، لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس امکان کی بھی تو ایک حد ہوگی۔ ایسا تو ناممکن ہے کہ ساری کاوشیں لاحاصل اور تمام کوششیں ہی بے سود ہوں۔ اور جملہ احتیاط کے بعد بھی سارا ذخیرۂ احادیث باطل اور دفتر بے معنی ہی رہے۔

غالباً اسی امکان کی بناء پر علماء نے اخبار آحاد کو، حسب علم و یقین کہنے میں تامل اور احتراز کیا ہے۔ اور اسی بناء پر نقلی حیثیت سے متعدد حدیثوں کی قطعیت اور صحت پر خود محدثین و فقہا

کے زمانے میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ اور عقلی پہلو سے بھی بعض احادیث پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کو بھی احادیث کی صحت کا معیار قرار دیا گیا ہے اور جو حدیثیں اس کے مخالف نظر آئی ہیں ان کو خود صحابہ نے بھی ناقابل تسلیم قرار دیا ہے لیکن بایں ہمہ اصولی حیثیت سے ان سب نے تسلیم کیا ہے کہ حدیث ایک حجت شرعی اور اس کا ایک معتدبہ حصہ عقلی و نقلی اعتراضات سے محفوظ ہے، باقی حدیثوں کو سرے سے لائق اعتبار و قابل تسلیم و حجت نہ سمجھنا تو ہمارے زمانے کے بعض ذہین اور جدت و اختراع پسند لوگوں کا کام ہے اور ان لوگوں کا سب سے بڑا سہارا محدثین کا وہ اصول ہے کہ حدیثیں اگر قرآن و عقل صریح کے خلاف ہوں تو ناقابل قبول ہیں لیکن قرآن سے ان لوگوں کی واقفیت کا حال بڑا ہی دردناک ہے۔ اپنی طبیعت و مزاج سے یہ اس کی جیسی غلط سلط تعبیریں چاہتے ہیں کر لیتے ہیں اور ان تاویلات بارد اور دور از کار تعبیروں کو بنیاد بنا کر حدیثوں کو رد کر دیتے ہیں۔ اقبال نے ایسے ہی "متجددین" کے متعلق کہا تھا ع

قرآن کو بازیچۂ تاویل بنا کر　　چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد

رہا عقل کا معاملہ تو اس کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ عقل عمومی کے بجائے محض انفرادی عقول کو معیار بنا لیا جائے۔ کسی حدیث کے کسی خاص انسان کی عقل کے نزدیک خلاف عقل ہونے اور واقعتہً خلاف ہونے میں بڑا فرق ہے۔ پھر ان حضرات کے نزدیک وہی عقل قابل معیار ہے جسے یورپ نے پیش کیا ہے لیکن اپنی گرہ کی عقل، اپنے مذاق، اپنی روایات اور اپنی خصوصیات کو سامنے رکھنا تو ان کے نزدیک رجعت پسندی اور بے عقلی ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر بھی فکر و نظر کا کوئی فساد اور بگاڑ ہو سکتا ہے کہ اختراع و انکشاف پسندی کے مدعی لوگ یورپ کی اندھی تقلید کو تو اپنے لئے قابل فخر تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس ذات گرامی کی اتباع و تقلید نہ تو خود کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرتے دیکھ سکتے ہیں، جس کی آمد سے دنیائے ظلمت و جہالت کی بنیادیں ڈھے گئی تھیں۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ آج کل مذہب کے خلاف اس کی اصلاح کے پردہ میں جو آوازیں بلند کی جا رہی ہیں وہ سب یورپ ہی کی صدائے بازگشت ہیں اور اس میں صرف یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ دینی حدود و قیود سے آزادی حاصل کی جائے اور یورپ کی غلامی و تقلید کے مضبوط بندھنوں میں اپنے کو جکڑ دیا جائے۔ اور لطف و حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اندھی تقلید و غلامی کو آزادئ فکر و اجتہاد کا نام دیا جاتا ہے ؛؛

بحث و نظر
امین احسن اصلاحی

خاندانی منصوبہ بندی اور مذہب

(۴)

تحدید آبادی اور حکومت الٰہیہ خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں ڈاکٹر صاحب نے کتاب و سنت اور امام غزالی رح کا جو حوالہ دیا تھا اس کی حقیقت آپ نے دیکھ لی۔ اب ہم ان کی ایک اور دلیل کا تجزیہ کرنا چاہتے ہیں جو موصوف نے حکومت الٰہیہ کے قیام کے پہلو سے خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں نکالی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں۔

" آج ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہماری تعداد کم ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ ہم معاشی بدحالی میں گرفتار ہیں، جسمانی لحاظ سے کمزور ہیں، عام طور پر ناکافی خوراک کے شکار اور مایوس کن حد تک کم تعلیم یافتہ ہیں۔ اس حقیر سروسامان کے ساتھ ہمیں اس دنیا کا سامنا کرنا ہے جس میں ہر طرف جسمانی، اخلاقی اور ذہنی مسابقت کا دور دورہ ہے۔ ان حالات میں لازماً اسلام ہمارے لئے تحدید آبادی کو اس وقت تک کے لئے ضروری قرار دے گا جب تک ہم اپنے معیار زندگی کو مذکورہ ضروریات زندگی سے ہم آہنگ نہ کرلیں یہ فعل یقیناً غیر اسلامی ہے کہ ہم بے تحاشہ بچے پیدا کرتے چلے جائیں جن کے لئے مناسب غذا اور تعلیم کا ہم کوئی انتظام نہ کرسکیں اور یقیناً نبی کریم ؐ حشر کے روز ایک ایسی امت پر فخر نہ کرسکیں گے جو اگرچہ تعداد میں زیادہ ہو مگر نیم فلاکت زدہ، ناچار، بیمار اور جاہل مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہو ..... پھر اس امر کا قوی ثبوت موجود ہے کہ قرآن حکیم اور سنت نبوی ؐ دونوں مسلمانوں کے لئے یہ لازم کرتے ہیں کہ وہ قوی، صحت مند اور خوش حال ہوں تاکہ کرۂ ارضی پر

حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں ۔ یہ فریضہ وہ قوم انجام نہیں دے سکتی جو افلاس، بیماری اور جہالت سے گھری ہوئی ہو ۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہاں تحدید آبادی کے حق میں اکٹھی تین دلیلیں پیدا کی ہیں اور ان تینوں ہی کو اپنے حد تک مذہبی رنگ دینے کی کوشش کی ہے ۔

ایک تو یہ کہ ہم جسمانی اور مادی اعتبار سے نہایت فلاکت زدہ اور کمزور ہیں اور اس وقت مقابلہ درپیش ہے ایسی قوموں سے جو جسمانی اور ذہنی اعتبار سے ہم سے بدرجہا بلند ہیں، ان حالات میں لازماً ہم پر اسلام یہ واجب کرتا ہے کہ ہم بے تحاشہ بچے پیدا کرنے کے بجائے پیدائش اولاد کو گھٹائیں اور پہلے اپنے معیار زندگی کو ترقی یافتہ قوموں کے معیار پر لائیں، پھر فراغت سے بچے پیدا کریں ۔

دوسری یہ کہ قیامت کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس امت کی کثرت پر فخر کریں گے یہ وہ امت نہیں ہے جو اگرچہ تعداد میں زیادہ ہے لیکن نیم فلاکت زدہ، ناچار، بیمار اور جاہل مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہے بلکہ اس اُمت پر فخر کریں گے جو صحت مند اور خوش حال ہو ۔

تیسری یہ کہ قرآن اور سنت مسلمانوں پر یہ لازم کرتے ہیں کہ وہ قوی، صحت مند اور خوش حال بنیں تاکہ کرۂ ارضی پر حکومت الٰہیہ قائم کرنے کے قابل ہوسکیں ۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ تینوں دلیلیں بڑی خوشنما معلوم ہوتی ہیں لیکن ان کا تجزیہ کیجئے تو صاف نظر آتا ہے کہ ان کے اندر جتنی حقیقت ہے اس سے کہیں زیادہ کھوٹ ہے ۔ چنانچہ اب اختصار کے ساتھ ہم بالترتیب ان پر تبصرہ کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی پہلی دلیل کے ترتیب دینے میں اتنی بات تو صحیح کہی ہے کہ اس وقت ہمارا مقابلہ ایسی قوموں سے ہے جن کا معیار زندگی نہایت اونچا ہے لیکن یہ بات اُن کی بالکل غلط ہے کہ ان قوموں کے مقابلے کے لئے اسلام ہم پر یہ واجب کرتا ہے کہ ہم بچوں کی پیدائش کو روک کر پہلے اپنا معیار زندگی ان کے معیار پر لائیں تب ان کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اگر کچھ بھی اجتماعیات کا مطالعہ کیا ہے تو وہ اس حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ قوموں کی ہار جیت کا فیصلہ معیار زندگی کے میدان میں نہیں ہوتا بلکہ قومی و اجتماعی کردار کے میدان میں ہوتا ہے ۔ اگر ایک قوم اجتماعی اور قومی کردار مضبوط اور بلند ہوگا تو وہ دوسری کمزور قومی و اجتماعی کردار والی قوم پر بازی

جائے گی اگرچہ اس کا معیارِ زندگی کتنا ہی اونچا ہو۔ یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ تمام دنیا کی تاریخ اس کی صداقت کی شہادت دے رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود اسلام کی تاریخ پر غور فرمائیں کہ رومیوں ایرانیوں اور مصریوں کے مقابل میں عربوں کا معیارِ زندگی کتنا پست تھا لیکن اسلام کی تعلیم نے جب ان کے قومی و اجتماعی کردار کو ان کی حریف قوموں کے مقابل میں بلند کر دیا تو وہ آناً فاناً اپنے تمام حریفوں پر چھا گئے اور انہیں اپنی اس کامیابی کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کا سہارا حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ بچے بھی "بے تحاشا" پیدا کرتے رہے اور فتوحات پر فتوحات بھی بے تحاشا حاصل کرتے رہے۔ یہی حال ان قوموں کا بھی ہے جو آج دنیا میں کامیاب اور ترقی یافتہ ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ جس دور میں ان کی ترقی و کامیابی کی بنیادیں استوار ہوئی ہیں اس زمانے میں تو وہ خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید وغیرہ کی اصطلاحوں تک سے ناواقف تھیں۔ ڈاکٹر صاحب اگر مسلمانوں کو دوسری قوموں کی مسابقت کا درس دینا چاہتے ہیں تو اس کے لئے انہیں سب سے پہلے اجتماعیات کے اُس حصے کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس میں قومی ترقی میں قومی کردار کی اہمیت سے بحث ہوتی ہے۔ مسلمانوں میں ابن خلدون کو اجتماعیات کے ایک عالم کی حیثیت سے بڑا اونچا مقام حاصل ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے مشہور مقدمے میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قوم میں وہ کردار جو غلبہ اور کامیابی کی راہیں کھولتا ہے اسی وقت تک محفوظ رہتا ہے جب تک اس کے افراد زندگی کے تعیشات سے دور رہتے ہیں جب کسی قوم میں معیارِ زندگی اونچا کرنے کے لئے تنافس شروع ہو جائے تو سمجھ لو کہ اب اس کے زوال کا دور شروع ہو گیا۔ یہ چیز اس کے اس قومی کردار کو فنا کر دینے والی ہے جو قومی ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ابن خلدون کے اس نظریے کے بالکل برعکس یہ فرماتے ہیں کہ ہماری قومی ترقی کا پہلا قدم معیارِ زندگی اونچا کرنے کی مسابقت ہے اور اس کے لئے خاندانی منصوبہ بندی ناگزیر ہے۔ اس وجہ سے آج اسلام ہمارے لئے یہ ضروری قرار دے گا کہ ہم تحدیدِ آبادی کے پروگرام پر عمل کریں۔

ڈاکٹر صاحب کی دوسری بات بھی بالکل غلط ہے۔ جس شخص کو قرآن اور حدیث کا کچھ بھی علم ہوگا اس کے لئے یہ حقیقت سورج سے بھی زیادہ روشن ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے دنیا اور آخرت دونوں میں اپنی امت کے باب میں تفاخر و مباہات کی جو چیز رہی ہے وہ معیارِ زندگی کی بلندی نہیں ہے

بلکہ ایمان اور عمل کی بلندی ہے۔ غریب سے غریب، نادار سے نادار اور گنوار سے گنوار شخص نے بھی اگر ایمان واسلام کی راہ اختیار کر لی ہے تو آپ کی نگاہوں میں اس نے عزت و محبت کا نہایت بلند مقام حاصل کر لیا ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ ایمان و عمل صالح کی دولت سے محروم رہے آپ کی نگاہوں میں انہوں نے ادنیٰ جگہ بھی نہیں پائی اگرچہ ان کا معیار زندگی کتنا ہی اونچا رہا ہو۔

آپ کے تمام ابتدائی ساتھی نہایت غریب لوگ تھے اور آپ کو ان پر فخر تھا۔ آپ کی قوم کے اندر جو لوگ اونچا معیار زندگی رکھتے تھے وہ آپ کے غریب، ناتواں اور کمزور ساتھیوں کو حقیر سمجھتے تھے اور آنحضرت صلعم سے مطالبہ کرتے رہتے تھے کہ اگر آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے دُور کر دیں تو ہم آپ کی مجلس میں آسکتے ہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس مطالبے کو ٹھکرا دیا اور اپنے غریب ساتھیوں کی زیادہ سے زیادہ شاندار الفاظ میں دلداری فرمائی۔ اپنے ان غریب ساتھیوں کو آپ نے کبھی یہ ہدایت نہیں فرمائی کہ تم اپنا معیار زندگی اونچا کرنے کی فکر کرو، جب بھی تاکید فرمائی اسی بات کی تاکید فرمائی کہ اپنے علم و عمل اور اپنے اخلاق و کردار کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور مستحکم کرنے کی فکر کرو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کبھی یہ خیال آیا کہ اگر اونچے معیارِ زندگی رکھنے والے لوگ ایمان لاتے تو اس سے اسلام کو تقویت حاصل ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو تنبیہ فرمائی کہ تم ان اونچے معیار زندگی والوں کی طرف نگاہ نہ اٹھاؤ۔ یہ معیار زندگی کے اعتبار سے جتنے اونچے ہیں فہم و بصیرت کے اعتبار سے اتنے ہی نیچے ہیں اللہ اپنے کلمے کو انہیں کمزوروں اور ناداروں کے ذریعہ سے بلند کرے گا جن کو یہ بلند معیار زندگی رکھنے والے لوگ حقیر سمجھتے ہیں۔ قرآن اور حدیث دونوں سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب کبھی مستقبل میں امت کی عظیم فتحمندیوں کی طرف اشارہ فرمایا تو جہاں اس بات کا ذکر فرمایا کہ ایک دن تم قیصر و کسریٰ کے خزانے غنیمت میں پاؤ گے وہیں اس اندیشے کا بھی اظہار فرمایا کہ مبادا اس وقت تم دُنیا کے تنافس اور معیار زندگی اونچے کرنے کے فتنے میں مبتلا ہو جاؤ اور پھر تمہیں بھی یہ دنیا اسی طرح ہلاک کر چھوڑے جس طرح اس نے تم سے پہلے قوموں کو ہلاک کر چھوڑا۔ میں یہ جو کچھ لکھ رہا ہوں اگر چاہوں تو اس کی تائید میں درجنوں آیات اور بیسیوں نہایت ایمان افروز احادیث نقل کر سکتا ہوں لیکن ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں کے سامنے ان آیات و احادیث کے سنانے کا فائدہ کیا؟

آنحضرت صلعم نے جس طرح دنیا میں معیارِ زندگی کی اصلی بلندی ایمان و عمل صالح کو قرار دیا اسی طرح

آخرت میں بھی آپ انہی لوگوں پر فخر فرمائیں گے جو ایمان و عمل صالح کے ساتھ حوض کوثر پر پہنچیں گے۔
آپ کی اُمت کا وہ غریب چرواہا جس نے زندگی بھر ریڈیو اور ریفریجریٹر کی شکل بھی نہیں دیکھی اور جو زندگی کی کسی لذت سے بھی آشنا نہیں ہوا لیکن اپنے ایمان پر مرا اور چیتھڑوں میں لپٹا ہوا دفن ہوا وہ "امتی امتی" کے شرف خطاب و سماعت سے سرفراز ہوگا لیکن جو لوگ مسلمان ہونے کے دعوے کے باوجود خدا کی شریعت پر تحریف کی قینچیاں چلاتے رہے اور شریعت فروشی کے سرمایے سے اپنے معیار زندگی اونچے کرتے رہے، جب وہ حوض کوثر کی طرف بڑھنے کی کوشش کریں گے تو فرشتے ان کو دھکے دیں گے۔ حضورؐ اُن کے بارے میں پوچھیں گے کہ اُن کو کیوں روکا جا رہا ہے؟ حضورؐ کو اطلاع دی جائے گی کہ آپ کے بعد انہوں نے آپ کی شریعت میں بدعتیں اور تحریفیں کی ہیں۔ پس حضورؐ بھی فرمائیں گے کہ "فسحقا سحقا" اگر یہ بات ہے تو یہ دور ہوں! ان کو دفع کرو!!

اس روشنی میں ہم ڈاکٹر صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے نقطہ نظر کی تصحیح کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حوض کوثر پر اپنی جس امت کی اکثریت پر فخر فرمانے والے ہیں اس کی مشترک خصوصیت ایمان و اسلام اور اخلاق و کردار ہے۔ اس کو کوئی تعلق بھی معیار زندگی کی اونچائی نیچائی سے نہیں ہے۔ وہاں امت وضو کے آثار اور سجدوں کے نشانات سے پہچانی جائے گی، کوٹھیوں اور کاروں سے نہیں پہچانی جائے گی۔ اگر آپ حضرات یہ چیز نہ پیدا کر سکے اور ضبط ولادت کی برکت سے آپ نے ہر گھر میں ریڈیو اور ریفریجریٹر ہی نہیں بلکہ ٹیلی ویژن سیٹ بھی پہنچا دیئے تو اس پر آپ کو فخر ہو تو ہو حضورؐ کو اس پر فخر کیوں ہوگا؟ یہ چیزیں تو ان لوگوں کے گھروں میں بھی موجود ہیں جو اللہ و رسول کے باغی اور شیطان کے نہایت وفادار دوست ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات بھی بالکل بے حقیقت ہے کہ دنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کے لئے "قوی، صحت مند، اور خوش حال ہونا شرط ہے۔" ہمارے نزدیک اس کی پہلی شرط سچا ایمان، خالص اسلام، مضبوط ارادہ اور غیر متزلزل عزم ہے۔ قوم کے اندر یہ چیزیں نہ ہوں تو ایک ایک گھر کے اندر قارون کی دولت جمع کر دیجئے لیکن خلافت الٰہیہ قائم نہیں ہو سکتی۔ عرب جب اُونٹ چراتے تھے، تہذیب و تمدن کے تعیشات سے نا آشنا تھے، کھجور اور پانی پر گزارہ کرتے تھے۔ اس وقت محض ایمان کی بدولت جبرالٹر سے لے کر دیوار چین تک انہوں نے اللہ کی حکومت قائم کر دی لیکن

آج جب کہ ان کے صحرا ڈالر اگل رہے ہیں اور ان کے جھونپڑوں تک میں ریل سنیما، ریڈیو اور ریفریجریٹر کی برکتیں پہنچ رہی ہیں انہیں خلافت الٰہیہ کا نام بھی کبھی یاد نہیں آتا۔ دوسروں کو چھوڑیئے خود اپنے ہی کو دیکھئے، جب دُنیا میں حکومتِ الٰہیہ قائم ہوئی تھی اس زمانے کے لحاظ سے آج پاکستان میں آپ زیادہ قوی، صحت مند اور خوش حال ہیں لیکن ۱۷ سال کے عرصے میں کتنے قدم آپ نے حکومتِ الٰہیہ کی راہ میں اٹھائے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی کثرت آبادی کی مصیبت کے سبب سے ہمارے ہر گھر میں ٹیلی وژن اور ریفریجریٹر بہم نہیں ہو سکا ہے، یا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لئے سینوں میں ایمان اور دلوں میں ارادہ ہی موجود نہیں ہے؟ ڈاکٹر صاحب اگر ایمان کو کچھ اہمیت دیتے ہیں تو ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ قوم کے اندر ایمان پیدا کرنے کے لئے ۱۷ سال کی مدت میں کیا کام ہوا ہے؟ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ حضرات نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے نئی نسل کو اگر کوئی ولولہ دیا ہے تو یہ دیا ہے کہ وہ اپریشن کرا کرا کے نامرد اور بانجھ بنے اور معیارِ زندگی اونچا کرنے میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش کرے! کیا حکومتِ الٰہیہ اسی طرح قائم ہوتی ہے!

اشتراکیت یا خاندانی منصوبہ بندی

ڈاکٹر صاحب نے ایک سوال یہ بھی اٹھایا ہے کہ "کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ضبط تولید کو بروئے کار لائے بغیر اس درجے کی معاشی خوش حالی پیدا کی جائے جو ہمارے قومی تقاضوں کو پورا کر سکے؟" اس سوال کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ یہ صرف ایک شکل میں ممکن ہے، وہ یہ کہ ملک میں اشتراکی نظام قائم کیا جائے لیکن اس میں قباحت وہ یہ بتاتے ہیں کہ اشتراکی نظام میں فرد کی آزادی کی قربانی دینی پڑے گی۔ برعکس اس کے اگر خاندانی منصوبہ بندی کے نسخے پر عمل کیا جائے تو فرد کی آزادی بھی سلامت رہتی ہے اور معاشی خوشحالی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ہمارے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ملک میں خوش حالی پیدا کرنے کی یہی دو راہیں ہیں۔ خوشحالی نہ تو قید خانے کے نظام سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ منظم نسل کشی سے۔ خوشحالی پیدا کرنے کے لئے ضرورت ایک ایسے نظام کے قیام کی ہے جو مندرجہ ذیل باتوں کا پورا پورا اہتمام کرے

۱۔ عمال حکومت (خاص طور پر بڑے ارباب مناصب) سادہ اور کفایت شعارانہ زندگی بسر کریں

تاکہ اُن کی زندگی دُوسروں کے لئے نمونہ بنے اور قومی خزانے پر ان کا بار کم سے کم پڑے۔

۲۔ ہمارے ملک میں حصولِ دولت کے جو ذرائع موجود ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھانے اور ان کو ترقی دینے کی کوشش کی جائے۔

۳۔ استحصال اور طلبِ زر کے وُہ تمام راستے بند کر دیئے جائیں جو اسلام میں ممنوع ہیں۔

۴۔ عیاشی اور فضول خرچی کی وہ راہیں روک دی جائیں جن سے اسلام نے روکا ہے۔

۵۔ خوشحال طبقے کے اندر انفاق، کفایت شعاری اور سادگی کا جذبہ اُبھارا جائے اور اس کا نمونہ خود اربابِ اقتدار پیش کریں۔

مَیں ڈاکٹر صاحب کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ انہی چند باتوں کو سچائی اور مضبوطی کے ساتھ اختیار کر کے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے چند سال کے اندر اندر اپنے ملک کا یہ حال کر دیا تھا کہ لوگ مدینہ کی گلیوں میں اپنی زکوٰۃ کا مال لئے پھرتے تھے لیکن کوئی اُن کا طالب نہیں ملتا تھا۔ آج بھی اگر ہمارے ملک کے اربابِ اقتدار محنت، کفایت اور ایثار تین چیزوں کو اپنی زندگی کے نصب العین کی حیثیت سے اختیار کر لیں اور اپنے عملی نمونوں اور اپنے تعلیمی و تبلیغی ذرائع سے یہ چیزیں اپنی قوم کے ہر طبقے میں بھی پیدا کر دیں تو یہاں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجائے گا جو فی الواقع حکومتِ الٰہیہ قائم کرنے کا اہل ہوگا۔ اس کامیابی کے لئے شرط بس ایک ہے۔ وہ یہ کہ جو لیڈر ہیں، جو حکومت کے کرتا دھرتا ہیں اور جو لوگ اس تبدیلی کے علمبردار بنیں، وہ محض زبان سے لوگوں کو اس کی تلقین نہ کریں بلکہ اس کے لئے خود اپنے آپ کو عملی نمونے کے طور پر پیش کریں۔ ضبطِ ولادت اور معیارِ زندگی اونچا کرنے کا نسخہ تو اس سے نہ آج تک دنیا میں کسی قوم نے اپنی مشکل حل کی ہے اور نہ آئندہ حل کر سکے گی، یہ محض "بچکانہ" خیالات ہیں اور ہمارا یہ مشورہ ہے کہ ان خیالات کو چھوڑ کر زندگی کے حقائق کا مواجہہ کرنے کی ہمت کی جائے۔ کمیونزم کا مقابلہ خاندانی منصوبہ بندی کے بند باندھنے سے نہیں ہوگا، اس کا کوئی طریقہ ہے تو یہ ہے کہ اس نظام کو برپا کیا جائے جس کے سربراہ حضرت عمرؓ تھے اور اس مقصد کے لئے کام کرنے والے نمونہ بھی اپنے سامنے انہی کا رکھیں۔

مصالحِ مرسلہ ڈاکٹر صاحب اور ان کے زمرے کے اربابِ قلم اپنے ہر مضمون میں "مصالحِ مرسلہ" کی اصطلاح ضرور استعمال کرتے ہیں لیکن میں نے ہمیشہ

یہ محسوس کیا ہے کہ اس اصطلاح کو یہ حضرات محض سنی سنائی معلومات کے اعتماد پر استعمال کرتے ہیں اور اس کا جو مفہوم یہ حضرات لیتے ہیں وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس مفہوم کے لئے اس اصطلاح کے بانیوں نے اس کو وضع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اس اصول کی رُو سے " ملت کی اجتماعی بہبود کے مسائل کو اولیت دینا ضروری ہے " یعنی ایک امر میں شریعت کے احکام کچھ ہوں لیکن اگر یہ حضرات یہ رائے قائم کرلیں کہ اس معاملے میں اجتماعی بہبود کا تقاضا فلاں ہے تو اس " بنیادی اور صحتمند اصول " کی رُو سے ڈاکٹر صاحب کو یہ حق حاصل ہے کہ شریعت کے نصوص و احکام کو بالائے طاق رکھ کر اس کو اختیار کرلیں۔ ڈاکٹر صاحب ذرا دیر کو یہ سوچیں کہ آخر وہ کون سر پھرا فقیہ ہو سکتا ہے جو ساری شریعت کو منسوخ کرنے کے لئے یہ اصول بنا جائے۔ کوئی احمق ہی ہوگا جو مصالح مرسلہ کا مطلب یہ لے کہ اجتماعی بہبود کے مزعومات کے لئے شریعت کے احکام کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔
مصالح مرسلہ کی اصطلاح جن فقہا نے وضع کی ہے ان کے نزدیک اس سے مراد مسلمانوں کے وہ اجتماعی مسائل ہیں جن میں اللہ اور رسول نے کوئی حکم دینے کے بجائے ان کو مسلمانوں کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے۔ اسی اعتبار سے ان کو مرسلہ (چھوڑے ہوئے) کہتے ہیں۔ یعنی اللہ و رسول نے ان میں دخل نہیں دیا بلکہ ان کو مسلمانوں پر چھوڑ دیا کہ وہ حالات کے تقاضوں کے تحت جس بات میں اپنی مصلحت سمجھیں اس کو اختیار کریں۔ اس کا کوئی تعلق بھی ان معاملات سے نہیں ہے جن میں شریعت نے اپنے احکام دے دیئے ہیں جن میں شریعت کے احکام موجود ہیں ان میں مصلحت اور بہبود اللہ و رسول کی طرف سے متعین ہوگئی، وہ چھوڑی ہوئی مصلحتیں نہیں ہیں کہ بندے ان میں دخل در معقولات کے مجاز ہوں۔ اگر ڈاکٹر صاحب ان دائروں کے اندر بھی مداخلت کی راہ کھولنا چاہتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بندوں کے مصالح اللہ اور رسول سے زیادہ سمجھنے کے مدعی ہیں۔

ایک اہم سوال کے جواب سے گریز

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کے اخیر میں ایک نہایت اہم سوال اٹھایا ہے لیکن اس کے جواب سے گریز اختیار فرمایا ہے حالانکہ ان کا مضمون پڑھ کر ہر شخص کے ذہن میں وہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی یہ ذمہ داری تھی کہ یا تو اس کا کوئی اطمینان بخش جواب دیتے اور اگر ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا تو پھر یہ مضمون لکھنے کی زحمت نہ اٹھاتے۔ ہم ڈاکٹر صاحب

کا سوال وجواب دونوں خود ان کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :۔

"البتہ منصوبہ بندی کرتے وقت ہمیں یہ متعین کرنا ہوگا کہ ہمارے معیار زندگی میں اضافے کے حدود کیا ہیں ؟ مثال کے طور پہ مغرب میں ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو مسلسل محنت شاقہ کی مدد سے ہر طرح کی اشیائے صرف کو بڑھانے اور جمع کرنے کی لامتناہی جدوجہد میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ ایک کار کے بعد دوسری کار اور ایک ٹیلی ویژن سیٹ کے بعد دوسرا ٹیلی ویژن سیٹ خرید لیں گے مگر دوسرا بچہ حاصل کرنے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ ہم یقیناً یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے ہاں بھی ایسی صورت پیدا ہو لیکن بالفرض ایسے حالات پیدا ہو بھی جائیں تو مناسب قانونی یا انتظامی تدابیر سے ان کا بآسانی مداوا کیا جا سکے گا۔"

ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ آج بھی ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بیماری یہی معیار زندگی اونچا کرنے کی ترنس ہے۔ چھوٹے بڑے سب اس میں مبتلا ہیں اور یہی بیماری ان تمام خرابیوں کا باعث ہے جو آج رشوت، خیانت، چور بازاری، ملاوٹ، سود، سٹہ، جوا وغیرہ کی صورتوں میں ہمارے اندر موجود ہیں اور جو برابر بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ اب اگر اسی ترنس کو مزید بڑھانے کی جدوجہد ڈاکٹر صاحب ایک قومی نصب العین کی حیثیت سے کرنا چاہتے ہیں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ بیماری کس حد تک بڑھے گی اور اس کے اثرات کن شکلوں میں ظاہر ہوں گے۔ یہ خیال کہ معیار زندگی کی بلندی کیلئے کوئی حد مقرر کی جا سکتی ہے ایک احمقانہ خیال ہے اور اس سے زیادہ احمقانہ خیال یہ ہے کہ جب ضرورت پیش آ جائے تو لوگوں کو اس حد پہ روکا جا سکتا ہے۔ آج جو لوگ ہمارے اندر بلند سے بلند معیار زندگی رکھتے ہیں ان سے پوچھ دیکھئے، کیا وہ اپنے معیار زندگی پر قانع ہیں؟ وہ رات دن اس کو مزید اونچا کرنے کی دُھن میں لگے ہوتے ہیں۔ اگر وہ ان تمام معیارات کو لانگ گئے ہیں جو اُن کے اپنے ملک میں موجود تھے تو اب ان کے سامنے مثال امریکہ کے بلند معیاروں کی ہے اور وہ اُن کی سطح پہ پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہی جذبہ تکاثر و تنافس ان لوگوں کے اندر ہے جو ان کے پیچھے چل رہے ہیں۔ اگر مکان ہے تو کوٹھی کی طلب ہے، کوٹھی ہے تو کار کی جستجو ہے، کار مل گئی تو ٹیلی ویژن کے ارمان ہیں، یہ سب ہو گیا ہے تو بنک بیلنس کی فکر ہے۔ کسی کارخانے، کسی فیکٹری، کسی بنک میں حصہ داری

کا ولولہ ہے۔ پھر کار ایک ہی کیوں ہو، خاندان کے ہر فرد کے لئے الگ الگ کیوں نہ ہو؟ ریڈیو، ریفریجریٹر، ٹیلی ویژن سٹ سے کوٹھی کا ایک ایک گوشہ آراستہ کیوں نہ ہو؟ کاریں ہیں تو پرائیویٹ ہوائی جہاز اور ہیلی کوپٹر کیوں نہ ہوں؟ سمندری سیروں کے لئے آغاخان اور شاہ فاروق کی طرح اپنے مخصوص جہاز کیوں نہ ہوں جو جملہ سامان عیش سے اس طرح آراستہ و پیراستہ ہوں کہ ان کے عرشہ پر عرشۂ جنت کا دھوکا ہو۔ شاہ سعود نے جو محل بنوائے اور جس طرح کی کاریں اور ہوائی جہاز ان کے لئے تیار ہوئے آخر دوسرے ان سے کیوں محروم رہیں اور دنیا سے ان کی حسرت لئے ہوئے کیوں جائیں۔ الغرض معیارِ زندگی کی کوئی حد معین نہیں کی جاسکتی۔

پھر فرض کر لیجئے کہ معیارِ زندگی کے لئے آپ کوئی حد معین کر دیتے ہیں تو آخر اس حد پر آپ لوگوں کو روکیں گے کس طرح؟ کیا اس کے لئے قانون اور انتظام کی مشینری استعمال کریں گے؟ اگر یہ ارادہ ہے تو کیا اس سے شخصی آزادی کی قربانی نہیں دینی پڑے گی؟ پھر اس نظام میں اور اشتراکیت میں فرق کیا ہوگا؟ اگر ڈاکٹر صاحب اس کا جواز تسلیم کرتے ہیں تو اس اقدام کی ضرورت تو آج بھی ہے۔ اس لئے کہ ہمارے اندر ایک طبقہ تو آج بھی ان لوگوں کا پیدا ہو چکا ہے جن کا معیارِ زندگی اس پیمانے سے بہت اونچا ہے جس پیمانے کو ڈاکٹر صاحب غالباً آخری حد اس ملک کے لئے قرار دیں گے۔ پھر جس شدومد سے ڈاکٹر صاحب خاندانی منصوبہ بندی کے حق میں مضمون لکھ رہے ہیں ان لوگوں کو روکنے کے لئے مناسب قوانین بنوانے کی فکر کیوں نہیں کرتے جو معیارِ زندگی کے تمام حدود پھاندتے ہوئے اتنی دور نکل گئے ہیں کہ اب شاید ان کو واپس لانا ناممکن ہو جائے۔ اور اگر ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال ہے کہ مطلوبہ معیار سے ابھی ان کا معیار بھی نیچا ہی ہے، ان کو اس سے بھی آگے جانے کی ضرورت ہے اور جب تک پاکستان کے عام باشندے اس معیار کو نہ حاصل کرلیں اس وقت تک انہیں بچے نہیں پیدا کرنے چاہئیں تو ہم افسوس کے ساتھ یہ پیشین گوئی کرتے ہیں کہ معیارِ زندگی اونچا کرنے کی یہ بھاگ دوڑ کبھی بھی ختم ہونے والی نہیں ہے، اس کو یا تو قیامت ختم کرے گی یا اس کا قدرتی ردعمل جس کو اشتراکیت کہتے ہیں۔

خوشحالی حاصل کرنے کی راہ خاندانی منصوبہ بندی اور معیارِ زندگی کی بلندی کے لئے تنافس و تکاثر نہیں ہے، بلکہ جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، محنت، کفایت اور ایثار ہے۔ ہمارے خلفائے راشدین نے قوم میں جو خوشحالی پیدا کی وہ اسی راہ سے کی۔ انہوں نے خود اپنی زندگی کو لوگوں کے لئے نمونہ

بنایا۔ وہ نہایت محنت کی زندگی بسر کرتے، روکھا سوکھا کھاتے، پیوند لگے کپڑے پہنتے، اور دوسروں کے لئے ایثار کرتے۔ ان کی معاشی پالیسی یہ تھی کہ جو لوگ وسائل و ذرائع رکھتے ہیں ان کو معیار زندگی اونچا کرنے کا روگ لگنے نہ پائے بلکہ اپنی دولت غریبوں اور بے وسیلہ لوگوں اور ملک و قوم کی بہبود و ترقی کے لئے خرچ کرنے میں لذت اور سعادت محسوس کریں۔ چونکہ اُن کی اپنی زندگیاں بالکل اُن کے اس نظریے کا عملی نمونہ تھیں بلکہ انہوں نے اس معاملے میں حد ضروری سے بھی زیادہ احتیاط اور تقویٰ کو پیش نظر رکھا تھا اس وجہ سے انہیں کسی قانون اور انتظام کا سہارا لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ان کی اقتدا کے شوق نے ان کے نام عمال کو بھی ان کے رنگ میں رنگ دیا۔ اگر کبھی کسی کی طرف سے کوئی ایسی بات ظاہر ہوئی جو اس نصب العین کے خلاف نظر آئی تو معمولی تنبیہ سے اس کی اصلاح ہو گئی۔ بڑوں کے ان عملی نمونوں نے عوام کی طبیعتوں کو بھی اسی رُخ پر موڑ دیا۔ وہ بھی اپنی محنت کے ثمرات کو اپنے معیار زندگی کو اونچا کرنے کے بجائے مذہب اور قوم کے معیار کو اونچا کرنے پر صرف کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ اس طرح ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں ہر طرف خوش حالی ہی خوش حالی تھی اور ایسی خوشحالی جس کے لئے نہ خاندانی منصوبہ بندی کے کلینک کھولنے پڑے اور نہ اشتراکیت کے قسم کا کوئی جبری نظام لوگوں پر مسلط کرنا پڑا۔

ڈاکٹر صاحب اگر خوش حالی کی راہ کھولنا چاہتے ہیں تو قوم کے سربراہوں کو یہ راہ اختیار کرنے کی دعوت دیں۔ اس سائنس کے دور میں اگر یہ راہ ہمارے لیڈروں نے اختیار کر لی تو برسوں کی منزل وہ ہفتوں میں طے کریں گے اور چند برسوں میں وہ ان شاء اللہ ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری بلکہ ان کا مقابلہ کرنے کی قوت اپنے اندر پیدا کر لیں گے۔ رہی یہ خاندانی منصوبہ بندی کی راہ، تو ڈاکٹر صاحب مضمون لکھتے رہیں گے، قوم بچے پیدا کرتی رہے گی اور معیار زندگی کی تگ و دو ایک دن اس طرح قوم کا دیوالہ نکال دے گی کہ ترقی تو درکنار اس کے لئے ایک آزاد قوم کی حیثیت سے دنیا میں قائم رہنا بھی شاید مشکل ہو جائے۔

ایک ضروری تنبیہ

مضمون کے آخر میں ایک ضروری تنبیہ کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے وہ خاندانی منصوبہ بندی

کی اسکیم کے خلاف لکھا ہے یہ اسکیم میرے نزدیک مذہب، عقل، فطرت اور اصول صحت سب کے خلاف ہے۔ میں نے اس دوران میں وہ لٹریچر بھی منگا کر پڑھا ہے جو اس اسکیم کو فروغ دینے کے لئے ہمارے ملک میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اگر میری یہ تنقید ڈاکٹر صاحب کے مضمون تک محدود نہ ہوتی تو میں اس پر بھی تنقید کرتا۔ تاہم یہ بات ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ میں، جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کر چکا ہوں، فطرت اور صحت کے ان اصولوں کا مخالف نہیں ہوں جو پیدائش اولاد کے سلسلے میں ملحوظ رکھنے ضروری ہیں۔ فطرت نے ایک بچے کے بعد دوسرے بچے کی ولادت کے درمیان ماں باپ کے لئے ایک خاص وقفے کا انتظار ضروری قرار دیا ہے۔ بعض حالات میں فریقین میں سے کسی کی صحت بھی اس بات کی متقاضی ہوتی ہے کہ فریقین جنسی تعلق سے احتراز کریں۔ اس طرح کی ساری چیزیں فطرت کے مقتضیات میں سے ہونے کی وجہ سے داخل شریعت ہیں اور جو لوگ ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں وہ قانون فطرت کے مطابق ان کی سزا اسی دنیا میں نقد نقد پا لیتے ہیں۔ ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیئے کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کی طرح خاص اس پہلو میں بھی ہمارے ہاں اصول صحت سے سخت بے پروائی پائی جاتی ہے اور یہ بے پروائی صرف عوام اور جہلا ہی میں نہیں بلکہ خواص اور تعلیم یافتہ طبقے میں بھی پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمیں ایک صحت مند اور مضبوط قوم بننے کے لئے اپنی ان خامیوں کی اصلاح کرنی ہوگی۔ جنسی تعلقات اور پیدائش اولاد سے متعلق طبی اصولوں کا علم ہماری قوم میں عام ہونا چاہیئے۔ اور ان اصولوں کو لوگوں کے اندر مقبول بنانے کے لئے تمام ہوشمند شہریوں کو جدوجہد کرنی چاہیئے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمارے ہاں جو ادارہ خاندانی منصوبہ بندی کی ایک غلط اور بے سود اسکیم چلا رہا ہے۔ اگر وہ اپنے اس غلط کام کو چھوڑ کر لوگوں میں پیدائش اولاد سے متعلق اصولِ صحت کے اہتمام اور ضبط نفس کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کرے تو اس کی یہ خدمت ہر پہلو سے نہایت مفید ہوگی۔

ان سطروں پر تنقید تمام ہوتی ہے۔ اس مسئلے کے بعض اور پہلو وضاحت طلب ہیں لیکن اس مضمون میں ان سے تعرض کی گنجائش نہیں تھی۔ خدا نے چاہا تو وہ ایک مستقل مضمون میں بیان ہوں گے۔

محی الدین پرنٹر پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر میثاق رحمانپورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔